برق نامہ

(حصہ اول)

مرتبہ
التفات امجدی

برق نامہ

مرتبہ: التفات امجدی

گوہرِ پاک بباید کہ شود قابلِ فیض
ورنہ ہر سنگ و گلے لُولُو و مرجاں نشود
(حضرت حافظؔ شیرازی)

باسمہٖ تعالیٰ

حق حق حق

پروفیسر سید شاہ طلحہ رضوی برقؔ کی ساٹھ سالہ علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں

برقؔ نامہ

(حصہ اول)

مرتبہ

التفات امجدی

عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی ۹۵

Barque Nama
Edited by Dr Iltefat Amjadi
Vol-1
1st Edition - 2019
Rs- 500

کتاب کا نام	:	برقؔ نامہ
مرتبہ	:	التفات امجدی
تعداد	:	۴۰۰
صفحات	:	۳۵۲
قیمت	:	پانچ سو روپے
مطبع	:	
کمپوزنگ	:	عبدالوہاب قاسمی (7631677978)
سنہ اشاعت	:	2019
سرورق	:	اظہار احمد ندیم
ناشر	:	دارالاشاعت خانقاہ امجدیہ سیوان بہار
رابطہ	:	

Dr. Iltefat Amjadi
Khanquah Amjadia
Station Road, Siwan 841226(Bihar)
Mob : 9934497795-9708188355
Email : iltefatamjadi95@gmail.com

ملنے کے پتے

☆ علامہ قتیل اورینٹل لائبریری و مرکزِ تحقیق شاہ ٹولی داناپور کینٹ۔ پٹنہ ۸۰۱۵۰۳ (بہار)

☆ بک امپوریم اردو بازار سبزی باغ پٹنہ۔۴

☆ مکتبۂ آزاد پنولین گلزار باغ پٹنہ سیٹی۔۸

| 6 | برق نامہ | مرتبہ:التفات امجدی

انتساب

حضرت برق کے

عزیزان وقدردان

کے نام

فہرست

انٹرویو

مختصرات

منظومات

Comments

پیشِ لفظ

جہانِ علم و ادب کی اکثر ہستیاں اپنا تشخص کئی جہتوں سے قائم کر لیتی ہیں۔ شاعر و ادیب، ناقد و محقق کوئی قلم کار و فن کار ہو اپنی تخلیقی و فکری کاوش سے ایک انفرادیت پیدا کر لیتا ہے۔ اس شخصیت کا یہی رُخ عوام کی توجہ کا مرکز بنتا ہے اور فنی تخصیص کے اعتبار سے اسے ایک ماہر استاد کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ برعکس اس کے کچھ ایسی شخصیتیں بھی ہوتی ہیں جو اپنے ارتقائے شعور اور بلوغتِ ذہنی سے انتاجِ فکر و خیال کا ایسا برج بن جاتی ہیں جن کے کئی قابلِ لحاظ رُخ نظر آتے ہیں۔ یہ پہلو دار شخصیتیں ایسی متنوع ہوتی ہیں جن کے کسی ایک رُخ پر ارتکاز آسان نہیں ہوتا۔ یہ ہشت پہل وجود مشہور و مقبول تو ہوتے ہیں مگر ان کی چند در چند وہبی و کسبی خصوصیات کو بیک نگاہ محیط کرنا دشوار ہے۔ یہی سبب ہے کہ اہلِ نظر ان کی حیثیت تو تسلیم کرتے ہیں مگر اظہارِ خیال میں نقد و تجزیہ کا توازن برقرار نہیں رکھ پاتے۔

ادب دوستوں کی ایک روش یہ بھی رہی ہے کہ ایسے قلم کاروں کو کماحقہٗ روشناسِ خلق کرنے کے لیے کسی رسالے کا کوئی شمارہ ان کے نام مختص کر دیتے ہیں نیز مختلف اہل الرّاے ادیبوں سے خدمتِ نقد و نظر لیتے ہیں۔ کبھی کوئی مجلّہ اس کے جائزے کے لیے شائع کرتے ہیں اور وہ اس کا شناس نامہ بن جاتا ہے۔

عصرِ حاضر میں ایسے شعرا و ادبا کی کمی نہیں جو اپنے شیوۂ فن اور بالیدہ شعور و بالغ نظری میں محتاجِ تعارف نہیں۔ تاہم مجموعی اور تفصیلی تعارف کے طور پر ان کے شخصی پہلوؤں کا احاطہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا اکثر بیدار ذہنوں نے عقیدت و حقیقت کے پیشِ نظر اربابِ قلم کے تعاون سے شخصیت نامہ شائع کرنے کی معتبر طرح ڈال دی اور یہ ایک مفید اور پسندیدہ عمل بن گیا۔ اس طرح کسی فن کار کی

شخصیت اور فن کا بڑی حد تک تشفی بخش جائزہ سامنے آ جاتا ہے۔ تنقید کی بے لاگ و بے باک خراد پر فن و فن کار کا ہر پہلو پرکھا جاتا ہے۔ سہو و غلط بھی نظر انداز نہیں ہوتے اور خوب و ناخوب کے ساتھ بڑی حد تک ستایش و اعتراف کا حق ادا ہو جاتا ہے۔

ایک ایسی ہی ہستی ہم عصر صاحبِ علم، نابغۂ وقت، بقیۃ السلف حضرت پروفیسر سید شاہ طلحہ رضوی برقؔ داناپوری مدظلہٗ کی بھی ہے۔ جنھوں نے زندگی کے ساٹھ برسوں سے زیادہ کا عرصہ علم و ادب کی خدمت میں صرف کیا۔ بیالیس سالہ تدریسی خدمات کے ساتھ ان کے شعری و نثری رشحاتِ قلم کی پختگی و رعنائی میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ تنقید و تحقیق کے وادیِ پُرشور میں ان کی رہنمائی و نگرانی وقعت پذیر و معتبر ہوتی گئی۔ علاوہ ازیں حضرتِ برقؔ کی سماجی، ثقافتی، مذہبی اور صوفیانہ خدمات علاحدہ ہیں۔ ایسی ہمہ جہت شخصیت پر کسی ایک فرد کے لیے روشنی ڈالنا آسان نہ تھا۔ لہٰذا ''برقؔ نامہ'' کے نام سے ان کی شخصیت کے اعتراف کی یہ ادنا کوشش آپ کے روبرو ہے جس میں مختلف مشاہیر قلم کاروں کے مضامین شامل ہیں۔

حضرتِ برقؔ پیرِ طریقت کے ساتھ ساتھ نہایت شریف النفس، خاکساری کے پیکر، گوشہ نشیں فقیر اور بااخلاق و بلند کردار انسان ہیں۔ اسلامی اقدار سے آراستہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ خوش پوش بھی ہیں۔ ان کی صحبت میں آدمی کسی اور دنیا میں چلا جاتا ہے۔ دورانِ گفتگو تراشیدہ جملے، برمحل فارسی و اردو کے اشعار اور واقعات گفتگو کو دوبالا کر دیتے ہیں۔ حضرتِ برقؔ میں وضع داری کوٹ کوٹ کے بھری ہوئی ہے۔ حفظِ مراتب کا خیال بہت رکھتے ہیں۔ ان کا دل بچوں کی طرح سادہ ہے۔

پیشِ نظر کتاب ''برقؔ نامہ'' حضرتِ برقؔ کی شخصی اور ادبی و شعری خدمات کے جائزے پر مشتمل ہے۔ دوسرا حصہ ان شاء اللہ ان کی دینی، مذہبی، اصلاحی اور صوفیانہ کارگزاریوں کا آئینہ ہوگا۔ خانقاہ چشتیہ نظامیہ (داناپور) کی بنیاد حضرتِ برقؔ کے جدِّ اعلا حضرت میر سید مبارک حسین رضوی چشتی نظامی قدس سرہٗ نے ۷۴۵ھ میں رکھی تھی۔ حضرتِ برقؔ خانقاہ چشتیہ نظامیہ کے بیسویں سجادہ نشین ہیں۔

حضرت سید شاہ طلحہ رضوی برقؔ سجادہ نشین خانقاہِ چشتیہ نظامیہ (دانا پور) اپنی گوناگوں خوبیوں سے خانقاہوں، مدرسوں اور مذہبی اداروں میں بے حد مقبول ہیں۔ مسلم معاشرے میں آپ کہیں سیرتِ پاک کے جلسوں میں خطاب کرتے، کہیں شادی وازدواج کی محفلوں میں خطبۂ نکاح پڑھتے اور ایجاب وقبول کراتے نظر آتے ہے۔ کہیں میّت کی نمازِ جنازہ کے لیے لوگ انھیں لے جاتے ہیں کہ اسیرانِ شریعت وطریقت کی عقیدت بھی بڑی چیز ہے۔ مسائلِ دیرینہ پر ان سے رائے طلب کی جاتی ہیں۔ ادارۂ شرعیہ، مدارس و دارالعلوم ان کی تکریم کرتے ہیں۔ مذہبی رسائل وجرائد میں ان کی تحریریں نمایاں طور پر شائع ہوتی ہیں۔ مجلسِ مشاورت وادارت میں ان کا نام شامل کر کے لوگ خود اپنی قدر شناسی کا حق ادا کرتے ہیں۔

خطابت کا جوہر بھی انھیں ورثے میں ملا ہے۔ ملکی اور غیر ملکی سطح پر بیشتر بڑے شہروں اور بیرونِ ملک مکہ معظّمہ، مدینہ طیبہ، پاکستان، ایران اور برطانیہ میں حضرت پیر سید نصیر الدین نصیؔر گیلانیؒ، حضرت مجاہد ملتؒ، مولانا ارشد القادریؒ، مولانا عبدالمنان اشرفیؒ، مولانا مفتی عبدالواجدؒ، مولانا مدنی میاں و مولانا ہاشمی میاں وغیرہم نے ان کے خطابِ لاجواب اور علمی نکتہ آفرینوں کی تحسین وستائش فرمائی ہے۔ حضرتِ برقؔ نے ان اکابرین اور معاصرین علمائے کرام کے ساتھ زینتِ اسٹیج رہ کر اپنی خطابت سے سامعین کو متاثر کیا ہے۔

بفضلہٖ تعالیٰ آپ سجادہ نشین اور پیر طریقت کی حیثیت سے ہندو پاک کی خانقاہوں میں اپنی ایک شناخت رکھتے ہیں۔ آپ نمود ونمایش سے دور، جلبِ منفعت سے گریزاں اور خلافِ شرع وطرقِ رسمی اور غیر ضروری رسمیات سے متنفر نظر آتے ہیں۔ نہایت خاموشی اور للّٰہیت کے ساتھ تبلیغِ سنت اور فروغِ سلسلہ میں کوشاں رہتے ہیں۔

اس لحاظ سے ''برقؔ نامہ'' کا دوسرا حصہ بھی معاشرے کی ضرورتِ اصلاح اور وقت کا اہم تقاضا ہے۔ ربِّ تعالیٰ ہمیں اس نیک ارادے اور کارِ خیر میں کامیاب اور بامراد فرمائے۔ آمین۔

''برقؔ نامہ'' کی تیاری کے لیے میں تقریباً سات برسوں سے جستہ جستہ مضامین کی جمع

آوری میں مصروف رہا۔ درمیان میں ایک بار مسودہ کے ساتھ خانقاہ میں حاضر ہوا۔ طلحہ صاحب نے پورے مسودے کو بغور دیکھا، خوش ہوئے اور دعاؤں سے نوازا۔ انھوں نے پانچ مضامین بھی عنایت کیے اور اس کتاب کی اشاعت کی اجازت بھی مرحمت فرمائی۔ ان عنایات کے لیے حضرتِ برقؔ کا نہایت ممنون ہوں۔ استاذی محترم ڈاکٹر ظفؔر کمالی نے ''برقؔ نامہ'' کے لیے نہ صرف نئی رباعیاں لکھیں بلکہ ''غور وفکر'' پر اپنا تفصیلی تجزیاتی مقالہ عنایت کیا۔ انھوں نے ڈاکٹر قطب الدین اشرف سے ایک اور حافظ عبدالوہاب قاسمؔی سے دو مفصّل مضامین لکھوائے۔ وہ کتاب کی اشاعت کے لیے برابر تاکید کرتے رہے۔ میں ان کا صمیمِ قلب سے شکر گزار ہوں۔ ڈاکٹر اظہار احمد ندیم نے خوبصورت سرِ ورق ڈیزائن کیا اور کتاب کو اپنے روایتی سلیقے کے ساتھ شائع کیا۔ ان کا شکریہ بھی لازم ہے۔ کتاب جیسی بھی ہے آپ صاحبانِ نقد ونظر کی خدمت میں پیش ہے۔ ہمیں اس کتاب کے متعلق آپ کی بے لاگ رائے کا انتظار رہے گا۔

چوں غنچہ گرچہ فرد بستگی ست کارِ جہاں
تو ہمچو بادِ بہاری گرہ کشا می باش
(حضرت حافظ شیرازیؒ)

مخلص

التفات امجدی

خانقاہ امجدیہ
اسٹیشن روڈ، سیوان بہار (الہند)
۱۱؍اگست ۲۰۱۹ء

ڈاکٹر ظفرؔ کمالی

اعتراف
(رباعیاں)

دریائے تصوّف کے گہر حضرتِ برقؔ
ہیں چشمِ شریعت کی نظر حضرتِ برقؔ
ہو بات اگر حق کی تو سب کچھ تسلیم
باطل کے لیے برق مگر حضرتِ برقؔ

❁❁❁

ہے بادۂ توحید کی دل میں مستی
آباد کرے اجڑے دلوں کی بستی
موقع ہے ابھی آ کے زیارت کرلو
اللہ کی نعمت ہے اس کی ہستی

❁❁❁

فیضانِ مجسّم ہے وہ عرفانی وجود
بخشا ہے اسے رب نے ایمانی وجود
تقوے کی طہارت کا کرشمہ دیکھو
سانچے میں ڈھلا کیسے نورانی وجود

نسبت ہے بڑی اس کی وہ ہے ابنِ قتیلؔ
جاری نہ رکھے کیسے محبت کی سبیل
دل والوں کی تقدیر کا حاصل ٹھہرا
روحانی گھرانے کا وہ فرزندِ جلیل

❁❁❁

سکّہ تو جما چکی ہے عظمت اس کی
محتاج نہیں کسی کی شہرت اس کی
وہ باغِ تصوّف کا گلِ خنداں ہے
پھیلی ہے چہار سَمت نکہت اس کی

❁❁❁

روشن ہے جبیں اس کی ستارے کی طرح
اور طبعِ رواں بحر کے دھارے کی طرح
اصحابِ نظر کہتے ہیں، اس کی ہستی
ہے قصرِ تصوّف کے مَنارے کی طرح

❁❁❁

سیرت بھی ہے خوب اور خدو خال بھی خوب
ماضی تھا بہت خوب تو ہے حال بھی خوب
مقبول ہے دنیا میں تو ہے پاس اس کے
عقبیٰ کے لیے نامۂ اعمال بھی خوب

باتیں ہوں عجم کی کہ عرب کی باتیں
دانش سے بھری اس کی غضب کی باتیں
اُس وقت کی ہوتی ہے مگر بات ہی اور
جس دم وہ کرے جھوم کے رب کی باتیں

❁❁❁

بھاتی ہی نہیں ہیں تمکَنَت کی باتیں
لوگوں سے کبھی منافرت کی باتیں
ہر بات ہے میزانِ طریقت میں تُلی
عارف ہے کرے وہ معرفت کی باتیں

❁❁❁

حکمت سے ہی پند و مَوعِظت کی باتیں
بندوں سے خدا کے مَنفَعت کی باتیں
ہے صاحبِ اَخلاق تو کیسے نہ کرے
ہر شخص سے قدر و منزلت کی باتیں

❁❁❁

ہے علم کے پَرتَو سے چہرا پُرنور
آنکھوں سے نمایاں ہے بصیرت کا سرور
دانا ہے تو دانائی کی باتیں بھی کرے
کیا بات ہے رہتا بھی ہے وہ دانا پور

کروٹ لے محبّت تو ارادت جاگے
جب دیکھوں اسے میری عقیدت جاگے
چہرے پہ نظر پڑتے ہی یاد آئے خدا
بیدار ہو دل ذوقِ عبادت جاگے

❁❁❁

وہ جاگے تو یوں علم کی دولت جاگے
جیسے کہ فلاطون کی حکمت جاگے
کرتا ہے سدا مغز سے نکلی ہوئی بات
جو اس کو سُنے اس کی ذہانت جاگے

❁❁❁

دستورِ صداقت کی راہیں روشن
بے مِثل شرافت کی راہیں روشن
اس عہدِ پُرآشوب میں اس کے دم سے
ہیں رُشد و ہدایت کی راہیں روشن

❁❁❁

اعلا ہیں خیالات تو عالی ہے دل
ہر قسم کے دعووں سے خالی ہے دل
وہ عرش سمجھتا ہے خدا کا اس کو
کیسے نہ کہیں اس کا مثالی ہے دل

اس نفس کی پستی سے وہ بالا ہے بہت
صورت بھی بتاتی ہے کہ اعلا ہے بہت
رہتے ہیں پریشان اندھیرے اس سے
وہ ہے تو زمانے میں اجالا ہے بہت

❁❁❁

تسلیم و رضا، وفا شِعاری کی مثال
باقی ہے اسی سے بردباری کی مثال
افضل ہے مگر خود کو وہ احقر سمجھے
کم یاب ہے ایسی خاکساری کی مثال

❁❁❁

ہر پند میں پیغام میں ہوتا ہے خلوص
اصلاح کے اِقدام میں ہوتا ہے خلوص
آتی ہے کہاں اس کو ظاہرداری
مخلص کے ہر اک کام میں ہوتا ہے خلوص

❁❁❁

مقبول سخن ور بھی ہے نقّاد بھی ہے
ہم جیسے ہزاروں کا استاد بھی ہے
وہ صرف عَلَم دارِ شرافت ہی نہیں
تہذیب کے ایوان کی بنیاد بھی ہے

دربار سے دوری ہی بناکر رکھّی
سرکار سے دوری ہی بناکر رکھّی
دنیا کو کہاں آنکھ اٹھاکر دیکھا
مُردار سے دوری ہی بناکر رکھّی

❁❁❁

اس عہد کا انداز نہیں ہے اس میں
دنیا کی تگ و تاز نہیں ہے اس میں
اللہ کا بندہ ہے وہ سیدھا سادا
کچھ فخر نہیں ناز نہیں ہے اس میں

❁❁❁

ہر پیر و جواں اس کی عقیدت کا اسیر
ہر مذہب و ملّت میں ہے اس کی توقیر
نظروں سے بدل ڈالے وہ دل کی دنیا
ہے اس کی نگاہوں میں غضب کی تاثیر

❁❁❁

تحریر کی، تقریر کی لذّت کو سلام
گفتار کی، افکار کی ندرت کو سلام
قائل ہیں سبھی دل سے تو کیسے نہ کریں
اس نابغۂ عصر کی عظمت کو سلام

شناس نامہ

• مرتبہ:----------------------التفات امجدی

(۱) سوانحی کوائف

پورا نام : سید محمد طلحہ رضوی

تخلص : برقؔ

والد کا نام : حضرت سید شاہ محمد قایم رضوی چشتی نظامی قتیل داناپوری قدس سرہٗ
سجادہ نشین آستانۂ چشتیہ نظامیہ، داناپور۔

دادا کا نام : سید شاہ محمد حسین قادری رحمۃ اللہ علیہ

دادی کا نام : بی بی سیدہ کنیز فاطمہؒ

نسب : رضوی المشھد ی

والدہ کا نام : حضرت بی بی محمودہ خاتون مجیبی، پھلواری رحمت اللہ علیہا

تاریخِ پیدائش : جمادی الاوّل ۱۳۵۷ھ۔(مطابق سند)۲۵؍جنوری ۱۹۴۱ء

وطن : محلّہ شاہ ٹولی، داناپور، پٹنہ، بہار

ابتدائی تعلیم: ☆ والد ماجد اور چھوٹے چچا سید شاہ سراج الدین رضوی چشتی نظامی داناپوری مرحوم سے حاصل کی۔
☆ دینی ومذہبی تعلیم والدہ ماجدہ بی بی محمودہ خاتون مجیبیؒ پھلواروی سے حاصل کی۔عروض بھی انھیں سے پڑھا۔

تعلیم : ☆ میٹرک ۱۹۵۵ءبلد یو ہائی اسکول داناپور کینٹ۔

☆ آئی۔اے ۱۹۵۷ء بی۔ایس۔کالج، داناپور۔

☆ بی۔اے (اردو آنرز) ۱۹۶۰ء، پٹنہ کالج، پٹنہ۔

☆ ایم۔اے (اردو) ۱۹۶۲ء، پٹنہ یونی ورسٹی، پٹنہ۔

☆ ایم۔اے (فارسی) ۱۹۶۳ء، پٹنہ یونی ورسٹی، پٹنہ۔

☆ سی۔او۔پی (فارسی) ۱۹۷۷ء، جواہر لال نہرو یونی ورسٹی، دہلی۔

☆ پی۔ایچ ڈی۔(اردو) ۱۹۷۰ء، پٹنہ یونی ورسٹی، پٹنہ

☆ ڈلٹ (فارسی) ۱۹۷۹ء، پٹنہ یونی ورسٹی، پٹنہ۔

موضوع : شاہ اکبر داناپوری —— حیات وخدمات

نگراں : علاّمہ جمیلؔ مظہری

☆ ایس۔ٹی۔پی، ۱۹۹۶ء تہران یونیورسٹی، ایران

موضوع مقالہ برائے ڈی لٹ:

’’مشائخ سخن پردازِ بہار، مخصوصاً سجادہ نشین ودارائے خانقاہ‘‘

تلمذ : علاّمہ قتیلؔ داناپوری

اساتذہ : (۱) پروفیسر سید صدرالدین فضا شمسی، (۲) علامہ جمیل مظہری، (۳) پروفیسر مطیع الرحمٰن، (۴) پروفیسر اختر اورینوی، (۵) ڈاکٹر سید نواب کریم، (۶) ڈاکٹر کاظم حسین، (۷) پروفیسر ڈاکٹر قریشہ حسین، (۸) محترمہ میمونہ خاتون، (۹) پروفیسر محمد صدیق، (۱۰) پروفیسر ممتاز احمد، (۱۱) پروفیسر سید حسن سرمدؔ

وہ اساتذۂ ایران جن سے دہلی اور ایران میں فارسی شعروادب میں استفادہ کیا: (۱) پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین زادہ (۲) پروفیسر تجلیل جلیل (۳) پروفیسر ڈاکٹر حاکمی (۴) پروفیسر ڈاکٹر عبدالقاسم رادفر (۵) پروفیسر ڈاکٹر اکبر شہیدی (۶) ڈاکٹر عبدالجبار کاکائی (۷) ڈاکٹر احمد نزاد (۸) پروفیسر ڈاکٹر توفیق سجانی (۹) پروفیسر ڈاکٹر منوچہر مرتضوی

(۱۰) پروفیسر کہدوبی (۱۱) پروفیسر سیدرضا سیرجانی۔

تاریخ ازدواج : ۱۳؍ مارچ ۱۹۶۳ء

شریک حیات : بی بی زیب النساء (متوفی ۲۶؍ رجب ۱۴۲۴ھ المطابق ۲۴؍ ستمبر ۲۰۰۳ء، بروز بدھ) بنتِ مولوی منظور احسن صدیقی مرحوم، مہونی، ضلع نالندہ۔

اولاد : چار بیٹے:

(۱) ڈاکٹر سید بلال رضوی (۲) ڈاکٹر سید محمد سلمان رضوی

(۳) ڈاکٹر سید محمد جنید رضوی (۴) سید محمد ابوذر سعد رضوی

: چار بیٹیاں:

(۱) ڈاکٹر فردوس فاطمہ رئیس۔ (۲) ڈاکٹر قدسیہ فاطمہ ضیاء۔

(۳) کاظمہ خاتون حسن (۴) صوفیہ ترنم جسیم

بیعت وخلافت : حضرت سید شاہ محمد قایم رضوی قتیل چشتی نظامی، سجادہ نشین، آستانہ چشتیہ نظامیہ داناپور، درسلسلۂ عالیہ چشتیہ نظامیہ وخلافت درجمیع سلاسل طریقت۔

سجادگی : پس از مرگ پدر بر سجادہ مخدوم سید شاہ محمد یٰسین چشتی نظامی قدس سرہٗ خانقاہ چشتیہ نظامیہ داناپور، بتاریخ ۸؍ ذیقعدہ ۱۴۰۵ھ

شعروسخن کی ابتداء : بزمِ احباب، داناپور کے ماہانہ طرحی مشاعروں سے ۱۹۵۲ء میں۔

مشاغل : درس وتدریس اورنوشت وخواند۔

مطالعہ : بجز کتاب نباشد حبیب من بہ جہاں

تصوف، تاریخ، شعروادب اردووفارسی، تنقید وتحقیق وغیرہ۔

محبوب کتابیں : (۱) ام الکتاب قرآن حکیم، (۲) مثنوی معنوی، (۳) دیوانِ حافظؔ (۴) دیوانِ غالبؔ، (۵) کلیات اقبالؔ۔

محبوب شعراء : حافظؔ، سعدیؔ، نظیریؔ، عرفیؔ، جامیؔ، اقبالؔ۔

محبوب مصنفین : احتشام حسین، مرزا رسوا، قرۃ العین حیدر۔

محبوب شوق : سیروشکار، کتب بینی۔

زبان دانی : اردو، فارسی، عربی، ہندی، انگریزی، بھوجپوری۔

(۲) ملازمت وتدریسی مصروفیات:

☆ ڈیفنس اکاؤنٹس آفس (U.D.C. Auditor) ۲؍ اپریل ۱۹۶۳ء تا ۱۹؍ اگست ۱۹۶۳ء

☆ عارضی لیکچرار اردو، کے ایل ایس کالج، نوادہ، ۲۰؍ اگست ۱۹۶۳ء سے ۶؍ دسمبر ۱۹۶۳ء تک۔

☆ لیکچرر وصدر شعبۂ اردووفارسی، جین کالج آرہ، ۷؍ دسمبر ۱۹۶۳ء سے ۱۳؍ نومبر ۱۹۸۰ء تک۔

☆ ریڈر وصدر ۱۴؍ نومبر ۱۹۸۰ء سے ۳ فروری ۱۹۸۵ء تک

☆ پروفیسر وصدر شعبۂ اردووفارسی، ایچ۔ڈی۔جین کالج آرہ، ۴؍ فروری ۱۹۸۵ء سے ۳۱؍ جنوری ۲۰۰۱ء۔

☆ ۱۹۸۵ء تا ۱۹۸۶ء، اٹھارہ مہینوں کے لئے پوسٹ گریجویٹ ڈیپارٹمنٹ آف اردو، اے این کالج، پٹنہ (مگدھ یونی ورسٹی) میں عارضی تبادلہ بھی ہوا۔

سبکدوشی : ۳۱؍ جنوری ۲۰۰۱ء۔

☆ ویزیٹنگ پروفیسر شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی، دہلی (۲۵؍ فروری ۲۰۱۰ء تا ۲۴؍ فروری ۲۰۱۲ء)

(۳) تخلیقی سفر کا آغاز وارتقا

۱۹۵۴ء 'بزم احباب' داناپور کے طرحی مشاعروں سے

پہلی غزل کی اشاعت : ۱۹۵۵ء میں بی۔ ایس۔ کالج داناپور کے میگزین میں

پہلی نظم کی اشاعت : ۱۹۵۶ء روز نامہ صدائے عام پٹنہ کے عید نمبر میں

پہلی نثر کی اشاعت : ۱۹۵۶ء میں بی۔ اس۔ کالج داناپور کے سالانہ میگزین میں۔

(۴) علمی وادبی اداروں سے وابستگی

- ممبر اگزیکیٹو بڑی (مجلس عاملہ) بہار اردو اکادمی پٹنہ۔
- ممبر سنڈیکیٹ، سیلیبس کمیٹی، ریسرچ کمیٹی مگدھ یونیورسٹی گیا اور ویر کنور سنگھ یونیورسٹی آرہ۔
- ممبر سیلیبس کمیٹی، جامعہ ہمدرد نئی دہلی۔
- ممبر سنڈیکیٹ، مولانا مظہرالحق عربی وفارسی یونیورسٹی، پٹنہ۔
- ڈین آف دی فیکلٹی آف ہیومینیٹز ویر کنور سنگھ یونیورسٹی آرہ
- ممبر مجلس مشاورت ہندستان کے سات علمی وادبی ومذہبی رسائل میں
- ممبر اکزیکیٹو کمیٹی کل ہند انجمن اساتذہ فارسی، دہلی۔
- سرپرست علامہ قتیل اورینٹل لائبریری ومرکزِ تحقیق، پٹنہ
- ممبر پرشین سیل، کونسل برائے فروغ زبان اردو نئی دہلی

(۵) تصنیفات

نام کتاب	موضوع	سنہ اشاعت
☆اردو کی نعتیہ شاعری	تحقیق	۱۹۷۴ء
☆غور وفکر	تنقیدی مضامین	۱۹۷۶ء
☆نقد وسنجش	تنقیدی مضامین	۱۹۸۲ء
☆شاہ اکبر داناپوری	تحقیق	۱۹۸۵ء
☆ارزشِ ادب	تنقیدی مضامین	۱۹۹۵ء
☆شایگاں	شاعری	۱۹۸۹ء
☆شہابِ سخن	رباعیات	۱۹۹۶ء۔۲۰۰۴ء
☆چہل قطعۂ تاریخ	قطعات تاریخ فارسی	۲۰۰۷ء
☆اربعین	نعتیہ مجموعہ	۲۰۰۸ء
☆سہرے ہی سہرے	سہرے	۲۰۰۸ء
☆عشرۂ مبصرہ	تبصرے	۲۰۰۹ء
☆تقاریظ	تقریظ	۲۰۱۱ء
☆شایع نظمیں	نظمیں	۲۰۱۱ء
☆مناصب التواریخ	قطعات تاریخ (اردو فارسی)	۲۰۱۲
☆ورق ورق آئینہ	تنقیدی مضامین	۲۰۱۴ء
☆سجادہ نشینانِ بہار	مشائخ سخن پرداز	۲۰۱۴ء

(٦) فارسی زبان میں یہ کتاب مرکز تحقیقات فارسی کلچرل کاؤنسل جمہوریہ اسلامی ایران نے دہلی سے ۲۰۱۴ء میں شایع کیا

نام کتاب	موضوع	سنہ اشاعت
☆تذکرۂ شعراء دانا پور	................(غیر مطبوعہ)	
☆ تاریخ آستانۂ چشتیہ نظامیہ دانا پور	................(غیر مطبوعہ)	
☆عنبر سارا	نعتیہ مجموعہ	۲۰۱۸ء
☆لمعات سرمدی	شخصیات	۲۰۱۸ء
☆میزان قلم	تقریظ	۲۰۱۹ء
☆مصحف تاریخی	قطعات تاریخ (غیر مطبوعہ)	

(٧) ترتیب وتدوین

نام کتاب	موضوع	سنہ اشاعت
☆گلستانِ سخن محمودہ	مجموعہ نعت از بی بی محمودہ قادری	۱۹۵۶ء
☆تجلیاتِ قتیل	دیوان اردو از قتیل دانا پوری	۱۹۶۵ء
☆خورشید سحر	دیوان فارسی از قتیل دانا پوری	۱۹۶۸ء
☆ضیاء العروض	عروض از قتیل دانا پوری	۱۹۸۶ء
☆رباعیاتِ ارتقاء	رباعیات از سید مرغوب احمد کوکب دانا پوری	۱۹۶۶ء

(٨) انگریزی زبان میں:

Mysticism in our Poetry 1984

(٩) ترجمہ:

☆ ''غرر عظامی'' اردو ترجمہ ''درر نظامی''، ملفوظات حضرت نظام الدین اولیاؒ۔

☆کشایش نامہ اردو ترجمہ کشایش نامہ فارسی

مصنفہ: خواجہ راج کرن کایستھ دہلوی ۲۰۱۲ء

☆مکتوبات جمالی فارسی از بندگی شیخ محمد مصطفیٰ جمال الحق قدس سرہٗ ۲۰۱۸ء

☆رسالۂ فنا وبقا (فارسی) از سیدنا امیر ابوالعلا، احراری قدس سرہٗ (غیر مطبوعہ)

☆مجمع البحرین (فارسی) مصنفہ شاہزادہ داراشکوہ۔کونسل برائے فروغ اردو دہلی۔

(۱۰) پروفیسر طلحہ رضوی برق کے مختلف مطبوعہ مقالے

No.	Title	Publication	Year
1.	Shair-e-Nashamnkhta-e-Farsi Goe Hind - Shah Qayem Qateel	Persian Journal "Bayaz", Delhi, Vol. 3, No. 1	
2.	Nakhustam Shair-e-Farsi Goe Bihar	Persian Journal "Bayaz", Delhi, Vol. 9, No. 1	
3.	Kareema-e-Saadi	Monthly "Moarif" Azamgarh	Dec. 1978
4.	Imam Hussain- A Sumbol of Sacrifice		1980
5.	Naqeeb-e-Harkat-o-Zindagi-Bedil	Monthly "Moarif" Azamgarh	1981
6.	Makhdoom-e-Jahan and his philosphy of Love	Indo Iranica, Kolkata	1982
7.	Perma Naad Sabr Arvi	Journal of Arabic & Persian Research Institute, Patna	1983
8.	Ghazal-e-Maroof-e-Khusro	Journal of Arabic & Persian Research Institute, Patna	1984
9.	Falsafa-e-Wujudiat Dar Sher-e-Bedil	Journal of Arabic & Persian Research Institute, Patna	1985
10.	Contribution of Sufi-e-Bihar to Persian Poetry		1985
11.	Idul-Fitr		1990
12.	Idul-Azha		1991
13.	Rubaeeyat-e-Neema Yushij	Qand-e-Parsi, New Delhi, No. 2	1996

No.	Title	Publication	Year
14.	Faizan-e-Rooh-e-Khwajai Hafiz ba Arifan	Monthly "Ashna", Tehran	1996
15.	Zaban-e-Farsi wa Arakin-e-Ahle Tasawwuf Dar Bihar	Magadh University, Persian Journal, Bodhgaya	1997
16.	Shah Ghulam Hussain Bithavi	Khuda Bakhsh Oriental Public Library, Patna, Journal No. 12	
17.	Tajreed-o-Tafreed Dar Sher-e-Muzaffar Balkhi	"Danish" Monthly No. 24/25, Islamabad, Pakistan	
18.	Wahdate Wajud-o-Shohud Dar Kalam-e-Bedil	"Name-e-Farhang" Vol. 3, No. 4, Tehran	
19.	Shah Ghulam Hasan - Arif-e-Sukhan Sara	Persian Journal "Bayaz", Delhi, Vol. 2, No. 2	
20.	Resala-e-Fana-o-Baqa	Khuda Bakhsh Library Journal No. 129, Patna	
21.	Ghohar-e-Ezami Az Durar-e-Nezami	Quaterly Journal "Deewan" Dargah Shah Arzani, Patna	Jan. to Mar. 2003
22	Sufistic Approach to World peace		

(۱۱) مگدھ یونی ورسٹی، بودھ گیا اور ویرکنور سنگھ یونیورسٹی آرہ سے برق صاحب کی نگرانی ورہنمائی میں درج ذیل حضرات نے اردو میں Ph.D کی ڈگری حاصل کی:

نمبر شمار | ریسرچ اسکالر | موضوع مقالہ تحقیق | سنہ تفویض

۱. سید غلام مرتضیٰ ''اردو تنقید میں بہار کا حصہ'' ۱۹۸۲ء

Vide Memo No. 11423 Dated 04.10.1982

۲. منور حسین خان ''نذیر احمد ایک مترجم قرآن'' ۱۹۸۵ء

Vide Memo No. 1449 Dated 19.07.1985

۳. کبیر الدین خان وارثی ''حضرت بدرالدین اوگھٹ شاہ وارثی'' ۱۹۸۶ء

Vide Memo No. 2058 Dated 03.04.1986

۴. سید محمد نظام الدین رضوی ''اردو کا ایک قدیم مرکز—آرہ'' ۱۹۸۶ء

Vide Memo No. 2058 Dated 21.08.1986

۵. محمد مصلح الدین ''نشور واحدی—حیات اور شاعری'' ۱۹۸۹ء

Vide Memo No. A435/89 Dated 20.06.1989

۶. طلعت قیوم ''پرویز شاہدی — حیات اور کارنامے'' ۱۹۸۹ء

Vide Memo No. A437/89 Dated 20.04.1989

۷. محمد ریحان ''شفیع تمنائی پھلواروی حیات اور آثار'' ۱۹۸۹ء

Vide Memo No. B-2130 Dated 24.08.1989

۸. شاہین حیدر ''ثاقب عظیم آبادی—حیات اور شاعری'' ۱۹۹۰ء

Vide Memo No. A-1681 Dated 17.01.1990

۱۰. شہزاد عارفی ''حکیم محمد شریف فخر مہدانوی— حیات اور شاعری'' ۱۹۹۸ء

Vide Memo No.V.Exam(conf.)1063-1077 Dated 28.04.1998

(۱۲) ویرکنور سنگھ یونی ورسٹی، آرہ سے تفویض شدہ:

۱۱. شگفتہ عارف اردو شاعری کی ...میں شعرائے آرہ کا حصہ—آزادی کے بعد ۱۹۹۶ء

Vide (V.K.S.U.Ara) Memo No. V.Exam (Conf.)4699-4718/96 Dated 18.09.1996

۱۲. فرقان احمد ''شاہ قایم قتیل اور ان کا فن غزلگوئی'' ۱۹۹۸ل

Vide (V.K.S.U.Ara) Memo No. V.Exam (Conf.)1382-96/98 Dated 06.06.1998

۱۳. افروز جہاں ''بہار میں اردو ناولٹ'' ۲۰۰۱ء

Vide (V.K.S.U.Ara) Memo No. 1845-59/01 Dated 22.12.2001

۱۴. محمد امجد رضا ''امام احمد رضا کی فکری تنقیدیں'' ۱۹۹۸ء

Vide (V.K.S.U.Ara) Memo No. 8007-26/98 Dated 08.12.1998

۱۵. نغمانہ خاتون ''خواجہ الطاف حسین حالی—شخصیت اور شاعری'' ۲۰۰۰ء

Vide (V.K.S.U.Ara) Memo No. 4491(Exam) Dated 01.01.2000

۱۶. محمد معروف خان ''الطاف حسین حالی — شخصیت اور شاعری'' ۲۰۰۰ء

Vide (V.K.S.U.Ara) Memo No. 7578-91/02 Ph.D. Dated 14.09.2002

۱۷. علی امام ''شوکت تھانوی—حیات اور کارنامے'' ۲۰۰۸ء

Vide (V.K.S.U.Ara) Memo No. 803/08 Dated ....

۱۸. محمد شاہ جہاں خاں ''چمپارن کا ایک گمنام شاعر محمد فضل کریم افضل'' ۲۰۰۷ء

Vide (V.K.S.U.Ara) Memo No.1864/07 Dated-25.05.2007

۱۹. تمثیل احمد ''مرزا یاس یگانہ چنگیزی۔۔۔ حیات اور شاعری'' ۲۰۰۴ء

Vide (V.K.S.U.Ara) Memo No. 231/04 Dated-19.02.2004

۲۰. محمد صدر عالم صدیقی ''بیسویں صدی کے پانچ شعرائے داناپور''

Vide (V.K.S.U.Ara) Memo No.

۲۱. سعیدہ پروین ''بہار کی چند اہم خواتین افسانہ نگار''

Vide (V.K.S.U.Ara) Memo No.

۲۲. محمد ریحان ''بہار کی اردو شاعری میں ہندوستانیت''(D.Litt) ۲۰۱۱ء

Vide (V.K.S.U.Ara) Memo No.1183/11 Dated 13.07.2011

۲۳. سید ابن المعز رضوی ''بہار و بنگال میں اردو مثنوی'' ۲۰۰۵ء

Vide (V.K.S.U.Ara) Memo No.179/05 Dated-24.06.2005

۲۴. انجم پروین ''بہار کے اہم صوفی شعراء'' ۲۰۰۵ء

Vide (V.K.S.U.Ara) Memo No.

۲۵. ناہید رخسانہ ''حامد عظیم آبادی: حیات اور ادبی خدمات'' ۲۰۱۱ء

Vide (V.K.S.U.Ara) Memo No.562/12 datet 24-3-12

(۱۴) پروفیسر برق کی نگرانی میں جن اسکالرز نے فارسی زبان وادب میں Ph.D کی ڈگریاں حاصل کیں:

۱. خورشید احمد خان ''علامہ قوس حمزہ پوری کی فارسی خدمات'' ۱۹۸۹ء

Vide M.U. Memo No. A52/89 Dated 07.04.1989

۲. عبدالوحید ''شاہ قتیل داناپوری بحیثیت فارسی غزلگو'' ۱۹۹۶ء

Vide (V.K.S.U.Ara) Memo No. V.Exam (Conf.)4912-5010/96 Dated 10.10.1996

۳. محمد ایوب حسن ''فن تاریخ گوئی اور بہار کے پانچ اہم تاریخ گو فارسی شعراء'' ۱۹۹۷ء

Vide (V.K.S.U.Ara) Memo No. V.Exam (Conf.)6269-88/97 Dated 20.11.1997

۴. محمد عبدالشکور ''میر محمد افضل ثابت ۔۔۔ حیات اور شاعری مع دیوان تدوین'' ۱۹۹۸ء

Vide (V.K.S.U.Ara) Memo No. V.Exam (Conf.)9421-50/2000 Dated-29.08.2000

۵. سید وجہ اللہ ''شاہ محمد وصی پھلواروی کی فارسی شاعری اور تدوین کلام'' ۲۰۰۶ء

Vide (V.K.S.U.Ara) Memo No. 352/06 Dated 25.09.2006

۶. غفران احمد ''بیسویں صدی میں بہار کے چار فارسی غزلگو شعراء''

Vide (V.K.S.U.Ara) Memo No. 115/05 Dated 07.05.2005

۷. سعیدہ امان ''پروفیسر سید حسن کی فارسی خدمات'' ۲۰۰۹ء

Vide (V.K.S.U.Ara) Memo No. 1840/09 Dated 10.12.2009

۸. نصر عبداللہ ''خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ کے سوا اہم مخطوطات اور ان کا تعارف'' Subonitad

(۱۴) وہ حضرات جنھوں نے موصوف کی نگرانی میں ریسرچ کے لیے رجسٹریشن کرایا مگر کسی باعث یا ملازمت کی وجہ سے اپنا کام مکمل نہ کر سکے:

۱. سید شاہ اصغر رضوی مرحوم ''علامہ تمنا عمادی پھلواروی ــــ حیات اور کارنامے''

M.U. Bodhgaya Registered vide Memo No. 2394(M) Dated-05.09.89

۲. شہانہ شبنم ''شاہ انور چشتی ــــ حیات اور شاعری''

M.U. Bodhgaya Registered vide Memo No.1797(M)Dated-10.10.1985

۳. نوشابہ حسنین ''مرزا غالب کے خطوط میں عصری حسیت کا تنقیدی مطالعہ''

M.U. Bodhgaya Registered vide Memo No.541/GII(M) Dated-31.07.84.

۴. محمد اقبال احمد ''شمالی ہند کی پانچ اردو مثنویوں میں نسوانی کردار''

M.U. Bodhgaya Registered vide Memo No.5340-43/96 Dated-28.11.96

۵. مختار احمد خان ''عبدالمالک آروی ــ حیات اور ادبی کارنامے''

M.U. Bodhgaya Registered vide Memo No.876(M) Dated-18.09.86

۶. محی الدین انصاری ''بابو اودھ کشور پرشاد کشتہؔ گیاوی ــ حیات و خدمات''

M.U. Bodhgaya Registered vide Memo No.4692-94/GII Dated-27.02.81

۷. محمد شاہد عثمان ''مولانا محمد ابراہیم اعظم بیاپوری ــ ترتیب و تدوین دیوان''

V.K.S.U.Ara Reg. vide memo No 314-16/94 dated-01.02.94

۸. محمد مجتبیٰ علی خان ''ایران میں اسلامی انقلاب اور فارسی ادب پر اس کے اثرات''

V.K.S.U.Ara Reg. vide letter No 4025-27/95 dated-02.10.95

۹. محمد سیف اللہ ''اردو کے تین افسانہ نگار ــــ سلطان حیدر جوش، سجاد یلدرم، احمد صدیق، مجنون گورکھپوری

V.K.S.U.Ara Reg. vide memo No 103/105/Ph.D. dated-05.04.94

۱۰. جسیم الدین خان امانؔی ندوی ''علامہ فضل امام واقف آروی ــ حیات اور کارنامے''

V.K.S.U.Ara Reg. vide memo No. Exam I 704-6/94 dated-09.03.94

۱۱. سید حفیظ الدین حسین ''نورس قاضی ــ ملّا وجہی کی سبرس'' کا منظوم ترجمہ

V.K.S.U.Ara Reg. vide memo No. 1009-11/97 dated-24.02.97

۱۲. آرزو بیگم 'بہادر شاہ ظفر کی شاعری میں قومی یکجہتی کا نظریہ''

V.K.S.U.Ara Reg. vide memo No 2738-40/2000 dated-01.01.2000

(۱۵) پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ جن دیگر یونی ورسٹی میں داخل تحقیقی مقالات برائے ڈاکٹریٹ کے ممتحن مقرر ہوئے اور زبانی امتحان (vivavoce) لینے کے لیے مدعو کیے گئے تھے۔

شمار	یونی ورسٹی	اسکالر	موضوع مقالہ تحقیقی	نگراں	تفویض
۱.	عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد	دکتر محمد عارف الدین قادری	''امواج خوبی۔تصحیح انتقادی''	پرفیسر رفیق فاطمہ	۲۰۰۱ء
۲.	ایضاً	سید محمد تنویرالدین سیف خودنمائی	دُرِ نظامی۔تصحیح وتحشیہ ومقدمہ	ازخود	۱۹۹۸ء
۳.	مدراس یونیورسٹی، چنئی	جلیل ایران منشی	چہار شاعر فارسی، ہند بعداز استقلال	پروفیسر سید صفی اللہ	۱۹۹۵ء
۴.	ایضاً	خانم راحت محمودہ	سہمِ خانوادۂ قاضی بدرالدولہ درادبیات فارسی	پرفیسر سید وحید الشرف	۱۹۹۳ء
۵.	ہر یہر سنگھ گور یونیورسٹی	شہناز احمد	شمالی بندیل کھنڈ کے اہم اردو شعراء کا تنقیدی مطالعہ		۲۰۰۰ء
۶.	ناگپور یونیورسٹی	خالدہ نگار	اردو شاعری میں عصری آگہی	ڈاکٹر راشد جمال	۱۹۸۲ء
۷.	کراچی یونیورسٹی، پاکستان	بلقیس صدیقی بنت محمد عادل صدیقی	علماء دہلی کی فقہی خدمات کا تحقیقی جائزہ	پروفیسر جلال الدین احمد نوری	۲۰۰۹ء

شمار	یونی ورسٹی	اسکالر	موضوع مقالہ تحقیقی	نگراں	تفویض
۸.	رانچی یونیورسٹی، رانچی	سحرافروز	راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں تمدن اور معاشرہ کی عکاسی	پروفیسر وہاب اشرفی	۱۹۹۶ء
۹.	ایضاً	رابعہ خاتون	مرزا شوق لکھنوی کی شاعری۔ایک تنقیدی مطالعہ	پروفیسر وہاب اشرفی	۱۹۹۸ء
۱۰.	تلکا مانجھی یونیورسٹی، بھاگلپور	ارشد رضا	منٹو کے افسانوں میں فرائیڈ کے جنسی نظریے کے اثرات	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	۱۹۹۵ء
۱۱.	ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگا	عبدالغفار انصاری	اشک امرتسری، حیات اور شاعری	پروفیسر رئیس انور	۲۰۰۲ء
۱۲.	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ	سید معاذ عرفی	بہار کے مابعد جدید اردو افسانوں کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر محمد عظیم اللہ	۲۰11ء
۱۳.	بہار یونیورسٹی، مظفرپور		ہندوستان میں فارسی قصیدہ نگاری کا ارتقاء	پروفیسر متین احمد	۱۹۸۹ء
۱۴.	ایضاً	احمد علی خان	وحشی بافقی بحیثیت غزلگو	پروفیسر متین احمد	۱۹۹۰ء
۱۵.	ایضاً	جاوید احمد	ابن یامین۔حیات، عہد اور شاعری	پروفیسر متین احمد	۱۹۹۰ء
۱۶.	ایضاً	جوہر شفیع آبادی	حضرت رضا بریلوی بحیثیت نعت گو	پروفیسر فاروق احمد صدیقی	۱۹۹۰ء
۱۷.	ایضاً	سید عبدالسبحان ہادرؔی	اردو تنقید اور حالؔی	پروفیسر فاروق احمد صدیقی	۱۹۹۳ء
۱۸	ایضاً	شوکت......	شبلی نعمانی کی سوانح نگاری کا تنقیدی مطالعہ	پروفیسر عبدالواسع	۱۹۹۳

۱۹.	ایضاً	نیّر جمال انصاری	اخترؔ قادری کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ		۱۹۹۳ء
۲۰.	ایضاً	ارشد افضل	پیامیؔ عظیم آبادی۔شخصیت اور شاعری	پروفیسر فاروق احمد صدیقی	۱۹۹۳ء
۲۱.	ایضاً	محمد مفتاح الہدیٰ	محمد نورالہدیٰ یکتاؔ۔حیات اور شاعری	پروفیسر ناز قادری	۱۹۹۳ء
۲۲.	ایضاً	محمد ظفر علی خاں	عبدالمجید مضطرؔ۔حیات اور شاعری		۱۹۹۳ء
۲۳.	ایضاً	محمد اظہر عالم	مولانا شبنمؔ کمالی۔حیات اور کارنامے	پروفیسر فاروق احمد صدیقی	۱۹۹۳ء
۲۴.	ایضاً	انوار عالم	غالبؔ کی انشاپردازی	پروفیسر عبدالواسع	۱۹۹۴ء
۲۵.	مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا	زاہد انصاری	نازشؔ سکندر پوری۔حیات اور کارنامے	پروفیسر طیب ابدالی	۱۹۹۸ء
۲۶.	ایضاً	سُمیتا سائنی	شفیع الدین نیّر کا بچوں کی کہانیوں میں اضافہ۔ایک مطالعہ	ڈاکٹر غنی حیدر ذکریاؔ	۲۰۰۲ء
۲۷.	ایضاً	امیر خسروؔ خاں	بہار کے چار جدید ناولوں کا تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر غنی حیدر ذکریاؔ	۲۰۰۴ء
۲۸.	ایضاً	محمد ناظم الدین	بہار کی خانقاہوں میں فارسی نثر کا ارتقاء	ڈاکٹر سید امام الدین	۱۹۹۴ء

۲۹.	ایضاً	ایس۔ایم۔بدرمنیر	شمس الحق شیدائی۔حیات اور کارنامے	پروفیسر محمد محفوظ الحسن	۱۹۹۵ء
۳۰.	ایضاً	محمد قاسم رضوی	فراقؔ گورکھپوری کی شاعری میں ہندوستانیت	ڈاکٹر عشرت آرا سلطانہ	۱۹۹۶ء
۳۱	ایضاً	شہلا رضا	شہسرام کے صوفی خانوادوں کی دینی وادبی خدمات	پروفیسر محفوظ الحسن	۲۰۰۴
۳۲.	ایضاً	تحسین فاطمہ	سرؔیر کابری بحیثیت شاہنامہ نگار	پروفیسر محمد محفوظ الحسن	۲۰۰۰ء
۳۳.	ایضاً	محمد امین اختر	عبدالصمد بحیثیت ناول نگار	ڈاکٹر سید محمد معزالدین	
۳۴.	ایضاً	وقارالدین احمد	فارسی زبان وادب کا ارتقاء شہسرام میں	پروفیسر حسین الحق	۱۹۹۷ء
۳۵.	ایضاً	محمد توقیر عالم	بہار میں جدید اردو شاعری کا آغاز (۱۹۶۰ء۔۱۹۹۰ء تک)	پروفیسر علیم اللہ حالیؔ	۲۰۰۲ء
۳۶.	ایضاً	محمد شوکت		پروفیسر محمد محفوظ الحسن	
۳۷.	ایضاً	نعیم الدین	ثمرؔ ٹکاروی بحیثیت نعت گو	ڈاکٹر محمد مصلح الدین	۲۰۰۹ء
۳۸	ونود بھاوے یونیورسٹی ہزاری باغ	منہاج مجروح	ظہیرؔ غازی پوری۔حیات اور شاعری	خورشید جہاں	
۳۹	مگدھ یونیورسٹی	سید ابراہیم آرزو	پروفیسر حسن آرزوؔ کی حیات وخدمات	پروفیسر حسین الحق	۲۰۱۸

۴۰	بہار یونیورسٹی مظفر پور	مصباحی کلیم الدین	فرزندانِ جامعہ اشرفیہ کا حصہ "اردو زبان وادب کے فروغ میں"		۲۰۱۶
۴۱	بہار یونیورسٹی	یاسمین خاتون	قرۃ العین حیدر بحیثیت ناولٹ نگار	پروفیسر توقیر عالم	۲۰۱۸

---

(۱۶) تقاریظ

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	سنہ تحریر
۱.	تجلیات قتیل	سید شاہ محمد قایم قتیل دانا پوری	۱۹۶۵ء
۲.	تجلیات رنگارنگ	عبدالشکور شاکر منیری	۱۹۶۵ء
۳.	رباعیات ارتقاء	سید مرغوب احمد کوکب	۱۹۶۶ء
۴.	بادۂ صافی	صوفی بانکوٹی	۱۹۷۰ء
۵.	قیامت سے پہلے	نوشاد انور نوشاد	۱۹۷۵ء
۶.	اعجاز تسکیں	منظور الحق تسکیں	۱۹۷۵ء
۷.	ارمغانِ صبح	منصور عالم کیفی	۱۹۷۶ء
۸.	خمخانۂ جامی	حکیم فرید الدین جامی وارثی	۱۹۷۶ء
۹.	سرمایۂ نشاط	سید حسن رضا ثاقب عظیم آبادی	۱۹۷۷ء

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	سنہ تحریر
۱۰.	قرآن اور اسلام	مولانا محمد شہاب الدین	۱۹۷۸ء
۱۱.	زمزمے	حبیب آروی	۱۹۸۱ء
۱۲.	قرینۂ غزل	علامہ قوس حمزہ پوری	۱۹۸۳ء
۱۳.	گمشدہ موسم	شمیم قاسمی	۱۹۸۴ء
۱۴.	یاسمین شام	مرتبہ: ڈاکٹر اقبال اختر	۱۹۸۵ء
۱۵.	ابن الوقت	مرتبہ: ڈاکٹر اقبال اختر	۱۹۸۶ء
۱۶.	سبزہ وتازہ نہالوں کے انبوہ میں	بدیع الزماں خاور	۱۹۸۶ء
۱۷.	رباعی	ڈاکٹر سید وحید اشرف	۱۹۸۷ء
۱۸.	مکتوبات بست وہشت	مترجم: ڈاکٹر سید شاہ علی ارشد	۱۹۸۸ء
۱۹.	فردوس غزل	مختار احمد عاصی	۱۹۸۸ء
۲۰.	ترقیم	راہی فدائی	۱۹۹۰ء
۲۱.	مشائخ نقشبندیہ ابوالعلائیہ	خواجہ شاہ محمد مومن نقشبندی	۱۹۹۱ء
۲۲.	ختم سفر کے بعد	ڈاکٹر رضوان اللہ آروی	۱۹۹۱ء
۲۳.	تاریخ ہجرت	سید شاہ رکن الدین اصدق	۱۹۹۴ء
۲۴.	شبنم شاداب	ڈاکٹر عبدالوحید	۱۹۹۴ء
۲۵.	رباعیات اصغر	اصغر ویلوروی	۱۹۹۴ء
۲۶.	تنویر خیال	مولانا شبنم کمالی	۱۹۹۴ء
۲۷.	بیاضِ نور	ڈاکٹر عقیل ہاشمی	۱۹۹۵ء
۲۸.	بادۂ تغزل	سید خادم حسین خادم آروی	۱۹۹۵ء
۲۹.	تجلیات	ڈاکٹر سید وحید اشرف	۱۹۹۶ء

۳۰. غزلیاتِ رضا	مرتبہ: ڈاکٹر امجد رضا امجدؔ	۱۹۹۷ء
۳۱. سفینۂ عرفاں	صابرؔ آروی	۱۹۹۷ء
۳۲. آئینۂ عرفاں	صابرؔ آروی	۱۹۹۸ء
۳۳. غزلیاتِ اختر	ڈاکٹر اخترؔ بستوی	۱۹۹۸ء
۳۴. فیضان	ڈاکٹر غازی امانؔ	۱۹۹۹ء
۳۵. دریا دریا پیاس	بشیرؔ آروی	۱۹۹۹ء
۳۶. اوگھٹ شاہ وارثی	ڈاکٹر کبیر الدین خاں وارثی	۱۹۹۹ء
۳۷. مجموعۂ نعت	مفتی رجب علی نانپاروی	۲۰۰۰ء
۳۸. تنویرِ حرم	سید شاہ فریدؔ الحق عمادی	۲۰۰۰ء
۳۹. تذکرۂ مہداواں	ڈاکٹر سید شاہد اقبال	۲۰۰۰ء
۴۰. تعلیماتِ نقشبندیہ	خواجہ شاہ محمد مومن نقشبندی	۲۰۰۱ء
۴۱. سید غیاث الدین شریفی ـــ حیات اور شاعری	ارشاد رضوی ساحلؔ سہسرامی	۲۰۰۲ء
۴۲. نغمۂ وحدت کا شاعر ـــ ساحر شیوی	ڈاکٹر مظفر حسن عالیؔ	۲۰۰۲ء
۴۳. سحر ہونے تک	آفتاب حسن سحر رودولوی	۲۰۰۳ء
۴۴. حقیقت سے چشم پوشی	مولانا غلام غوث قادری	۲۰۰۳ء
۴۵. سامانِ رسوائی	پروفیسر یحیٰی ابدالی	۲۰۰۴ء
۴۶. چکنے پات	سید التفات امجدی	۲۰۰۵ء
۴۷. تاریخ مشائخ قادریہ جلد سوم	ڈاکٹر غلام یحییٰ انجمؔ	۲۰۰۵ء
۴۸. کلامِ آسی آروی	مرتبہ: جنیدؔ آروی	۲۰۰۵ء
۴۹. راہِ حق	ڈاکٹر جوہر میاں شفیع آبادی	۲۰۰۶ء

۵۰. نعتیہ شاعری میں ہئیتی تجربے	علیم صبا نویدی	۲۰۰۶ء
۵۱. خرابے میں روشنی	ڈاکٹر محمد علی اثرؔ	۲۰۰۶ء
۵۲. کیف وکم	شاکرؔ آروی	۲۰۰۶ء
۵۳. للہ الحمد	ڈاکٹر شاداب ذکی	۲۰۰۶ء
۵۴. عقیدت کے ثمر	حبیب احمد حبیبؔ بنارسی	۲۰۰۶ء
۵۵. بہار ایجادیٔ بیدلؔ	نعیم حامد علی	۲۰۰۶ء
۵۶. محاورات عدیل حیدر آبادی	ڈاکٹر فاروق شکیل	۲۰۰۷ء
۵۷. اردو نعت گوئی اور فاضل بریلوی	ڈاکٹر عبد النعیم عزیزی	۲۰۰۷ء
۵۸. خطوط مشاہیر بنام امام احمد رضا	مرتبہ: ڈاکٹر غلام جابرؔ شمس	۲۰۰۷ء
۵۹. اعظمیات	قاضی صوفی اعظم القادری	۲۰۰۷ء
۶۰. افکار عقیدت	عطاؔ عابدی	۲۰۰۷ء
۶۱. بعد از خدا	ظفرؔ صدیقی	۲۰۰۸ء
۶۲. لمحوں کی عطا	مفتی محمد قاسم خادمؔ	۲۰۰۸ء
۶۳. بساطِ شوق	منصور احمد شوقؔ	۲۰۰۸ء
۶۴. ہندوستان میں علوم دینی کے سرچشمے	ڈاکٹر راہیؔ فدائی	۲۰۰۹ء
۶۵. باغ خوش اسلوب	ڈاکٹر منصور عمر	۲۰۰۹ء
۶۶. خطباتِ شاہ احمد علی فردوسی	شاہ احمد علی فردوسی	۲۰۰۹ء
۶۷. مجموعۂ نعت	مولانا امانیؔ ندوی	۲۰۰۹ء
۶۸. ترجمہ نکات الحق	ڈاکٹر محمد عارف الدین فاروقی	۲۰۰۹ء
۶۹. قد آوراں (فارسی)	پروفیسر عبد المنان طرزیؔ	۲۰۱۰ء

۷۰	تذکرہ قطب الاقطاب	پروفیسر غلام یحییٰ انجم	۲۰۱۰ء
۷۱	نازش نسبت	عبدالعلی عزیزی	۲۰۱۰ء
۷۲	قصیدۂ رحمت	پروفیسر حفیظ بنارسی	
۷۳	ضیائے نعت ضیا	مولانا اشتیاق احمد ضیا شہبازی	
۷۴	فرش پر عرش	حضرت سید محمد کچھوچھوی (محدث اعظم ہند)	
۷۵	کاملان......	ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی	
۷۶	طلسموں کے چراغ کی روشنی میں	طہور منصوری نگاہ	
۷۷	درپسِ سرخ چلمن	سید عابد امام زیدی	
۷۸	شہید حکیم سعید	ڈاکٹر سید شبیر حسن	
۷۹	الجواب الانیقہ	سید ابو سلمان محمد عبدالمنان قادری	
۸۰	روح غزل	ڈاکٹر تاج پیامی	
۸۱	رباعیاتِ ظفر	ڈاکٹر ظفر کمالی	
۸۲	کلام میکش	عبدالحفیظ میکش وارثی	
۸۳	روح کا سایہ	ڈاکٹر ظفر انصاری	
۸۴	روبرو	عثمان جوہری	
۸۵	مجموعہ غزل	ڈاکٹر مینو بخشی	
۸۶	نجات نامہ	ڈاکٹر ظفر انصاری	
۸۷	حرف نور	شمس بیتھوی	
۸۸	گلشنِ عقیدت	شاہ متین الحق عمادی	

۸۹	اعجازِ سخن	اعجاز مان پوری
۹۰	کثیر القوافی غزل	م۔اشرف
۹۱	اشعار طنز و مزاح	آصف آروی
۹۲	ٹوٹے لمحے	قمر گھولوی
۹۳	روشن رباعیات	سوامی شیاما نند روشن
۹۴	کوثرِ سخن	وقار حلم
۹۵	دردانۂ خیال	التفات امجدی
۹۶	بے ربط	سید فرد الحسن فرد
۹۷	شاخِ تعلقات	شہزاد اشرفی
۹۸	انحراف	سلیم ساغر
۹۹	دایرہ	اشراق حمزہ پوری
۱۰۰	عقیدت کے پھول	شنکر کیموری
۱۰۱	نغمۂ آہنگ	احسن راشد
۱۰۲	الیاسیہ جماعت	شاہ مصباح الحسن چشتی
۱۰۳	حقیقتِ محمدی	محمد حنیف الدین قریشی چشتی
۱۰۴	اسلام میں تعزیہ داری	مولانا اسمٰعیل حسینی چترویدی
۱۰۵	چاند پور کا چاند	مولانا قسیم الحق یوسفی
۱۰۶	تلاش و جستجو	ڈاکٹر ریحان ثروت

—

(۱۷) عناوینِ مقالاتِ چاپ شدہ، تحقیقی وتنقیدی بہ زبان فارسی: از طلحہ رضوی برقؔ

تقاریظ

نمبرشمار	عنوان		جلد/شمارہ	تفویض
۱	شاعرِ ناشناختۂ فارسی گوی ہند۔	شاہ قایم قتیلؔ	مجلّہ ''بیاض'' دہلی، جلد۳، شمارہ۱	
۲	تخسینِ شاعر فارسی گوی بیہار۔	احمدؔ چرمپوش	''بیاض'' دہلی جلد۹، شمارہ۱	
۳	نقیبِ حرکت وزندگی ۔	عبدالقادر بیدلؔ	ماھنامہ ''معارف'' اعظم گڈھ،	نومبر ۱۹۷۱م
۴	وحدتِ وجود وشھو ددر۔	کلامِ بیدلؔ	نامۂ فرہنگ ''تہران جلد ۳ شمارہ۴	
۵	فیضانِ روح خواجۂ	حافظؔ بہ عارفان	ماہنامہ ''آشنا'' تہران	۱۹۹۶
۶	شاہ غلام حسن۔	حسنؔ بیتھوی	مجلّہ کتابخانہ خدابخش، پٹنہ شمارہ۱۲	
۷	رباعیات نیمایوشیج	بہ نگاہِ نقد	مجلّہ قندِ پارسی'' دہلی نو۔ شمارہ۲	۱۹۹۶
۸	کریمای سعدیؔ،	شیرازی	ماھنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ۔ دسامبر	۱۹۷۸م

نمبرشمار	عنوان		جلد/شمارہ	تفویض
۹	''رحیما'' مُصنّفہ	پر مانند صبرؔ آروی	مجلّہ، ادارۂ و عربی و فارسی، پٹنہ۔	۱۹۸۳من
۱۰	غزلِ معروفِ	امیر خسروؔ دھلوی	ایضاً	۱۹۸۴م
۱۱	فلسفۂ وجودیت	درشعر بیدل	ایضاً	۱۹۸۵م
۱۲	زبانِ فارسی	اماکنِ اہلِ تصوف دربیہار	مجلّہ ، فارسی، مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا،	۱۹۹۷م
۱۳	تجرید وتفرید درکلام	مظفر شمس بلخی	مجلّہ'' دانش۔ اسلام آباد، پاکستان، شمارہ۲۴	
۱۴	معرّفی ءرسالہ فنا وبقا............		مجلّہ کتابخانہ، خدابخش پٹنہ شمارہ۱۶۹	
۱۵	"Makhdoom-e-Jahan& his philosophy of love"		Indo Iranica, kolkata,	1982
۱۶	پایان نامۂ دکترا: ''عارفانِ سخنسرای فارسی بیہار مخصوصاً دارایان خانقاہ وسجادہ نشینان''		ادارۂ تحقیقات فارسی خانۂ فرہنگِ ایران، دہلی نو	
۱۷	تدوین و ترجمہ نسخہ خطّی کتاب ''گشایش نامہ'' فارسی من تصنیف	خواجہ راج کرن کایستھ ۱۱۰۰ھ	مخزونہ شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی	
۱۸	حضرت شاہ اکبرؔ داناپوری	شاعر ارجمند فارسی		۱۹۹۷ء

———

(۱۸) (عالمی وکل ھند اردو و فارسی کانفرنس و سیمینار جن میں برقؔ صاحب شریک ہوئے، یا صدارت کی)

شمار	سیمنار	منعقدہ (مقام)
	1974	
۱	''آرہ۔ اردو ادب کا ایک قدیم مرکز'' سیمنار	''حلقۂ احباب'' کہکشاں منزل، آرہ
	1975	
۲	آل انڈیا خسروؔ سیمنار	بہار اردو اکاڈمی، پٹنہ (بہار)
۳	کل ہند محمد علی جوہرؔ سیمنار	جمشید پور، (بہار) موجودہ جھارکھنڈ
	1976	
۴	کل ہند امام احمد رضاؔ سیمنار	رضا اکیڈمی بمبئی (..............)
	1977	
۵	اولین کنگرۂ استادان فارسی ہند	جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، دہلی
۶	کل ہند اساتذہ اردو کانفرنس	رانچی یونیورسٹی، رانچی
	1978	
۸	کل ہند انجمن ترقی اردو کانفرنس	سہسرام ہائی اسکول، پٹنہ
۹	کنگرۂ استادان فارسی ھند	دانشگاہِ پٹنہ، پٹنہ
	1979	
۱۰	کل ہند علامہ اقبالؔ سیمنار	حلقہ ادب، پٹنہ [بہار]

شمار	سیمنار	منعقدہ (مقام)
11	ایضاً	بزم ادب، بیگوسرائے [بہار]
12	دوئمیں کنگرۂ استادان فارسی ھند	جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی
13	کل ہند فارسی سیمنار	دانشگاہ پٹنہ، پٹنہ
14	کل ہند طنز و مزاح سیمنار	لائنس کلب، پٹنہ [بہار]
15	بین الاقوامی غالبؔ سیمنار	غالبؔ انسٹی ٹیوٹ، نئی دھلی۔
	1980	
16	دوئمیں کنگرۂ استادان فارسی ھند	علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
17	کل ہند فارسی سیمنار	بی۔ان۔کالج، پٹنہ
18	بین الاقوامی غالب سیمنار	غالب انسٹی ٹیوٹ،..........، نئی دہلی
	1981	
19	کل ہند دانشوری سیمنار	خدا بخش لائبریری، پٹنہ
20	عالمی اردو سیمنار	''کلا درپن'' انجمن ادب، چنڈی گڑھ
21	چہارزمیں کنگرۂ استادانِ فارسی ھند	لکھنو یونیورسٹی، لکھنو
22	کل ہند فارسی سیمنار	ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ
	1982	
23	کل ہند دانشوری سیمنار	خدا بخش لائبریری، پٹنہ
24	کل ہند انجمن اردو کانفرنس	انجمن ترقی اردو، حیدر آباد [اندرا پردیش]
25	پنجمیں کنگرۂ استادان فارسی ھند	حمیدیہ کالج، بھوپال
26	کل ہند فارسی سیمنار	دانشگاہ مدراس، مدراس
27	کل ہند بیدلؔ سیمنار	ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ

28	کل ہند اکبر سیمنار	بہار اردو اکادمی، پٹنہ
29	کل ہند علامہ عزیز الحق کوثر ندوی سیمنار	علامہ کوثر اکادمی، بنارس [یو۔پی]
	1983	
30	کل ہند بیسویں صدی اردو نثری ادب سیمنار بتعاون یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، دھلی	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
31	کل ہند خسرؔو سیمنار	ادارۂ تحقیقات عربی وفارسی، پٹنہ
32	بین الاقوامی اردو سیمنار	حلقہ ادب، مظفر پور
	1984	
33	کل ہند افسر مودودی سیمنار	ان ناردان انڈیا کلچرل ایسوسی ایشن .....سی۔اے۔ برودہ [گجرات]
34	کل ہند قومی یکجہتی سیمنار	بہار اردو اکادیمی، پٹنہ
35	کل ہند جمیؔل مظہری سیمنار	گورنمنٹ اردو لائبریری، پٹنہ
	1985	
36	حضرت مخدوم جہاں سیمنار	انڈو ایران سوسائٹی، کلکتہ
37	ہشتمیں کنگرۂ استادان فارسی ھند	دانشگاہ کلکتہ، [مغربی بنگال]
38	کل ہند تصوف سیمنار بہ ہمکاری مسلم یونیورسٹی علیگڑھ و ہمدرد نیشنل فاونڈیشن	خدابخش لائبریری، پٹنہ
	1986	
39	نہمیں کنگرۂ استادانِ فارسی ھند	دانشگاہ لکھنو [اتر پردیش]
40	کل ہند غالب سیمنار	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
41	کل ہند نعت سیمنار	خانقاہ حلیمیہ ابو العلائیہ، الہٰ آباد

42	South Asian Rajimal seminar on significant Manuscripts	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بتعاون ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن
	1987	
43	دہمیں کنگرۂ استادان زبان فارسی سراسرِ ھند	دانشگاہ پٹنہ، پٹنہ
44	اردو ریسرچ کانگرس	اردو رسرچ انسٹی ٹیوٹ، پٹنہ
	1988	
45	کل ہند تحقیقات اردو کانفرنس	اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ہمکاری خدا بخش لائبریری پٹنہ
46	یازدہمیں کنگرۂ استادانِ فارسی سراسر ھند	دانشگاہ دھلی، دھلی
47	کل ہند نعت سیمنار	بریلی شریف
48	یک روزہ حافظ سیمنار	شعبہ فارسی، دہلی یونیورسٹی، دھلی
	1989	
49	ساؤتھ اشین ریجنل سیمنار آن قرانک سائینسز	خدابخش اورینٹل پبلک لابریری، پٹنہ
50	کل ہند امام احمد رضا سیمنار	پیارے لال بھون، ظفر مارگ، نئی دھلی
51	دوازدہمیں کنگرۂ استادانِ فارسی سراسر ہند [بین الاقوامی اجلاس]	ذاکر حسین کالج، اجمیری گیٹ، دھلی ٦
	1990	
52	کل ہند کلیم الدین احمد حیات وخدمات سیمنار	بہار اردو اکادمی، پٹنہ
53	آل انڈیا حج سیمنار	ہندوستانی اکاڈیمی، الہٰ آباد
54	آل انڈیا یو.جی.سی، اردو سیمنار، اردو تدریس و تحقیق‘‘۔	شعبہ عربی و فارسی و اردو ، مدراس یونیورسٹی، مدراس

55	کل ہند اساتذۂ اردو کانفرنس	دھلی
		1991
56	عالمی رحمۃ للعلمین کانفرنس	نئی دھلی
57	خدابخش لائبریری صدی تقریبات وسیمنار	خدابخش لائبریری، پٹنہ
		1992
58	کل ہند شعیب الاولیاء کانفرنس وسیمنار	براؤں شریف ، ضلع سدھارتھ نگر ، اترپردیش
59	عالمی تصوف ومشائخ کانفرنس وسیمنار	خانقاہ عالیہ قادریہ، بدایوں شریف
60	کل ہند اقبال سیمنار	بزم ادب ڈی۔اس۔کالج ، کٹیہار [بہار]
		1993
61	پانزدہمیں کنگرۂ استادان فارسی سراسر ھند	جامعہ ھندرد، نئی دہلی
		1994
62	عالمی علمائے اہلِ سنّت کانفرنس	مرکزی ثقافۃ السنیہ ، سنّی کلچر سنٹر، کوزی کوڈا، کرالہ
63	شانزدہمیں کنگرۂ استادان فارسی سراسر ہند	وشوابھارتی یونیورسٹی ، شانتی نیکیتن ، [W.B
		1995
64	ہفتدہمیں کنگرۂ استادان زبان فارسی سراسر ہند	شعبہ فارسی، دانشگاہ بمبئی، بمبئی
65	کل ہند شعیب الاولیاء سیمنار وکانفرنس	شعیب الاولیاء اکیڈمی، براؤں شریف ضلع..........

66	نیشنل سیمنار [Latter mughals and persian .... joul under the D.P.S. programme	شعبہ فارسی علیگڑھ مسلم..............
66	دورۂ سیمنار بازم محذی قربان فارسی ھند	رایزی فرنگی ایران ، معارب .... دہلی
		1996
67	ہشت دہمیں کنگرۂ استادان فارسی سراسر ھند	رام پور رضا لائبریری، رام پور [U.P]
68	جشنِ حافظِ شیرازی	خانہ جمہوری اسلامی ایران ممبئی
		1997
69		دانشگاہ گجرات، احمد آباد [گجرات]
70		خانقاہ عالیہ قادریہ ، بدایوں شریف] [U.P
71	مذاکرۂ علمی ''اسلامی نشاۃ ثانیہ یں ادب کا حصہ	رابطۃ الادب الاسلامی، لکھنو [U.P]
		1998
72	کل ہند سیمنار بمناسبتِ پنجاہ سالہ جشن آزادی ہند ''منشی نول کشور شعر وخدمات وادبی شان''	گروہ فارسی، دانشگاہ لکھنو، لکھنو
73	عالمی شیخ بہاءالدین انصاری سیمنار	آستانہ شیخ بہاء الدین ، دولت آباد ، دکن
74	بین الاقوامی غالب سیمنار ''اردو وفارسی نظم ونثر کو غالب کی دین''	غالبؔ انسٹی ٹیوٹ ، ماتا....لین، نئی دہلی
		1999
75	عالمی اسلامی کانفرنس وتصوف سیمنار	خانقاہ عالیہ قادریہ، بدایوں شریف

76	بست ویکمیں کنگرۂ استادانِ فارسی سراسر ہند	پنجاب یونیورسٹی، چنڈی گڑھ
2000		
77	بیست ودومیں کنگرۂ استادان فارسی سراسر ہند	دانشا گاہ پنجابی، پٹیالہ پنجاب
2001		
78	کل ہندشایخ وسجادہ نشنیان کانفرنس	گھاٹو ٹانڈ ’’ ضلع ھزاری باغ ‘‘جھارکھنڈ
2002		
79	بیست وسومیں کنگرۂ استادان فارسی سراسر ہند	خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ
2003		
80	کل ہندسیمنار بموقع صدسالہ عرس سید اعظم علی شایق دکنی	حیدرآباد[اندھراپردیش]
81	جشن صدسالہ حضور حافظ بخاری قدس صرہ	وادئی چشت ، پھپھوند شریف ، اوریا[یو۔پی]
2004		
82	بین الاقوامی اردوادبی کانفرنس	دارالادب سعودیہ، جدّہ سعودی عربیہ
83	اردوکانعتیہ سیمنار	نعیم حامد علی منزل، ’’مدینہ طیبہ‘‘
2005		
84	قومی سیمنار’’اردوزبان وادب کے فروغ میں بہارکاحصّہ‘‘	شعبہ اردو، للت نراین متھلا یونیورشی ، دربھنگا
2006		
85	دوروزہ کل ہند’’جشن نعت رسول وسیمنار‘‘	زاویہ قادریہ ٹرسٹ، حیدرآباد

86	توسیعی خطبات سیریز[شمس نیری]	بہاراردواکادمی، پٹنہ
87	تنظیم صوفیا کانفرنس	جھریا، دھنباد[جھارکھند]
2007		
88	مو لانا جلال الدین رومی سیمنار بھمکارئی امریکی مرکز کلکتہ	خدابخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ
89	دوروزہ آل انڈیا قومی سیمنار	شعبہ اردو، ویرکنورسنگھ یونیورسٹی، آرہ
2008		
90	بین الاقوامی سیمنار’’ ملفوطات میں ہندوستانی تہذیب ثقافت کی عکاسی‘‘	شعبہ فارسی، علیگڑھ یونیورسٹی، علیگڑھ
91	علامہ شبنم کمالی سیمنار	شبنم اکاڈمی، پٹنہ
92	مشاہیرعلماء بہارسیمنار	الجامعہ الرضویہ، پٹنہ سیٹی
93	آل انڈیا سیمنار’’تذکرہ نگاری میں خانقاہوں کی خدمات۔	خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف، پٹنہ
94	کل ہندتعلیمی کانفرنس	مدرسہ اصدقیہ مخدوم شرف، بہارشریف ،[نالندہ]
2009		
95	ب۔نوری تصوف سیمناروکانفرنس	اسلامک کلچرسنٹر، نئی دہلی
96	ج۔ عالمی سیمنار و کانفرنس [جشن زرّین دارالعلوم علیمیہ]	دارالعلوم علیمیہ حمد اشاہی ، بستی [یو۔پی]
97	’شاہ اکبرسیمنار‘صدسالہ عرس	خانقاہ سجادیہ’شاہ ٹولی‘داناپور

نمبر	عنوان	مقام / ادارہ
98	کل ہند ملک العلماء علامہ ظفر الدین سیمنار	دارالعلوم فیضان مفتی اعظم ہند، ممبئی3
	2010	
99	آل انڈیا علماء مشائخ کانفرنس	کل ھند علماء و مشائخ بورڈ، نئی دہلی [شاخ پٹنہ]
100	آل انڈیا جشن زریں سیمنار	شعبہ" اردو، دھلی یونیورسٹی، دھلی
101	سیمنار بعنوان" دھلی کی تہذایب وثقافت کا ذکر تاریخی کتابوں میں"	شعبہ فارسی ایضاً
102	نیشنل سیمنار" مجاھدین آزادی کی ادبی خدمات"	جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دھلی منجانب زھرہ، پبلک اسکول ابوالفضل ....
103	آل انڈیا علامہ اقبال سیمنار	شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دھلی ہمکاری قومی کونسل برائے فروغ اردو و ساہتیہ اکادمی، دھلی
	2011	
104	آل انڈیا سیمنار" جشن صد سالہ آغاز فتویٰ نویسی	القلم فاونڈیشن، پٹنہ
105	کل بہار یکروزہ علمی وادبی سیمنار	مولانا مظہر الحق عربی وفارسی یونیورسٹی، پٹنہ
106	آل انڈیا قومی کانفرنس	دھلی
107	آل انڈیا سیمنار" تعارف مخطوطات ناشناختہ فارسی۔	شعبہ فارسی، دھلی یونیورسٹی، دھلی

نمبر	عنوان	سال	مقام / ادارہ
108	آل انڈیا سیمنار بعنوان شاہ حامد حسین حامد عظیم آبادی۔		خانقاہ حضرت شاہ ارزانی، پٹنہ
109	سہ روزہ بین الاقوامی سیمنار" حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین یحییٰ منیری"۔		خانقاہ معظم، بہار شریف [نالندہ]
110	سہ روزہ قومی سیمنار"بہار اور مشاہیر اردو ادب"		خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ
		2012	
111	کل ہند تعلیمی کانفرنس [لائبریری کی اہمیت و مقصدیت]		رضا لائبریری، وجے پور، مرزا پور [یوپی] [غوث اکوریٰ ایجوکیشنل سو سائٹی]
112	توسیعی خطبات"مولانا شبنم کمالی کی خدمات"		بہار اردو اکادمی، اردو بھون، پٹنہ
113	کل ہند رباعی سیمنار و رسم واجرا کتاب سوامی شیاما نند روشن		بھارتی ودیا بھون، دھلی
114	یو جی سی قومی سیمنار" معاصر اردو شاعری اور فیض احمد فیض۔		شری اروند مہیلا کالج، پٹنہ
115	موجودہ نظام تعلیم سمت اور نظریہ	2013	بزم قلم کار۔ گیا
116	کل ہند مسلک اعلاحضرت کانفرنس وسیمنار		مدھوبنی، بہار
117	آل انڈیا تصوّف سیمنار		خانقاہ شاہ ارزانی، پٹنہ
118	آل انڈیا صنف رباعی سیمنار		انڈین انسٹی ٹیوٹ، مودی روڈ، دہلی
		2014	
119	نیشنل سرکار آسی سیمنار	بنارس	شاہ عبدالعلیم آسی فاؤنڈیشن، نئی دہلی
120	کل ہند تصوف سیمنار		خانقاہ شاہ دیوان ارزانی، پٹنہ

2015

121	کل ہند سمینار شیخ عبدالقدوس گنگوہی	جامعہ چشتیہ خانقاہ شیخ العالم رودولی شریف
122	عالمی سیرت کانفرنس	برمنگھم (U.K.) 2004
123	سیرت کانفرنس	لندن (U.K.) 2004
124	سیرت کانفرنس	کراچی (پاکستان) 2005
125	کل ہند مشائخ و سجادگان کانفرنس	گھاٹو ٹانڈ (جھارکھنڈ) 2005

2016

126	عالمی صوفی کانفرنس	دہلی
127	مظہر الحق یونیورسٹی پٹنہ، (تحفظ اردو و عربی وفارسی) سیمنار	3/دسمبر 2016
128	بین الاقوامی سیمنار (عربی فارسی اردو کی ثقافتی روایت)	بہار اردو اکادمی پٹنہ
129	آل انڈیا سیمنار و رسم اجرا (نسیم بہار)	بہار اردو اکادمی پٹنہ
130	ریسرچ اسکالرز سیمنار	غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی
131	کل ہند فیض سیمنار	اروند مہیلا کالج، پٹنہ

2017

132	کل ہند سیمنار بیادگار کلیم عاجز	بہار اردو ڈایرکٹوریٹ پٹنہ
133	کل ہند مذاکرہ و صدارت بیاد گار رمز عظیم آبادی (سیمنار)	اردو ڈائرکٹوریٹ بہار پٹنہ

134	حفیظ بنارسی سیمنار	بہار اردو اکادمی پٹنہ
135	کل ہند سیمنار تصوف: امن عالم کا ضامن	خانقاہ دیوان شاہ ارزانی، پٹنہ

2018

136	شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی سیمنار	شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی کی اردو خدمات۔
137	تصوف سیمنار	اسلامک سینٹر جمشید پور
138	جلسہ و سیمنار کیف عظیم آبادی	شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی
139	یادگار جلسہ و سیمنار کلیم الدین احمد	بہار اردو ڈائرکٹوریٹ پٹنہ

(۱۹) اعزازات وانعامات

☆ اردو کی نعتیہ شاعری پر بہار اردو اکادمی نے انعام سے نوازا ۱۹۷۵ء

☆ ''غور وفکر'' پر 〃 〃 ۱۹۷۷ء

☆ ''نقد وسنجش'' پر اتر پردیش اردو اکادمی نے انعام سے نوازا ۱۹۸۳ء

☆ ''ارزش ادب'' پر بہار اردو اکادمی اور بنگال اردو اکادمی نے دوسرا اور تیسرا انعام دیا۔ ۱۹۹۶ء

☆ ''شہابِ سخن'' (رباعیوں کا مجموعہ) بہار اردو اکادمی اور بنگال اردو اکادمی نے دوسرا اور تیسرا انعام دیا۔ ۱۹۹۷ء

☆ ''اربعین'' بہار اردو اکادمی اور بنگال اردو اکادمی نے دوسرا اور تیسرا انعام دیا۔ ۲۰۰۸ء

☆ تقاریظ بہار اردو اکادمی اور بنگال اردو اکادمی نے دوسرا اور تیسرا انعام دیا۔ ۲۰۱۴ء

☆ ۲۰۱۰ء میں صدر جمہوریہ ہند نے ممتاز فارسی اسکالر کے قومی اعزاز سے نوازا اور تاعمر مبلغ پچاس ہزار روپے سالانہ وظیفہ جاری کیا۔

☆ ۲۰۱۱ء میں حمد ونعت اکاڈمی دہلی نے بہترین نعت گو کا اعتراف کرتے ہوئے علامہ شبلی ایوارڈ سے نوازا۔ شال اور مومینٹو بھی پیش کیے گئے۔

☆ انجمن صوفیاء ''مارہرہ شریف'' نے عالمی سے می نار منعقدہ دہلی میں ''ماہر تصوف'' کی حیثیت سے ایک نقرئی مومنٹو سے نوازا۔ ۲۰۱۳ء

☆ خانقاہ حضرت شاہ دیوان ارزانی پٹنہ میں کل ہند تصوف سے می نار ۲۰۱۴ء میں آفتابِ شریعت تصوف ایوارڈ مومنٹو، شال وتوصیف نامہ دیا گیا۔

☆ کیف عظیم آبادی ادبی ٹرسٹ نے ۲۱ فروری ۲۰۱۸ء کو شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی میں اعزازیہ، شال، مومنٹو اور سپاس نامہ دیا۔

(۲۰) اسفار

الحمد للہ چار بار حج بیت اللہ شریف اور زیارت حرمین شریفین کی سعادت حاصل کی (۱۹۷۰ء، ۲۰۰۲ء، ۲۰۰۴ء اور ۲۰۰۸ء میں)

ایران ایک ماہ کے لیے ۱۹۹۶ میں، لندن دو ماہ کے لیے ۲۰۰۴ء میں، پاکستان ایک ماہ کے لیے ۲۰۰۵ میں اور پھر لندن ایک ماہ کے لیے ۲۰۱۲ میں جانا ہوا۔

○○○

منم کہ ذرّۂ ناچیزِ خاکِ داناپور

پروفیسرطلحہ رضوی برقؔ

چو کحل بینشِ ما خاکِ آستانِ شما ست
کجا رویم بفرما ازیں جناب کجا

ابی وشیخی حضرت علامہ سید شاہ محمد قایم رضوی قتیلؔ سجادہ نشین خانقاہِ قدیم چشتیہ نظامیہ، داناپور کی تین شادیاں ہوئی تھیں۔ پہلی ۱۹۱۳ء میں حکیم میر حسن علی زمیندار آرہ کی صاحبزادی سے جو چھے (٦) سال کے بعد ہی انتقال فرما گئیں۔ ان سے کئی اولادیں بھی ایامِ طفلی میں ہی اللہ کو پیاری ہوئیں۔ پھر آپ کی دوسری شادی میر افاضت حسین رئیس جموانواں (پیر بیگہ شریف) کی صاحبزادی سے ہوئی مگر وہ بھی دو تین سال رہ کر وفات پا گئیں۔ بعدہٗ حضرت کی تیسری شادی جناب سید شاہ علی محی الدین مجیبی پھلواری شریف کی تیسری دختر بی بی محمودہ خاتون سے انجام پائی جن سے سات بیٹے اور دو بیٹیاں اللہ نے عطا فرمائیں۔ راقم الحروف محمد طلحہ رضوی برقؔ اور برادرم سید شاہ نظام الدین رضوی اور ہماری دونوں بہنیں عامرہ خاتون و بشریٰ خاتون بفضلہٖ تعالی حی القایم اور ماشاء اللہ کثیر الاولاد ہیں۔ دیگر کم سنی میں ہی داغِ مفارقت دے گئے۔

میں اپنے نانہالی مکان واقع محلّہ باولی، پھلواری شریف میں جمادی الاول ۱۳۵۷ھ میں پیدا ہوا۔ والد ماجد نے تاریخی نام ناصر رضوی (۱۳۵۷) رکھا مگر چھٹی رات رسماً قلم وشمشیر پکڑانے کے وقت حضرت سید شاہ نعمت اللہ فریدی سجادہ نشین خانقاہ فریدیہ پھلواری شریف نے فرمایا کہ زبیر (میرے چھوٹے ماموں) کے بھانجے کو طلحہ ہونا چاہیے۔ لہٰذا میرا نام اسی وقت

سے طلحہ پڑا اور اسکول میں داخلے کے وقت سید محمد طلحہ رضوی لکھوایا گیا۔

میری پرورش وپرداخت والدین کریمین کے زیر سایہ خانقاہی ماحول میں صوفیانہ انداز سے ہوئی۔ گھر میں ہی والدۂ ماجدہ سے ناظرہ اور ابتدائی فارسی پڑھی پھر والد محترم نے ابتدائی عربی اور گلستاں، بوستاں، مامقیماں، کریمائے سعدی و پند نامۂ عطار پڑھا کے انگریزی کی طرف متوجہ کیا۔ ابّا مرحوم عربی و فارسی کے علاوہ اسکول و کالج سے انگریزی کے تعلیم یافتہ تھے۔ انگریزی میں ان کی استعداد غیر معمولی تھی۔ اسلامیات پر انگریزی زبان میں ان کی چھے کتابیں شایع ہوئیں۔ وہ پٹنہ کمشنرس آفس میں تیس سال تک کانفیڈنشیل سکشن کے انچارج رہے۔ انگریز افسران ان کی انگریزی زبان پر مہارت وعبور سے بے حد متاثر تھے اور دوران ملازمت بھی ان کے مشایخانہ وضع کی پابندی یعنی دستار وعبا اور پٹکا کو مستحسن نظروں سے دیکھتے تھے۔ انھوں نے عزّت و وقار کے ساتھ ملازمت کی اور اماں مرحومہ کے انتقال (۱۹۵۴) کے فوراً بعد بڑی شان بے نیازی سے قبل از وقت ریٹایرمنٹ لے لی۔

میں نے جب ہوش سنبھالا یہی دیکھا کہ ہر اتوار کو صبح سات ساڑھے سات بجے سے بارہ بجے تک حویلی کا ایک زنانہ کمرہ جس کا ایک دروازہ ڈیوڑھی میں کھلتا تھا ابا مرحوم کی نشست کے لیے آراستہ کر دیا جاتا اور وہ اپنے حجرے سے اسی میں تشریف لے آتے۔ ان کے احباب، مریدین شاگردان کی آمد و رفت جاری رہتی اور یہ علمی محفل چار گھنٹے جمی رہتی۔ علماء سے فقہی مسائل پر گفتگو ہوتی۔ شاگردان رہتے تو ادبی و شعری نکات پر روشنی ڈالی جاتی۔ اساتذۂ فارسی و اردو کے اشعار زیرِ بحث آتے اور فصاحت و بلاغت کا دریا بہتا۔ اکثر ابا جان کے کچھ وکیل دوست اور شاگرد، سرکاری افسران وغیرہ آجاتے تو سیاستِ حاضرہ پر بھی باتیں ہوتیں، صوفیا و مشایخ سے کوئی تشریف لائے ہوتے تو بزرگانِ خانقاہ کا ذکر ہوتا، تصوف و معرفت پر دلچسپ گفتگو ہوتی۔ میں ہر اتوار کو اس علمی مجلس اور محفلِ گہربار سے حسبِ توفیق فیض یاب ہوتا کیونکہ حاضرین کی ضیافت خانقاہی چاے سے میرے ہی ذمے تھی۔ مجھے اس صحبت سے جو فایدہ ہوا وہ اسکول و کالج کی تعلیم پر بھاری رہا اور جلابخش ثابت ہوا۔ آج وہ دن یاد آتے ہیں تو خواب و خیال سا لگتا ہے۔ ساڑھے

سات آنے سیر شکر (چینی) لاتا اور چار آنے میں بروک بانڈ ڈسٹ چائے پتی کی ایک چھٹانک کی پیکنگ، جس کا زرد رنگ اور اس پر چائے باغ کی عورت سرخ لباس میں آج بھی ذہن سے چپکی ہے۔ توکل وقناعت کے ساتھ تھوڑے کو بہت جاننے میں کتنا اطمینان اور سکون تھا۔

یہ ناچیز ۱۹۴۸ء میں انگریزی اسکول کے پانچویں درجے میں داخل ہوا۔ ۱۹۵۴ء میں والدہ کا انتقال ہوگیا اور میں ملول ومخبوط رہنے لگا، اسی عالم میں میٹریکولیشن کا امتحان بھی دے دیا۔ محض پانچ نمبروں کی کمی سے میں تھرڈ ڈیویژن میں میٹرک پاس کرگیا۔ مقامی بی۔ ایس۔ کالج میں آئی۔ اے۔ کلاس میں داخلہ ہوگیا۔ یہ کالج اس وقت بہار یونیورسٹی کے تحت تھا اس کالج سے آئی۔ اے۔ کا پہلا بیچ ۱۹۵۷ء میں امتحان پاس کرسکا۔ ۹۶ کامیاب طلبا میں میرا نام سرفہرست تھا۔ ہائی سکنڈ ڈیویژن مارکس کے ساتھ میں نے پٹنہ کالج پٹنہ میں بی۔ اے۔ اردو آنرز کلاس میں داخلہ لیا۔ ۱۹۶۰ء میں بی۔ اے آنرز فرسٹ کلاس میں نمایاں طور پر کامیاب ہوا اور ایم۔ اے۔ اردو میں داخلہ لے لیا۔ ۱۹۶۲ء میں ایم۔ اے۔ بھی فرسٹ کلاس میں اچھے نمبروں کے ساتھ کرلیا۔ ۱۹۶۳ء میں ڈیفنس اکاؤنٹس آفس پٹنہ میں انگریزی زبان میں ٹسٹ امتحان پاس کرکے مرکزی حکومت کی ملازمت حاصل کی۔ اپر کلاس آڈیٹر بحال ہوا مگر چند ماہ کے بعد ہی مستعفی ہوگیا کیونکہ نوادہ کے کنہای لال ساہو کالج میں اردو لکچر شپ کا تقرری نامہ آگیا تھا۔ اسی سال رشتۂ ازدواج میں بھی بندھ گیا۔ دسمبر ۱۹۶۳ء میں وایس چانسلر مگدھ یونیورسٹی نے آرہ کے ایچ۔ ڈی۔ جین کالج میں بحیثیت لکچرار اردو وفارسی بحال کیا اور چند مہینوں میں ہی بہار پبلک سروس کمیشن نے انٹرویو لے کر تقرری مستقل کردی۔ آرہ آکے میں مطمئن ہوا اور زندگی کی ہموار ڈگر پر چل پڑا۔

والدۂ ماجدہ کب کی وفات پاچکی تھیں۔ حضرت ابی وشیخی ہی بیشتر میرے ساتھ رہے۔ آرہ اہل علم کی جگہ رہی ہے۔ شعروسخن کا قدیم مرکز، صوفیا ومشائخ کی آماجگاہ اور عربی درسگاہوں اور مدرسوں کے لیے مشہور۔ اس ماحول میں زندگی کے شب وروز گذرتے رہے۔ اباجان داناپور سے اکثر وبیشتر آرہ آجاتے۔ ملکی محلّہ آرہ کے وسیع میدان میں (جواب نہیں رہا) دستار بندی علماء کے عظیم الشان جلسے، کل ہند مشاعرے اور نیتاؤں کے سیاسی جلسے منعقد ہوتے رہے۔

بزمِ احباب، آرہ کے ماہانہ طرحی مشاعرے، پروفیسر حفیظ بنارسی مرحوم، پروفیسر انیس امام، ڈاکٹر تاج پیامی، پروفیسر علیم اللہ حالی، پروفیسر منصور عالم، ش۔م۔ عارف ماؔہر آروی، ظفؔر کاکوی، صابر آروی، شاکر آروی، گہؔر عظیم آبادی اور بزرگوں میں علامہ شاہ فضل امام واقف آروی، علامہ ثاقب عظیم آبادی، سید فخرالدین شاد آروی، نصرت آروی، چودھری محبوب عالم وغیرہ کا مجمع رشکِ صد کہکشاں تھا۔ یوں تو تقریباً روز ہی بعدِ عصر حضرت کے ملنے والے اور کبھی میرے شرکاء کار آتے رہتے۔

۱۹۷۰ء میں میں نے تاج الشعراء حضرت اکبر داناپوری کی حیات وشاعری پر تحقیقی مقالہ لکھ کے پٹنہ یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری حاصل کی۔ اسی سال حضرت والد ماجد کی معیت میں فریضۂ حج ادا کیا اور زیارتِ حرمین شریفین کی سعادت حاصل کی۔ ۱۹۷۹ء میں مشائخ شعرا فارسی بہار پر فارسی زبان میں ایک تحقیقی مقالہ لکھ کر پٹنہ یونیورسٹی سے ڈی۔ لٹ کی ڈگری لی۔ اس مدت میں اردو وفارسی کے آل انڈیا سیمناروں اور مذاکروں میں شرکت کے لیے ملک کی مختلف یونیورسٹیوں اور بڑے شہروں میں جانا ہوا۔ لکھنے پڑھنے کا شوق دامن گیر تھا لہٰذا اردو فارسی اور اکثر انگریزی میں بھی مضامین ہند وپاک اور ایران کے موقر مجلوں میں شایع ہوتے رہے۔ اپنی کم مائیگی وہیچمدانی کے باوجود علمی وادبی حلقوں میں کسی طرح ایک شناخت مل گئی۔

جولائی ۱۹۸۵ء میں حضرت ابی وشیخی کا وصال ہوگیا۔ گویا میرے سر سے چھت اٹھ گئی۔ ان کے فاتحہ چہارم کے موقع سے بزرگان خاندان، مشائخ عظام اور نمایندگان خانقاہ نے اس حقیر کو حضرت کی جگہ سجادہ خانقاہ شریف پر بٹھادیا اور رسمِ دستار بندی ادا فرمائی۔ نذریں گذاریں اور قوالوں نے شہانہ گایا۔ جب سے خانقاہی ذمے داریاں اور معمولات کی دائیگی میرے سر ہے، رب تعالی مجھے اس کا اہل فرمائے۔ اس کے بعد میں اہل وعیال کو آرہ سے داناپور جدی مکان میں لے آیا اور آرہ کالج ویونیورسٹی کی آمدورفت داناپور سے ہی کرتا رہا۔ ملکی محلّہ آرہ میں میرا غریب خانہ ''دانشکدہ'' کرایے پر لگ گیا۔ صرف اس کا ڈرائنگ روم اپنے تصرف میں رکھا جہاں اکثر وبیشتر ٹھہر جایا کرتا تھا۔ بالآخر حالات کے تحت ۱۹۹۴ء میں اس مکان کو جو بڑے

شوق سے بنایا تھا فروخت کردیا۔

۱۹۹۶ء میں حکومتِ ہند نے ۱۲ منتخب فارسی اسکالرز کا ایک تعلیمی وفد ایران بھیجا تھا جس میں میں بھی شامل تھا۔ دہلی میں ایران کے لیے پرواز سے قبل ایک شب جامعۂ نظام الدین اولیاء، ذاکر نگر دہلی میں اپنے محسن و مشفق و کرم فرما حضرت علامہ ارشد القادری کی خدمت میں چند دوستوں (ہمسفروں) کے ساتھ حاضر ہوا، شب بھر قیام کیا۔ علامہ مرحوم کی خوشی و مسرت اور ان کی نوازشیں نیز ہمارے خورد و نوش اور آرام کے لیے ان کی ہدایت و تاکید مزید آج بھی مجھے اور میرے ان دوستوں کو یاد آتی ہیں۔ حضرت علامہ میرے والد کے اخص محبین میں تھے اس نسبت سے بھی وہ مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔ ایران سے واپسی پر انھوں نے جامعہ نظام الدین میں مجھے پرتکلف استقبالیہ دیا اور عزت بخشی۔ مجھے اس پر فخر و ناز ہے۔ وہ بار بار فرماتے کہ میاں جلد ریٹائر کرو میں تمھیں دلی لانا چاہتا ہوں۔ یہ ان کی دعاؤں کا اثر ہے کہ آج میں دلی یونیورسٹی میں ویزیٹنگ پروفیسر ہوں۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنی رحمت کے زیرِ سایہ آسودہ رکھے اور ان کے مراتب بلند فرمائے آمین ؎

خوش آن نظر کہ لب جام و روے ساقی را

ہلال یکشبہ و ماہِ چاردہ دانست

جناب اے۔ آر۔ قدوائی گورنر بہار سے حضرت علامہ کے بڑے قریبی تعلق اور گہرے مراسم تھے۔ ایک بار وہ مجھے اپنے ساتھ ان سے ملانے لے گئے تھے۔ وہ بہت چاہتے تھے کہ میں بہار مدرسہ اگزامنیشن بورڈ، پٹنہ کی صدارت قبول کرلوں مگر چند در چند حالات کے پیش نظر میں نے اپنی معذرت پیش کردی تب انھوں نے مظفر پور کے پروفیسر زبیر احمد قمر کو مدرسہ بورڈ کا صدر بنوایا۔ ایک بار وہ باصرار مجھے امتحانات کا مشاہد بنا کر اپنے مدرسہ جمشید پور لے گئے اور تقریباً دس دن میں ان کے اخلاق کریمانہ اور مربیانہ شفقتوں سے فیضاب ہوتا رہا۔ دیر دیر تک مجھے اپنے قریب بٹھاتے اور بڑی قیمتی باتیں کرتے۔ افسوس آں قدح بشکست و آں ساقی ماند ؎

نبود نقش دوعالم کہ رسم الفت بود

زمانہ طرح محبت نہ ایں زماں انداخت

لکھتا رہوں تو لکھتا ہی رہوں گا اور باتیں ختم نہ ہوں گی۔ یوں بھی اپنے بارے میں زیادہ لکھنا اچھا نہیں لگتا۔ میری ایک کتاب بعنوان ''عشرۂ مبصرہ'' شایع ہو رہی تھی تو اس میں آخری پلیٹ کے دو صفحے سادہ جا رہے تھے۔ دوستوں کے مشورے سے میں نے اسے اپنے Biodata (سوانحی خاکہ) کے لیے استعمال کرلیا۔ مناسب سمجھتا ہوں کہ اسے یہاں نقل کردوں۔

سوانحی کوائف

پورا نام : سید محمد طلحہ رضوی

تخلص : برقؔ

ولدیت : حضرت سید شاہ محمد قائم رضوی چشتی نظامی قتیل داناپوری قدس سرہٗ

والدہ : حضرت بی بی محمود خاتون مجیبی، پھلواری رحمت اللہ علیہا

ولادت : جمادی الاوّل ۱۳۵۷ھ۔ ۲۵؍جنوری ۱۹۴۱ء

تعلیم : ☆ میٹرک ۱۹۵۵ء بلدیوا ہائی اسکول داناپور کینٹ۔

☆ آئی۔اے (آرٹس) ۱۹۵۷ء بی.ایس.کالج، داناپور۔

☆ بی.اے (اردو آنرز) ۱۹۶۰ء، پٹنہ کالج، پٹنہ۔

☆ ایم.اے (اردو) ۱۹۶۲ء، پٹنہ یونی ورسٹی، پٹنہ۔

☆ ایم.اے (فارسی) ۱۹۷۹ء، پٹنہ یونی ورسٹی، پٹنہ۔

☆ سی.او.پی (فارسی)، جواہر لال نہرو یونی ورسٹی، دہلی۔

☆ پی.ایچ.ڈی. (اردو) ۱۹۷۰ء، پٹنہ یونی ورسٹی، پٹنہ

ملازمت : ☆ لیکچرار و صدر شعبۂ اردو فارسی، ایچ۔ڈی۔جین کالج آرہ، (۷دسمبر ۱۹۶۳ء تا ۱۳ نومبر ۱۹۸۰ء)۔ ریڈر (۱۴؍نومبر ۱۹۸۰ء تا ۳؍فروری ۱۹۸۵ء)۔

☆ پروفیسر وصدر شعبۂ جین کالج آرہ، بعداً ویر کنور سنگھ یونیورسٹی، آرہ (۴؍فروری ۱۹۸۵ء تا ۳۱؍جنوری ۲۰۰۱)۔

بازنشینی ریٹائرمنٹ : ۲؍فروری ۲۰۰۱ء

تاہل : بی بی زیب النساء بنت مولوی منظور احسن صدیقی (مہونی، ضلع نالندہ)

اولاد : چار بیٹے اور چار بیٹیاں۔ بفضلہٖ تعالیٰ سبھی شادی شدہ وصاحبِ اولاد۔

رہائش : ''دانشکدہ'' شاہ ٹولی، داناپور کینٹ، ضلع پٹنہ ۸۰۱۵۰۳۔

تلمّذ : از والد ماجد قتیلؔ داناپوری۔

بیعت وخلافت : از والد ماجد در سلسلۂ عالیہ چشتیہ نظامیہ وخلافت در جمیع سلاسل۔

سجادگی : پس از مرگ پدر بزرگوار بر سجادہ مخدوم سید شاہ محمد یٰسین چشتی نظامی، آستانہ عالیہ چشتیہ نظامیہ، داناپور

تصانیف : (۱) اردو کی نعتیہ شاعری مطبوعہ ۱۹۷۴ء (۲) غور فکر (تنقیدی مضامین) ۱۹۷۶ء (۳) نقد سنجش (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) ۱۹۸۲ء (۴) شاہ اکبر داناپوری (تحقیق) ۱۹۸۵ء (۵) ارزشِ ادب (تنقیدی مضامین) ۱۹۹۵ء (۶) شایگاں (مجموعۂ غزلیات) (۷) شہاب سخن (رباعیات) ۱۹۹۶ء (۸) Mysticiam in our poetry ۱۹۸۴ء (۹) قطعۂ تاریخ (فارسی) ۲۰۰۷ء (۱۰) اربعین (نعتیہ مجموعہ) ۲۰۰۸ء (۱۱) سہرے ہی سہرے ۲۰۰۸ء (۱۲) عشرہ مبصرہ ۲۰۰۹ء۔

مرتبہ کتابیں : (۱) گلستانِ سخنِ محمودہ (مجموعہ نعت) ۱۹۵۶ء (۲) تجلیات قتیلؔ (دیوان اردو) ۱۹۶۵ء (۳) خورشید سحر (دیوان فارسی) ۱۹۶۸ء (۴) ضیاء العروس از حضرت قتیلؔ ۱۹۸۶ء

تشنۂ طبع : (۱) تذکرہ شعرائے داناپور (۲) عرفائے سخن سرائے بہار (فارسی) (۳) آئینہ تصوف (۴) اذکار جمیل بہ تذکار قتیلؔ (۵) قاموس تاریخ گوئی (۶) منتشرات (نظمیں) (۷) مناصب التواریخ (اردو وفارسی)۔

فارسی مقالات : ہندوپاک وایران کے رسائل ومجلّات میں تقریباً پچیس تحقیقی و تنقیدی مقالات بزبان فارسی۔

اردو مضامین : تقریباً ڈیڑھ سو ادبی و مذہبی مقالات مطبوعہ بہ رسائل وجراید

تقاریظ : ۱۱۸ نثری وشعری کتابوں میں تقریظیں شایع ہوئیں۔

سمینار و کانفرنس : ۱۴۰ آل انڈیا سمینار و کانفرنس (اردو وفارسی) میں شرکت و مقالہ خوانی اور اکثر کی صدارت کی۔

مناصب : ڈین فیکلٹی آف ہیومینیٹیز، ممبر آف سنڈیکیٹ، ممبر آف سینیٹ، ممبر آف ریسرچ کاؤنسل، وی۔ کے۔ اس یونیورسٹی، آرہ۔ بہار اور بہار سے باہر کی اکثر یونیورسٹی میں بورڈ آف اسٹڈیز اور بورڈ آف اکزامینیشن کے ممبر رہے، ممبر آف سنڈیکیٹ، مولانا مظہر الحق عربی وفارسی یونیورسٹی، پٹنہ۔ ۲۴؍فروری ۲۰۱۰ء سے شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی میں بحیثیت ویزٹنگ پروفیسر مامور ہوئے اور جامعہ ہمدرد دہلی نے اپنے بورڈ آف اسلامک اسٹڈیز کا رکن بنالیا ہے۔

نگراں مقالات تحقیقی برائے ڈاکٹریٹ: فارسی میں سات اسکالرز نے پی ایچ۔ ڈی ڈگری حاصل کی۔ اردو میں ۲۷ اسکالرز نے یہ ڈگری لی، ایک نے ڈی لٹ کی۔

اسفار : بفضلہٖ تعالیٰ چار بار حج بیت اللہ شریف وزیارت حرمین شریفین کی سعادت حاصل کی۔ (۱۹۷۰ء، ۲۰۰۲ء، ۲۰۰۴ء، اور ۲۰۰۸ء)

ایران ایک ماہ کے لیے ۱۹۹۶ء میں،لندن ۲ماہ کے لیے ۲۰۰۴ء میں اور پاکستان ایک ماہ کے لیے ۲۰۰۵ء میں

نشریات : آل انڈیا ریڈیو، پٹنہ ودہلی سے ۱۹۶۱ء تا حال غزلیں،نعتیں اور مقالات نشر ہوتے رہے۔ٹیلی ویژن پر مذاکرات اور مشاعرہ میں شرکتیں ہوئیں۔

انعامات : تصنیفات پر اتر پردیش اردو اکادمی،مغربی بنگال اردو اکادمی اور بہار اردو اکادمی نے سند اعزازی کے ساتھ اردو کی مجموعی خدمات پر دوسرا اور تیسرا انعام دیا۔

رکنیت اعزازی: مختلف تعلیمی،سماجی اور مذہبی اداروں میں صدر و نائب صدر اور تاعمر رکنیت دی گئی۔ پانچ ادبی و مذہبی موقر رسائل کی مجلس ادارت میں بھی شامل کیا گیا۔

فی الحال مشغلہ: پڑھنا لکھنا،خدمت خلق،جاروکشی آستانہ اور فکر عاقبت۔

اللہ بس باقی ہوس۔

○○○

’’تقاریظ‘‘ پر ایک تقریظ

پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی

حضرت طلحہ رضوی برقؔ سے میری یاد اللہ اس وقت سے ہے جب ’’شب خون‘‘ نیا نیا نکلا تھا اور اس کا باب مراسلات طرح طرح کے مباحث سے بھرا ہوتا تھا۔مراسلات کا زیادہ تر زور نئے ادب، خاص کر نئی شاعری کی مذمت کرنے یا اس کے دفاع اور وکالت میں صرف ہوتا تھا۔ برقؔ صاحب بھی کبھی کبھی ان مباحث میں بے تکلف حصہ لیا کرتے تھے۔پھر ان کی کچھ اور تحریریں، شاعری، تبصرہ اور تقریظ کے میدانوں میں بھی نظر سے گذریں۔ جناب برقؔ کو فارسی زبان وادب سے جو شغف تھا اور ہے اس کی بنا پر ہمارا رشتۂ اخوت ایک بار بندھا تو بندھا ہی رہ گیا۔وہ دن بھی تھے کہ مجھ سے اگر کوئی تقریظ کی فرمایش کرتا تو سخت اور سرد خاموشی کے سوا اسے کچھ نہ ملتا اور آج میں حضرت برقؔ کی ’’تقاریظ‘‘ پر تقریظ لکھ رہا ہوں۔اسے صبح پیری کی طباشیر کہیں یا کسی اہم لیکن پرانی روایت کی تجدید۔ یہ فیصلہ اس تحریر کے پڑھنے والوں اور خود ہمارے تقریظ نگار جناب طلحہ رضوی برقؔ پر ہے۔

کسی کتاب کے آغاز میں یعنی اصل کتاب شروع ہونے کے پہلے جو لکھا جائے اسے بیان کرنے کے لیے ہماری ادبی تہذیب میں کئی اصطلاحیں ہیں: تمہید، پیش لفظ، دیباچہ، مقدمہ،تقریظ۔ان میں تھوڑا تھوڑا فرق بھی ہے۔’’تمہید‘‘ میں خود مصنف، یا کبھی کبھی کوئی اور کتاب کے بارے میں بنیادی باتیں یا اس نقطۂ نظر کو بیان کرتا ہے جس کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ کتاب لکھی گئی

ہے۔ ''پیش لفظ'' کو زیادہ تر مصنف کے بارے میں کچھ معلومات، یا اس کتاب کے بارے میں کچھ ضروری لیکن نفسِ مضمون سے غیر متعلق معلومات درج کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً کتاب کب لکھی گئی، مصنف کے مختصر کوائف وغیرہ۔ یہ باتیں ''پیش لفظ'' میں درج کی جاتی ہیں۔ یہ دونوں تحریریں عموماً مختصر ہوتی ہیں اور ان میں مصنف کے عیوب نہیں بیان ہوتے۔ ''دیباچہ'' عموماً ایک نسبتاً طویل تحریر ہوتا ہے جس میں کتاب کے مباحث پر اصولی اور بنیادی اور تنقیدی گفتگو ہوتی ہے۔ اس طرح ''دیباچہ'' حسبِ ضرورت مصنف کے بارے میں یا کتاب کے بارے میں بحث طلب باتیں، مختصراً ہی سہی، کہنے کے لیے استعمال ہوسکتا ہے۔ یعنی ''دیباچہ'' دراصل مصنف کتاب یا کم از کم اس کتاب کے بارے میں تنقیدی مضمون کا حکم رکھتا ہے اور ظاہر ہے ایسی صورت میں ''دیباچہ'' اہم ہی کتابوں کے لیے مناسب ٹھہرایا جانا چاہیے۔ ''مقدمہ'' اور ''دیباچہ'' میں زیادہ فرق نہیں، بجز اس کے کہ ''مقدمہ'' عموماً ''دیباچہ'' سے طویل تر ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں ''مقدمۂ تاریخ ابن خلدون'' اور ''مقدمہ شعروشاعری'' اس کی مثالیں ہیں۔ ہمارے یہاں سب سے مشہور اور بصیرت افروز مباحث سے بھرا ہوا دیباچہ اپنے دیوان ''غرۃ الکمال'' پر امیر خسرو کا دیباچہ ہے۔ ''تقریظ'' کے معنی عربی میں ہیں ''کسی زندہ شخصیت کی مبالغہ آمیز تعریف کرنا''۔ ہمارے یہاں ''زندہ شخصیت'' کی شرط ہمیشہ نہیں تو اکثر قائم رکھی گئی ہے لیکن ''مبالغہ آمیز تعریف'' سے لے کر تحسینی جملوں کو ''تقریظ'' کے لیے جائز ٹھہرایا گیا ہے۔ یہ اصطلاح اسی لیے اب بہت کم استعمال ہوتی ہے کہ تقریظ نگار پر جانب داری یا بے محابا توصیف کا الزام نہ لگے۔ ''تقریظ'' کی جگہ اب ''فلیپ'' نے لے لی ہے یعنی وہ مختصر عبارت جس میں کتاب یا مصنف کی مدلل (اور کبھی کبھی غیر مدلل) مداحی کے سوا کچھ نہ ہو اور جسے کتاب کی جلد کے دونوں طرف سرورق کے مڑے ہوئے حصے میں بآسانی درج کیا جاسکے۔

مندرجہ بالا تعریفیں میں نے اپنے تجربے اور مطالعے کی روشنی میں بنائی ہیں۔ انھیں کسی لغت کی پشت پناہی حاصل نہیں ہے۔ میرے خیال میں کسی لغت یا تنقیدی مضمون میں ان اصطلاحوں کے فرق کو کھول کر بیان بھی نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن یہ تو آپ دیکھ ہی سکتے ہیں کہ مصنف

نے زیرِ نظر کتاب کا عنوان ''تقاریظ'' جو رکھا ہے تو ٹھیک ہی رکھا ہے، بجز اس بات کے کہ ان تقاریظ میں ''مبالغہ آمیز تعریف'' سے حذر کیا گیا ہے لیکن جو صفت اس کتاب کو سرسری تقاریظ کے سری مجموعے سے مختلف بناتی ہے وہ مصنف علام کی علمیت ہے۔ انھوں نے مداحی ضرور کی ہے لیکن ایسی کوئی بات نہیں کہی جس میں نری مداحی نظر آئے اور بعض تقریظیں ایسی ہیں جن پر کم و بیش مستقل مضمون یا دیباچہ کا گمان ہوتا ہے اور ایسی تحریروں میں مصنف نے اپنے علم اور معلومات دونوں کا قابلِ ستایش اظہار کیا ہے۔ مثلاً جناب سید نعیم حامد علی نے غزلیات بیدل سے ایک سیر حاصل انتخاب کیا ہے اور ان اشعار کا اردو میں ترجمہ بھی درج کیا ہے۔ ایسی کتاب پر لکھنے کے لیے وسیع اور متنوع علم کی ضرورت تھی۔ جناب برقؔ کی ''تقریظ'' دراصل ''دیباچہ'' ہے اور اس کی ہر سطر ان کی دقت نظری کا پتہ دیتی ہے۔ اسی طرح حضرت قطب الاقطاب خواجہ بختیار کاکی پر جناب غلام یحییٰ انجم کی کتاب پر طلحہ رضوی برقؔ نے صرف تحسینی نظر نہیں ڈالی، بلکہ کتاب کے کئی مسامحوں کی طرف توجہ دلائی اور بعض کی اصلاح بھی کی۔

فارسی زبان و ادب اور تصوف، پھر اس کے بعد اردو شاعری طلحہ رضوی برقؔ کی دلچسپیوں، بلکہ کارکردگیوں کے یہ میدان ہیں اور تقاریظ کے اس مجموعے میں ان تینوں میدانوں میں برقؔ صاحب کا اختصاص پوری طرح نمایاں ہے۔ میں نے قیاس کن زگلستان من بہار مرا کے مصداق ایک دو تقریظوں پر کچھ لکھ دیا۔ آپ پوری کتاب پڑھیں تو آپ کو لطف بھی حاصل ہوگا اور آپ کے علم میں اضافہ بھی ہوگا۔

○○○

پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ: ایک تعارف

پروفیسر وہاب اشرفی

ان کا تاریخی نام سید ناصر رضوی ہے۔ والد سید شاہ محمد قایم رضوی قتیل داناپوری مشہور شاعر تھے اور مسند ارشاد پر متمکن رہے تھے۔ گویا خاندانی سلسلہ پیروں کا ہے۔ طلحہ رضوی برقؔ اپنے نانیہال پھلواری شریف میں سنہ ۱۹۳۸ء میں پیدا ہوئے۔ والد تو ذی علم اور صوفی تھے ہی، والدہ محمودہ خاتون بھی شاعرہ تھیں جن کا نعتیہ مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ طلحہ صاحب کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی یعنی شاہ ٹولی داناپور میں۔ والد اور والدہ نے ان کی ابتدائی تعلیم میں گہری دلچسپی لی پھر وہ مدرسہ حنفیہ نعمانیہ، داناپور میں داخل کر دیے گئے۔ عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم تو گھر پو ہوئی اور اس طرح ہوئی کہ اس کے اثرات دوررس رہے۔

طلحہ رضوی برقؔ نے بلدیوہ ہائی اسکول، داناپور سے ۱۹۵۵ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ بی ایس کالج داناپور سے ۱۹۵۷ء میں آئی۔ اے۔ ہوئے پٹنہ یونیورسٹی سے ۱۹۶۰ء میں بی۔ اے۔ آنرس کیا اور ۱۹۶۲ء میں ایم۔ اے (اردو) ہوئے۔ اس کے بعد ۱۹۷۰ء میں 'شاہ اکبر داناپوری حیات اور شاعری' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی۔ تحقیقی مقالہ شائع ہو چکا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ۱۹۷۹ء میں ڈی۔ لٹ کی بھی ڈگری لی فارسی میں ''شعرائے فارسی بہار'' ان کا موضوع تھا۔ انھوں نے پھلواری شریف کی خانقاہوں کے سجادہ نشیں شعرا پر خصوصی توجہ دی ہے۔

برقؔ بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کا مجموعہ ''شائگاں'' ایک عرصہ پہلے شائع

ہوا تھا اور قدر شناسوں نے اس کی بے حد پذیرائی کی تھی۔ دوسرا ''شہاب سخن'' کی اشاعت ہندستان اور پاکستان دونوں جگہوں سے ہوئی۔ موصوف کو نعتیہ شاعری سے خصوصی دلچسپی رہی ہے۔ اس سلسلے میں ان کی ایک تحقیقی کتاب ''اردو کی نعتیہ شاعری'' شائع ہو چکی ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ اس موضوع پر یہ اردو کی اوّلین کتابوں میں ہے۔

طلحہ رضوی برقؔ نے ۱۹۵۳ء سے شاعری شروع کی تھی۔ تب سے اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ غزل سے خصوصی دلچسپی رہی ہے۔ رباعی گوئی میں بھی امتیاز حاصل ہے اور قطع تاریخ میں اختصاص حاصل کر چکے ہیں۔ ویسے ان کی شاعری کا عمومی مزاج کلاسیکی ہے۔ فارسی اور اردو اساتذہ کے کلام کی چھاپ ان کے یہاں دیکھی اور محسوس کی جا سکتی ہے۔ عروض و بحور پر گہری نظر ہے۔

طلحہ صاحب تنقیدی امور بھی سرانجام دیتے رہے ہیں۔ کئی تنقیدی مضامین کے مجموعے اشاعت پذیر ہو چکے ہیں جیسے ''غور و فکر''، ''نقد و سنجش'' اور ''ارزش ادب''۔ مضامین میں بھی وہ اساتذہ کی پیروی کرتے رہے ہیں۔

انھوں نے فارسی میں بھی شاعری کی ہے اور مضامین بھی لکھے ہیں۔ ایران کے بعض پرچوں میں ان کی تخلیق و تنقید شائع ہوتی رہی ہیں۔ وہاں کا سفر بھی کر چکے ہیں اور ادبی وسیلے سے پاکستان اور لندن بھی گئے۔

موصوف درس و تدریس سے وابستہ رہے، لکچرر، ریڈر اور پروفیسر بھی ہوئے، ڈین فیکلٹی آف آرٹس بھی رہے اور ویرکنور سنگھ یونیورسٹی، آرہ سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ کئی بار حج بیت اللہ کا شرف حاصل کر چکے ہیں۔

موصوف آج بھی فعال ہیں۔ دینی اور علمی کام ہنوز سرانجام دے رہے ہیں۔

(تاریخِ ادب اردو: ج سوم: ص ۱۷۲۹ تا ۱۷۳۰)

○○○

پروفیسر طلحہ رضوی برق: ایک تعارف

پروفیسر اعجاز علی ارشد

سید محمد طلحہ رضوی (تاریخی نام سید ناصر رضوی اور تخلص برق) ولد سید شاہ محمد قائم قتیل دانا پوری کی تاریخ پیدائش تعلیمی سند کے مطابق ۲۵/جنوری ۱۹۴۱ ہے۔آپ کا سلسلہ نسب حضرت امام حسینؑ تک پہنچتا ہے۔آپ نے ابتدائی دینی تعلیم والد محترم اور والدہ بی بی محمودہ خاتون کی نگرانی میں حاصل کی۔۱۹۵۵ میں بلد یوا ہائی اسکول سے میٹرک اور ۱۹۵۷ میں بی۔ ایس کالج، دانا پور سے انٹر کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۶۰ میں پٹنہ کالج، بی۔اے۔آنرز، ۱۹۶۲ میں پٹنہ یونیورسیٹی سے ایم۔اے اردو اور ۱۹۶۳ میں ایم۔اے فارسی کے امتحانات میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔۱۹۷۰ میں اسی یونیورسیٹی سے ''شاہ اکبر دانا پوری حیات وخدمات'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی لکھا اور ۱۹۷۹ میں ڈی۔لٹ (فارسی) کیا۔ ۱۹۷۷ میں جواہر لال نہرو یونیورسیٹی، دہلی سے سی۔او۔پی (فارسی) کی ڈگری حاصل کی اور ۱۹۹۶ میں جدید فارسی زبان وادب کی تعلیم وتربیت کے سلسلے میں ایران بھی گئے۔مارچ ۱۹۶۳ میں نالندہ کے موضع مہونی کے مولوی منظور احسن صدیقی کی صاحبزادی بی بی زیب النساء سے شادی ہوئی اور ۱۹۷۰ میں پہلی بار حج کی سعادت حاصل کی۔ اس کے بعد ۲۰۰۲، ۲۰۰۴ اور ۲۰۰۸ میں بھی حج کے لیے تشریف لے گئے۔۲۰۰۳ میں اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔اولادوں میں چار بھائی سید شاہ بلال رضوی، شاہ سلمان رضوی، شاہ جنید رضوی اور ابوذر سعد رضوی نیز چار بہنیں خوش حال اور سرگرم کار ہیں۔آپ پہلی بار ۱۹۶۳ میں مقابلے کا امتحان پاس کر کے مرکزی حکومت کے ڈیفنس اکاؤنٹس میں ملازم ہوئے مگر چند ہی ماہ کے بعد نوادہ کالج

، نوادہ میں تقرر ہو گیا۔ وہاں بھی زیادہ دن تک نہیں رہے اور بہار پبلک سروس کمیشن سے منتخب ہو کر ستمبر ۱۹۶۳ سے ایچ۔ڈی۔جین کالج، آرہ (مگدھ یونیورسیٹی) میں اردو وفارسی کے لکچرر ہوئے۔ترقی کرتے ہوئے پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو کے عہدے تک پہنچ کر ۱۳/جنوری ۲۰۰۱ کو ویر کنور سنگھ یونیورسیٹی سے رٹائر ہوئے۔والد محترم سید شاہ قتیل دانا پوری کی وفات کے بعد ۱۹۸۵ میں آستانہ عالیہ چشتیہ نظامیہ دانا پور کے سجادہ نشیں ہوئے اور اب تک اس منصب پر فائز ہیں۔اس کے علاوہ حکومت ہند کی ایک اسکیم کے تحت دہلی یونیورسیٹی میں درس وتدریس سے وابستہ ہیں۔

طلحہ رضوی برق نے جس ماحول میں شعور کی آنکھیں کھولی وہ ادبی ذوق پیدا کرنے کے لیے کافی تھا۔انھوں نے ۵۳۔۱۹۵۲ سے ہی شعر گوئی کا آغاز کر دیا اور والد محترم سے اصلاح لینے لگے۔چند ہی برسوں میں ان کا کلام کئی اہم رسالوں میں مسلسل شائع ہونے لگا۔کالج کی طالب علمی کے زمانے میں انھوں نے نثر نگاری کی طرف بھی توجہ کی اور ان کے چند علمی وادبی مضامین ''نگار'' لکھنؤ اور ''نوائے ادب'' بمبئی جیسے رسالوں میں منظر عام پر آئے۔ان کی مختلف کتابوں پر اب تک اتر پردیش، بہار اور بنگال کی اردو اکادمیوں سے انعام مل چکا ہے۔علمی وادبی کانفرنسوں میں شرکت کے لیے ۲۰۰۴ میں لندن اور ۲۰۰۵ میں پاکستان بھی جا چکے ہیں۔اردو اور فارسی ادب پر ہونے والے متعدد قومی اور بین الاقوامی سیمناروں اور کانفرنسوں میں آپ نے مقالے پڑھے ہیں یا صدارت کی ہے۔اب تک آپ کی درج ذیل کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں:

۱۔ اردو کی نعتیہ شاعری (جنوری ۱۹۷۴)

۲۔(۲) غور فکر (تنقیدی مضامین) ۱۹۷۶ء

(۳) نقد سنجش (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) ۱۹۸۲ء

(۴) شاہ اکبر دانا پوری (تحقیق) ۱۹۸۵ء

(۵) ارزشِ ادب (تنقیدی مضامین) ۱۹۹۵ء

(۶) شایگاں (مجموعۂ کلام) ۱۹۸۹ء

(۷) شہابِ سخن (رباعیات) ۱۹۹۶ء۔ اس کتاب کا ایک اڈیشن پاکستان سے بھی شائع ہوا۔

(۸) Mysticiam in our poetry ۱۹۸۴ء

(۹) قطعۂ تاریخ (فارسی) ۲۰۰۷ء

(۱۰) اربعین (نعتیہ مجموعہ) ۲۰۰۸ء

(۱۱) سہرے ہی سہرے ۲۰۰۸ء

(۱۲) عشرہ مبصرہ ۲۰۰۹ء۔

ان کی مرتب کردہ کتابیں درج ذیل ہیں:

(۱) گلستانِ سخنِ محمودہ (مجموعہ نعت) ۱۹۵۶ء

(۲) تجلیاتِ قتیلؔ (دیوان اردو) ۱۹۶۵ء

(۳) خورشیدِ سحر (دیوان فارسی) ۱۹۶۸ء

(۴) ضیاء العروس از حضرت قتیلؔ ۱۹۸۶ء

ان کے علاوہ درج ذیل کاموں کے تشنۂ طباعت رہنے کی اطلاع ہے:

(۱) تذکرہ شعرائے داناپور

(۲) عرفائے سخن سرائے بہار (فارسی)

(۳) آئینۂ تصوف

(۴) اذکارِ جمیل بہ تذکارِ قتیلؔ

(۵) قاموس تاریخ گوئی

(۶) منتشرات (نظموں کا مجموعہ)

(۷) افصح التواریخ (اردو و فارسی)۔

طلحہ رضوی برق ہندو پاک کے علمی حلقوں میں شاعر اور تنقید نگار دونوں ہی حیثیتوں سے

خاصے معروف و مقبول ہیں۔ نعت پاک اور قطعہ تاریخ لکھنے میں انھیں انفرادیت اور ملک گیر شہرت حاصل ہے۔ غزلوں میں فارسی اور اردو کی کلاسیکی شاعری کے اثرات نمایاں طور پہ محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ ''اردو نعتیہ شاعری'' کے نام لکھی گئی ان کی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ابتدائی چند کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ جہاں تک ان کے تنقیدی مضامین کا تعلق ہے، میں نے نقد و سخن پر تبصرہ کرتے ہوئے (رسالہ آج کل، دہلی جون ۱۹۸۶) لکھا تھا:

''اس کتاب کے بیشتر مقالے ایک مشرقی تناظر رکھتے ہیں اور تحقیق و تنقید کا اچھا معیار پیش کرتے ہیں......انداز بیان بڑا دل کش اور بلیغ ہے''۔

میں ان کی تنقید نگاری کے بارے میں اب بھی اس رائے پر قائم ہوں۔ برق کا نمونۂ کلام درج ذیل ہے:

حمد کے اشعار۔

قوس قزح کے رنگ میں تو
پیکر شوخ و شنگ میں تو
انت الہادی ، انت الحق
امن و صلح و جنگ میں تو
لیس الہادی الّا اللہ
ہر ممکن فرہنگ میں تو
لا مقصود الّا اللہ
جینے کے ہر ڈھنگ میں تو

نعت کے اشعار۔

کب ان کی یاد میں نقشِ حجاب اٹھ جائے
نگاہ شوق کو اشکوں سے باوضو رکھنا

دیار قدس میں ہرجا ہیں نقش پائے حضورؐ
جبینِ شوق کو سجدے میں کو بہ کو رکھنا
حسین منّی انا من حسین کے غم میں
جو حق شناس ہو دل کو لہولہو رکھنا

غزل کے اشعار۔

اشک جب قطرۂ خوں ہو تو غزل ہوتی ہے
ضبطِ غم حد سے فزوں ہو تو غزل ہوتی ہے
عشق کی آگ میں جل جائے متاعِ ہستی
برق کہتا ہے کہ یوں ہو تو غزل ہوتی ہے

○○○

پروفیسر ڈاکٹر سید شاہ طلحہ رضوی برقؔ

محمد شکیل استھانوی

اردو کے مشہور و معروف صاحب طرز ادیب و شاعر، مصنف و مؤلف، محقق و مبصر، انشاء پرداز و نقاد اور مقالہ نگار و تاریخ گو پروفیسر ڈاکٹر حضرت سید شاہ طلحہ رضوی برقؔ کے نام کی واقفیت صرف برصغیر ہی نہیں رکھتا بلکہ اس نام کو عالمگیر شہرت و مقبولیت حاصل ہے۔ اردو و فارسی زبان و ادب کی بے ریا شناوری کرنے والوں میں آپ کا شمار انگلی پر گنے جانے والے چند ادیبوں و شاعروں میں سے ایک ہے۔ آپ اردو و فارسی کے فی البدیہہ اور برجستہ شاعر ہیں۔ تاریخ گوئی میں آپ کو مہارت تامہ حاصل ہے اور قطعۂ تاریخ لکھنے والے معدودے چند شعرا میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ قطعۂ تاریخ جتنی عمدہ آپ اردو زبان میں کہتے ہیں، اتنی ہی خوبصورت فارسی زبان میں بھی تحریر کرتے ہیں۔ آپ کو اردو و فارسی نظم و نثر میں یدِ طولیٰ حاصل ہے۔ آپ کو شعری و ادبی ذوق وراثت میں ملا ہے اور آپ اپنے وقت کے نابغہ روزگار شاعروں اور ادیبوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ آپ کی تحقیق و تنقید کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے۔ آپ کی شخصیت اور آپ کی نگارشات اردو و فارسی زبان و ادب میں صدر شک تو ہیں ہی ساتھ ہی سرمایۂ افتخار بھی ہیں۔

حضرت برقؔ کے والد بزرگوار افتخار الواعظین، عمدۃ المشائخین حضرت علامہ سید شاہ محمد قائم رضوی چشتی نظامی قتیلؔ داناپوری علیہ الرحمہ کا بھی اپنے وقت کے عظیم شاعروں اور صوفیوں میں شمار ہوتا تھا۔ ان کی تین شادیاں ہوئیں۔ پہلی شادی حکیم میر حسن علی زمیندار آرہ کی صاحبزادی سے ہوئی جن کا انتقال چھ سال کے بعد ہوا اور ان کے بطن سے تولد ہونے والے بچے کا ایامِ طفلی

میں ہی انتقال ہو گیا۔ آپ کے والد بزرگوار کی دوسری شادی جموانوں پیر بگہہ شریف کے رئیس میر افاضت حسین کی دختر نیک اختر سے ہوئی، وہ بھی دو تین سال کے بعد داغ مفارقت دے گئیں۔ بعد ازاں حضرت برق کے والد کی تیسری شادی پھلواری شریف میں حضرت بی بی محمودہ خاتون بنت سید شاہ محی الدین مجیبی سے ہوئی۔ حضرت بی بی محمودہ خاتون کی بطن سے سات بیٹے اور دو بیٹیاں تولد ہوئیں۔ ان میں حضرت طلحہ رضوی برق و سید شاہ نظام الدین رضوی کے علاوہ دو بہنیں عامرہ خاتون اور بشریٰ خاتون حیات ہیں۔ بقیہ صغر سنی میں ہی اللہ کے پیارے ہو گئے۔

حضرت برق کی والدہ محترمہ حضرت بی بی محمودہ خاتون مجیبی پھلواروی رحمۃ اللہ علیہا بھی اپنے وقت کی یگانہ روزگار شاعرہ کے ساتھ ساتھ ولیہ بھی تھیں۔ انھیں بھی شعر و سخن کا عمدہ ذوق ورثے میں ملا تھا۔ حضرت برق کو صرف والد محترم سے ہی شعر و سخن میں شرف تلمذ حاصل نہیں رہا بلکہ ان کی والدہ محترمہ نے بھی انھیں بچپن ہی میں عروضی نکات سے واقفیت کرادی تھیں۔ جب ہوش سنبھالا تو والد بزرگوار نے اپنی انگلیوں کے سہارے تصوف و سلوک اور شعر و سخن کی منزلیں طے کرائیں اور بچپن میں والدہ محترمہ نے انھیں لوریوں کی شکل میں اپنی گنگناتی ہوئی آواز میں نعتیہ کلام ہی سنایا ہوگا۔ حضرت برق کی ولادت جمادی الاول ۱۳۵۷ھ مطابق جنوری ۱۹۴۱ء میں پھلواری شریف کے محلہ باؤلی میں واقع نانیہالی مکان میں ہوئی۔ آپ کا تاریخی نام ناصر رضوی ہے جس سے ۱۳۵۷ھ برآمد ہوتا ہے۔ لیکن خانقاہ فریدیہ کے سجادہ نشیں حضرت سید شاہ نعمت اللہ قادری پھلواری نے رسم ''چھٹی'' کے شب قلم و شمشیر پکڑوانے کی رسم کی ادائیگی کے وقت فرمایا کہ ''زبیر کے بھانجے کو طلحہ ہونا چاہیے'' اس کے بعد سے ہی آپ ناصر رضوی کے بجائے طلحہ رضوی ہو گئے اور اسکول میں آپ کا نام سید طلحہ رضوی لکھوایا گیا۔

حضرت برق کی پرورش و پرداخت خالص علمی، دینی، خانقاہی اور صوفیانہ ماحول میں ہوئی۔ آپ نے والدہ محترمہ سے ناظرہ قرآن شریف کے علاوہ فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور والد بزرگوار سے عربی کی ابتدائی کتابوں کے ساتھ ''گلستاں''، ''بوستاں''، مامقیما''، ''کریمائے سعدی'' اور ''پند نامہ عطار'' پڑھی۔ بعد ازاں والد بزرگوار نے انھیں انگریزی کی طرف مائل کیا۔

حضرت برق کے والد بزرگوار کو عربی و فارسی کی طرح انگریزی زبان پر بھی دسترس حاصل تھا۔ انھوں نے انگریزی میں اسلامیات پر چھے کتابیں تصنیف کی ہیں۔ آپ کے والد پٹنہ کمشنری آفس میں کانفنڈ یشیل سکشن کے انچارج تھے۔ انگریزی زبان میں دسترس کی وجہ کر انگریز افسر بھی ان سے متاثر تھے۔

حضرت برق کا داخلہ ۱۹۴۸ء میں انگریزی اسکول کے پانچویں کلاس میں کرایا گیا۔ بعد ازاں آپ نے میٹرک ۱۹۵۵ء میں کیا۔ اسی درمیان آپ کی والدہ محترمہ کا انتقال ۱۹۵۴ء میں ہو گیا جس کی وجہ سے آپ ملول خاطر رہنے لگے اور آپ نے میٹرک تھرڈ ڈویژن سے پاس کیا۔ مقامی بی ایس کالج سے آپ نے آئی اے ۱۹۵۷ء میں کیا اور پھر پٹنہ کالج پٹنہ سے بی اے آنرس ۱۹۶۰ء میں کیا اور ایم اے اردو ۱۹۶۲ء میں اور ایم اے فارسی ۱۹۲۳ء میں فرسٹ کلاس امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ اسی درمیان آپ نے سینٹرل گورمنٹ کے ڈیفنس اکاؤنٹس پٹنہ کے لیے ٹسٹ امتحان پاس کیا اور آپ کی بحالی اپر کلاس آڈیٹر کے عہدہ پر ہوئی۔ چند ماہ کے بعد آپ نے اس عہدہ سے استعفیٰ دے دیا چونکہ اسی درمیان آپ کی تقرری نوادہ کے کنہائی لال کالج میں اردو لکچرر کی حیثیت سے ہو گئی۔ حضرت برق اپنی تعلیمی لیاقت میں اضافے کے پیش نظر تاج الشعراء حضرت اکبر دانا پوری کی حیات و شاعری پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری ۱۹۷۰ء میں حاصل کی۔ آپ نے مشائخ شعرائے فارسی بہار پر فارسی زبان میں ایک تحقیقی مقالہ لکھا جس پر پٹنہ یونیورسٹی نے ۱۹۷۹ء میں ڈی لٹ کی ڈگری تفویض کی۔ بعد ازاں آپ نے جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے سی او پی فارسی میں ۱۹۷۷ء میں کیا اور تہران (ایران) سے سی ٹی پی سی ۱۹۹۶ء میں کیا۔ حضرت برق کی تقرری اردو فارسی لکچرر کی حیثیت سے ۷ستمبر ۱۹۶۳ء کو ایچ ڈی جین کالج آرہ میں ہوئی۔ پھر آپ صدر شعبہ بھی بنائے گئے اور اس عہدے پر ۱۳ فروری ۱۹۸۰ء تک برقرار رہے۔ آپ نے ریڈر کی حیثیت سے ۱۴ فروری ۱۹۸۰ء تک اپنی خدمات کو بخوبی انجام دیا۔ بعد ازاں آپ نے بحیثیت پروفیسر و صدر شعبہ جین کالج آرہ اور پھر ویر کنور سنگھ یونیورسٹی، آرہ میں ۴ فروری ۱۹۸۵ء سے ۳۱ جنوری ۲۰۰۱ء تک اپنے فرائض کو انجام دیا۔ بالآخر مورخہ ۲ فروری ۲۰۰۱ء

میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔اس درمیان آپ نے سینکڑوں طلبا وطالبات کے ذہن وفکر کو فارسی واردو زبان وادب سے روشناس کرایا۔آپ کی نگرانی میں فارسی میں سات اور اردو میں ۲۳اسکالرز نے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی اور ایک نے ڈی لٹ کیا۔

(۱)اردو کی نعتیہ شاعری مطبوعہ۱۹۷۴ء (۲)غور فکر (تنقیدی مضامین) ۱۹۷۶ء(۳) نقدو سنجش (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) ۱۹۸۲ء (۴) شاہ اکبر داناپوری (تحقیق) ۱۹۸۵ء (۵) ارزشِ ادب (تنقیدی مضامین) ۱۹۹۵ء (۶) شایگاں (مجموعۂ غزلیات) (۷)شہاب سخن (رباعیات)۱۹۹۶ء(۸)Mysticiam in our poetry ۱۹۸۴ء(۹)قطعۂ تاریخ (فارسی)۲۰۰۷ء(۱۰) اربعین (نعتیہ مجموعہ)۲۰۰۸ء(۱۱)سہرے ہی سہرے۲۰۰۸ء(۱۲) عشرہ مبصرہ ۲۰۰۹ء(۱۳) مناصب التواریخ ۲۰۱۲ء(۱۴)ورق ورق آئینہ۲۰۱۴ءاور (۱۵) سجادہ نشینانِ بہار منصۂ شہود پر آ چکی ہے۔

حضرت برقؔ کی سات کتابیں (۱) تذکرہ شعرائے داناپور (۲) عرفائے سخن سرائے بہار (فارسی) (۳) آئینۂ تصوف (۴) اذکار جمیل بہ تذکار قتیلؔ (۵) قاموس تاریخ گوئی (۶) منتشرات (نظمیں) اور (۷) افصح التواریخ (اردو وفارسی) تشنۂ طبع ہیں۔علاوہ ازیں آپ نے چار کتابوں کو مرتب بھی کیا جن میں (۱) گلستانِ سخنِ محمودہ (مجموعہ نعت) ۱۹۵۶ء(۲)تجلیات قتیلؔ (دیوان اردو) ۱۹۶۵ء (۳) خورشید سحر (دیوان فارسی) ۱۹۶۸ء (۴)ضیاء العروس از حضرت قتیلؔ ۱۹۸۶ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئیں جن سے فارسی واردو کے ادبا شعرا مستفید ہو رہے ہیں۔ پروفیسر برق کے تقریباً پچیس سے زائد تحقیقی وتنقیدی فارسی کے مقالات ہندو پاک اور ایران کے رسائل ومجلّات کی زینت بن چکے ہیں۔اسی طرح تقریباً ڈیڑھ سو اردو مضامین،ادبی ومذہبی مقالات ہندو پاک کے رسائل وجرائد میں اشاعت پذیر ہوئے۔نیز یہ کہ سترہ سے زائد نثری وشعری کتابوں میں آپ کی لکھی تقریظیں بھی شایع ہو چکی ہیں اور آپ نے ریاست وبیرون ریاست سے آنے والی کتابوں پر تبصرے بھی کیے ہیں۔تبصرہ نگاری کا سلسلہ آپ نے اس وقت شروع کیا جب آپ بی اے آنرز کے طالب علم تھے اور آپ کے تبصرے

ماہنامہ ''اشارہ'' پٹنہ میں باضابطگی سے شائع ہوتے تھے۔اس کے علاوہ ماہنامہ ''صبح نو'' پٹنہ، ''صنم'' پٹنہ، ماہنامہ ''ساغرنو'' پٹنہ، ''رفتارنو'' دربھنگہ، ''قافلہ'' پورنیہ، ماہنامہ ''سریر'' گیا، ماہنامہ ''کتاب'' لکھنؤ، ''نیا دور'' لکھنؤ، ''شاعر'' ممبئی، ''آج کل'' دہلی، ''ہماری زبان'' دہلی، ''مریخ'' پٹنہ، ''زبان وادب'' پٹنہ، ''الانصار'' حیدرآباد، اور ''نعت رنگ'' کراچی وغیرہ جیسے معتبر رسائل وجرائد میں بھی آپ کے تبصرے وتنقیدی مضامین باضابطگی کے ساتھ اشاعت پذیر ہوتے رہے ہیں اور محبانِ اردو سے دادِ تحسین حاصل کرتے رہے ہیں۔پروفیسر صاحب دورانِ طالب علمی سے ہی علمی وادبی تحقیقی کاموں میں لگے رہے اور اپنی علمی وادبی صلاحیتوں میں وسعت وفروغ دیتے رہے ہیں۔الفاظ کی پرکھ اور جملوں کی ساختیات پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ان کی تحریریں مقفع و مسجع ہوتی ہیں۔ ساتھ ہی ان کی تحریریں غیر جانب دار اور مبنی برحقیقت ہوتی ہیں۔آپ کے بارے میں پروفیسر عبدالقادر جعفری،صدر شعبہ عربی وفارسی،الٰہ آباد یونیورسٹی تحریر کرتے ہیں:

> ''وہ ایک ادیب انشاء پرداز نقاد اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔ان کی نظم ونثر دونوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی ادبی دلچسپیوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ان کی نگاہ دوررس اور تجربہ عمیق ہے۔تحقیق وتنقید اور تلاش وجستجو کے رموز سے باخبر ہیں شعریات کی پرکھ کی صلاحیت بھی قدرت نے بہت اچھی عطا کی ہے۔اسی لیے اپنی شاعرانہ بصیرت سے اردو وفارسی شاعری کے خزانہ میں قیمتی اضافہ کرتے رہتے ہیں۔وہ اردو وفارسی کے خاموش خدمت گذار میں سے ہیں اور نہایت خلوص کے ساتھ اردو و فارسی کی خدمت میں مصروف ہیں۔ان کی شخصیت کا خمیر سادگی خلوص اور صداقت سے تیار ہوا ہے۔ڈاکٹر برقؔ بڑے ضبط ونظم کے آدمی ہیں۔زندگی کے معمولات میں مستعد شریعت پر کار بند اور ادبی وشعری سرمایہ کے محفوظ رکھنے میں اپنی مثال آپ ہیں۔ان کے اشعار میں خیالات کا تنوع،نظر کی وسعت اور زبان میں شخصیت کی سادگی اور طہارت کا عکس نمایاں رہتا

ہے۔

(تقریظ: چہل قطعہ تاریخ)

''چہل قطعہ تاریخ'' کے تقریظ کے آخر میں پروفیسر جعفری تحریر کرتے ہیں:

''فارسی کے جس پر آشوب دور میں ہم رہ رہے ہیں اس سے محبت رکھنے والے اشخاص خال خال ہی ملتے ہیں اس لحاظ سے ڈاکٹر برق کی شخصیت اور ان کا مجموعۂ قطعات تاریخ ہر لحاظ سے ممتاز اور منفرد ہے۔ یہ مجموعہ متوازن ومتناسب بھی ہے اور فکری تطہیر کا نمونہ بھی''۔

علامہ ناوک حمزہ پوری صاحب علمی وادبی دنیا کی ایسی معتبر ومعروف شخصیت ہیں کہ جب بھی وہ کچھ تحریر کرتے ہیں یا کسی شخصیت سے تعلق سے لکھتے ہیں تو پورے اعتماد و وقار کے ساتھ تحریر کرتے ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں امانت داری و دیانت داری کو ملحوظ رکھتے ہیں اور بے جا تعریف سے پرہیز بھی کرتے ہیں۔حضرت برق کی کتاب ''چہل قطعہ تاریخ'' کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''جائے شکر وسپاس ہے کہ علم وادب، زبان وبیان کے اس دور انحطاط پذیر میں بھی ہمارے درمیان جلیل القدر علمی وادبی خانوادے کے سلسلۃ الذہب کی درخشاں کڑی پروفیسر ڈاکٹر سید شاہ طلحہ رضوی برق موجود ہیں جو اس فن لطیف کو بھی سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔آپ نے کیا اردو اور کیا فارسی ہر دو زبان میں بے شمار تاریخیں رقم کی ہیں اور مجھے کہنے دیجیے کہ فی البدیہہ، برجستہ اور حسب حال تاریخ گوئی میں میری نظر میں موصوف کا ہمسر کوئی دوسرا نہیں''۔

حضرت طلحہ رضوی برق کی تاریخ گوئی اور محاسن وخوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے علامہ ناوک حمزہ پوری صاحب مزید تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت برق کی تاریخ گوئی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی برجستگی میں بے مثال ہوتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حسب حال ہوتی

ہے۔بعض حضرات ایسے عمومی فقرے، جملے یا مصرعے سے تاریخ برآمد کر کے خوش ہو لیتے ہیں جو اس سنہ وسال میں ہر وفات پانے والے پر منطبق کیے جاسکتے ہیں۔ برق صاحب اس عمومیت سے دامن کش رہے ہیں اور آپ نے تاریخ ایسے الفاظ، فقرے یا مصرعے سے برآمد کی ہے جو صرف اسی شخص کے لیے مخصوص ہوتی ہے جس کے لیے وہ کہی گئی ہے''۔

حضرت برق نے اردو فارسی کے ایک سو سے زائد آل انڈیا سمیناروں و کانفرنسوں میں شرکت کی اور مقالے پیش کیے بلکہ آپ نے اکثر کی صدارت بھی کی۔۱۹۶۱ء سے ہی آپ کے مقالات، غزلیں اور نعتیہ کلام آل انڈیا ریڈیو پٹنہ سے بھی نشر ہوتے رہے ہیں۔ ٹیلی ویژن پر مذاکرات اور مشاعروں میں بھی آپ نے شرکت کی ہے۔ پروفیسر برق کی بیش بہا تصنیفات پر اتر پردیش اردو اکادمی، مغربی بنگال اردو اکادمی اور بہار اردو اکادمی نے سند اعزازی کے ساتھ دوسرے اور تیسرے انعام سے بھی نوازا گیا ہے۔اس کے علاوہ ۲۰۱۰ء میں صدر جمہوریہ ہند نے قومی ایوارڈ عطا کیا اور تاعمر سالانہ پچاس ہزار روپے کا سالانہ وظیفہ جاری کیا۔آپ کی علمی وادبی جلالت کے پیش نظر آپ کو مختلف تعلیمی، سماجی اور مذہبی اداروں میں صدور و نائب صدور اور تاعمر رکنیت عطا کی گئی نیز پانچ ادبی و مذہبی موقر رسائل و جرائد کی مجلس ادارت میں بھی آپ کو شامل کیا گیا۔ساتھ ہی ڈین فیکلٹی آف ہیومینیٹیز، ممبر آف سنڈیکیٹ، ممبر آف سینیٹ، ممبر آف ریسرچ کاؤنسل، ویر کنور سنگھ یونیورسٹی، آرہ۔ بہار، ممبر آف سنڈیکیٹ، مولانا مظہر الحق عربی وفارسی یونیورسٹی، پٹنہ۔اور بہار سے باہر کی اکثر یونیورسٹی میں بورڈ آف اسٹڈیز اور بورڈ آف اکزامینیشن کے ممبر بنائے گئے۔

حضرت برق نے جب آنکھیں کھولیں تو گھر میں شریعت وتصوف اور شعر وادب کا رشتہ مستحکم پایا۔ پورا گھرانہ دینی وادبی ذوق سے معمور ومنور تھا۔ جہاں شریعت وطریقت یکساں طور پر پھل پھول رہے تھے۔خانقاہی نظام، مستحکم ومنظّم طور پر رواں دواں تھا، سینکڑوں برس سے قائم خانقاہ چشتیہ نظامیہ آج بھی لوگوں کے دلوں کی تسکین کا سامان فراہم کر رہی ہے۔لوگ آتے

ہیں اور فیوص و برکات سے مستفید ہو کر جاتے ہیں۔ حضرت برق اپنے والد ماجد حضرت سید شاہ محمد قائم رضوی چشتی نظامی قتیل دانا پوری قدس سرہ سے سلسلہ عالیہ چشتیہ نظامیہ میں بیعت ہوئے اور خلافت واجازت سے سرفراز کیے گئے۔ ۱۹۸۵ء میں والد بزرگوار کے وصال کے بعد مخدوم سید شاہ محمد یسین چشتی نظامی خانقاہ آستانہ عالیہ چشتیہ نظامیہ دانا پور کی سجادگی پر جلوہ افروز ہوئے۔ آپ اپنے اس فریضے کو پیرانہ سالی کے باوجود بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں۔ پروفیسر موصوف نے چار مرتبہ حج بیت اللہ شریف و زیارت حرمین شریفین کی سعادت حاصل کی۔ (۱۹۷۰ء، ۲۰۰۲ء، ۲۰۰۴ء، اور ۲۰۰۸ء) ایران ایک ماہ کے لیے ۱۹۹۶ء میں، لندن ۲ ماہ کے لیے ۲۰۰۴ء میں اور پاکستان ایک ماہ کے لیے ۲۰۰۵ء میں تشریف لے گئے۔ پروفیسر برق صاحب کی شادی نالندہ ضلع کے مہونی کے مولوی منظور احسن صدیقی صاحب کی صاحبزادی بی بی زیب النساء سے ۱۳/ مارچ ۱۹۶۳ء میں ہوئی۔ آپ کی اہلیہ کا انتقال ۲۰۰۳ء میں ہوا۔ اللہ رب العزت نے انھیں چار بیٹے اور چار بیٹیاں عطا فرمائیں۔ آپ نے سبھوں کی شادی کردی ہے۔ اور سبھی صاحب اولاد ہیں۔ حضرت برق صاحب کا قد درمیانہ، رنگ گورا، بدن چھریرا، چہرہ نورانی و پررونق اور ریش مبارک سنت کے مطابق ہے۔ کرتا پائجامہ، شیروانی اور سر پر کلاہ چادر تر کی اور کبھی دوسری ٹوپی بھی زیب تن کیے ہوئے رہتے ہیں۔ حضرت برق ملازمت سے سبکدوشی کے بعد خانقاہی، دینی، ملی، سماجی، معاشرتی اور ادبی وشعری خدمات انجام دینے میں مصروف ہیں۔ آپ تواضع پسند، خاکسار، مہمان نواز، بااخلاق، باکردار اور انسان دوست ہیں۔ مختصر یہ کہ آپ کی شخصیت علمی وادبی اعتبار سے شب تاریک میں قندیل رہبانی کی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر میں برکت عطا فرمائے۔ آمیں۔

○○○

(قومی تنظیم، پٹنہ ۱۳ اگست ۲۰۱۶ء)

پروفیسر طلحہ رضوی برق

ڈاکٹر احمد صغیر

پروفیسر طلحہ رضوی برق پھلواری شریف میں ۱۹۳۸ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید محمد عین رضوی قتیل دانا پوری مشہور شاعر تھے اور مسند ارشاد پر متمکن رہے تھے۔ گویا خاندانی سلسلہ پیروی کا ہے۔ والد تو ذی علم اور صوفی تھے ہی، والدہ محمودہ خانم بھی شاعرہ تھیں جن کا نعتیہ مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ طلحہ رضوی برق کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی یعنی 'شاہ ٹولی' دانا پور میں۔ والد اور والدہ ان کی ابتدائی تعلیم میں گہری دل چسپی لی پھر وہ مدرسہ حنفیہ نعمانیہ، دانا پور میں داخل کر دیے گئے۔ عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم تو گھر پر ہوئی اور اس طرح ہوئی کہ اس کے اثرات دوررس رہے۔

طلحہ رضوی برق نے بلدیوہ ہائی اسکول، دانا پور سے ۱۹۵۵ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ بی۔ ایس۔ کالج دانا پور سے ۱۹۵۷ء میں آئی۔ اے ہوئے، پٹنہ یونیورسٹی سے ۱۹۶۰ء میں بی۔ اے آنرز کیا اور ۱۹۶۲ء میں ایم۔ اے (اردو) ہوئے۔ اس کے بعد ۱۹۷۰ء میں ''شاہ اکبر دانا پوری'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی۔ تحقیقی مقالہ شائع ہو چکا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ۱۹۷۹ء میں ڈی۔ لٹ کی بھی ڈگری لی فارسی میں ''شعرائے فارسی بہار'' ان کا موضوع تھا۔ انھوں نے پھلواری شریف کی خانقاہوں میں سجادہ نشیں شعرا پر خصوصی توجہ کی ہے۔

طلحہ رضوی برق بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کا مجموعہ ''شائگاں'' ایک عرصہ پہلے شائع ہوا تھا اور قدر شناسوں نے اس کی بے حد پذیرائی کی تھی۔ دوسرا ''سحاب سخن'' کی اشاعت ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہوں پر ہوئی۔ موصوف کو نعتیہ شاعری سے خصوصی

دل چسپی رہی ہے۔اس سلسلے میں ان کی ایک تحقیقی کتاب ''نعتیہ شاعری'' شائع ہوچکی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شاید اس موضوع پر یہ اردو کی اوّلین کتابوں میں ایک ہے۔

طلحہ رضوی برقؔ نے ۱۹۵۳ء سے شاعری شروع کی تھی۔تب سے اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔غزل سے خصوصی دل چسپی رہی ہے۔رباعی گوئی میں بھی امتیاز حاصل ہے اور قطعہ تاریخ میں اختصاص حاصل کرچکے ہیں۔ویسے ان کی شاعری کا عمومی مزاج کلاسیکی ہے۔فارسی اور اردو اساتذہ کے کلام کی چھاپ ان کے یہاں دیکھی اور محسوس کی جاسکتی ہے۔عروض وبحور پر گہری نظر ہے۔

طلحہ رضوی برقؔ تنقیدی امور بھی سرانجام دیتے رہے ہیں۔کئی تنقیدی مضامین کے مجموعے اشاعت پذیر ہوچکے ہیں۔ جیسے ''غوروفکر''، نقدوبخشش'' اور ''ارزش ادب''۔ مضامین میں بھی وہ اساتذہ کی پیروی کرتے رہے ہیں۔

انھوں نے فارسی میں شاعری بھی کی ہے اور مضامین بھی لکھے ہیں۔ایران کے بعض پرچوں میں ان کی تخلیق وتنقید شائع ہورہی ہیں۔ وہاں کا سفر بھی کرچکے ہیں اور ادبی وسیلے سے پاکستان اور لندن بھی گئے۔

طلحہ رضوی برقؔ جین کالج آرہ سے بحیثیتِ لکچرر اپنی ملازمت کی شروعات کی۔ ریڈر اور پروفیسر بھی ہوئے۔ ڈین فیکلٹی آف آرٹس بھی رہے اور ویرکنورسنگھ یونیورسٹی، آرہ سے سبکدوش ہوچکے ہیں۔کئی بار حج بیت اللہ کا شرف حاصل کرچکے ہیں۔

طلحہ رضوی برقؔ آج بھی فعال ہیں۔ ادبی اور علمی کام ہنوز سرانجام دے رہے ہیں۔

(بہار کی یونیورسٹیوں میں اردو زبان وادب کی توسیع وترقی میں اساتذہ کی خدمات: ص ۳۳۹ تا ۳۴۰)

○○○

طلحہ رضوی برقؔ: ایک نابغہ روزگار شخصیت

محمد منہاج الدین

ہندوستان کی سرکردہ یونیورسٹیوں میں شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی اپنی علمی اور ادبی شناخت رکھتا ہے۔یونیورسٹی کے قیام ۱۹۱۷ء سے لے کر آج تک شعبہ کے فارغین طلبہ وطالبات اور اساتذہ نے ملک اور بیرون ملک میں، قومی اور بین الاقوامی سطح پر اپنی علمی بصیرت سے شعبۂ اردو اور پٹنہ یونیورسٹی کا نام روشن کیا ہے۔شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی کے ابنائے قدیم کی فہرست طویل ہے جن سے اردو ادب کی ترقی کی تاریخ کے کئی باب روشن ہیں انھیں ابواب کے چند صفحات پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ کے کارناموں کے نور سے بھی منور ہیں۔شعبۂ اردو کے ہونہار اور متحرک طالب علم، سید طلحہ رضوی برقؔ دنیائے ادب کا درخشاں ستارہ ہیں جن کی تحریریں اردو اور فارسی ادبیات میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ کا تعلق شہر عظیم آباد (موجودہ پٹنہ شہر) کے مغرب میں آباد مردم خیز علاقہ دانا پور سے ہے۔آپ دانا پور کے علمی وادبی گھرانے میں ۲۵؍جنوری ۱۹۴۱ء کو پیدا(۱) ہوئے۔طلحہ رضوی برقؔ علاقے کے نامور صوفی بزرگ، اردو فارسی کے عظیم شاعر، علامہ قتیلؔ دانا پوریؒ(۲) کے فرزند ہیں۔آپ کی والدہ محترمہ بی بی محمودہ خاتون مجیبی پھلوارویؒ(۳) تھیں۔والدین کی شفقتوں کے سائے میں آپ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی، والد علاّمہ قتیلؔ سے عربی فارسی اور اردو کی تعلیم حاصل ہوئی۔فارسی زبان وادب سے دلچسپی والد کے فیض سے ہوئی تو درسی

کتابوں کے علاوہ گلستان، بوستان جیسی کتابیں بچپن میں ہی ختم کرلیا، والد نے ہی انگریزی بھی پڑھائی۔ دین و مذہب اور تصوف کی تعلیم کی تربیت گاہ خود آپ کے گھر ہی تھا، لہٰذا آپ کو کسی مدرسے میں جانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ ابتدائی عصری تعلیم بھی گھر پر ہی ملی جسے مزید آگے بڑھاتے ہوئے ۱۹۴۸ء میں آپ کا داخلہ علاقے کے مشہور و قدیم اسکول "بلدیوا ہائی اسکول، دانہ پور" میں کرایا گیا، اسی اسکول سے آپ نے ۱۹۵۵ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا (۴)۔ انٹر میڈیٹ کی پڑھائی کے لیے مقامی "بی۔ ایس۔ کالج، دانا پور، میں داخلہ لیا اور ۱۹۵۷ء میں انٹر میڈیٹ (آرٹس) فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا۔

انٹر میڈیٹ میں حوصلہ افزا کامیابی کے بعد آپ نے آگے کی تعلیم کے لیے پٹنہ یونیورسٹی کا رخ کیا اور ۱۹۵۷ء میں بی۔ اے۔ کے لیے پٹنہ کالج میں "نفسیات (Psychology) کو آنرس کا پرچہ بنا کر داخلہ لیا، اردو اختیاری پرچہ رکھا، اردو کے اختیاری مضمون سے آنرس کا مضمون ہونے کے واقعے کا ذکر کرتے ہوئے موصوف نے کہا ہے کہ:

> "آنرس میں نے لیا تھا سائیکولاجی (Psychology) میں ابھی میں نے ایک مہینہ کلاس کیا ہی تھا کہ اردو کلاس میں استاد محترم علامہ جمیل مظہری صاحب جو کلاس کے دوران ہی ہمیں لکھنے کو کچھ دیا کرتے تھے، ایک بار انھوں نے اسی طرح لکھنے کو دیا کہ ہر شخص لکھے "میرا پسندیدہ شاعر" تو میرؔ پر میں نے بھی مختصر وقت میں تین صفحے کا مضمون لکھ ڈالا، جسے پڑھنے کے بعد استاد محترم کو یقین ہی نہیں ہوا تو انھوں نے برجستہ کہا کہ اے میاں کیا تم یہ گھر سے لکھ کر لائے ہو میں نے جواب دیا نہیں سر میں نے ابھی آپ کے سامنے ہی یہ لکھا ہے، میرے مضمون اور منتخب اشعار سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے مجھے اردو کی طرف مائل کیا۔ یہاں تک کے ایک بار علامہ جمیل مظہری اور پروفیسر صدرالدین صاحب نے مجھے زور دے کر کہا کہ بیٹا تم اردو کے لیے پیدا ہوئے سائیکولاجی کے لئے

> نہیں اس لئے سائیکولاجی چھوڑ و اردو میں آنرس لو، تو میں نے کہا ٹھیک ہے والد صاحب سے پوچھ کر۔ والد صاحب سے پوچھا تو ان کا جواب تھا کہ اساتذہ جب تمھارے کہہ رہے ہیں تو ان کی بات مانو۔ میں نے ہاں کہا تو سارا کام اساتذہ نے ہی کرادیا مجھ سے صرف درخواست پر دستخط لیا گیا، خوش بختی تھی کہ اس وقت پرنسپل پروفیسر کلیم الدین احمد صاحب تھے، سارا کام آسانی سے ہوگیا اور میں سائیکولاجی سے اردو میں آگیا" (۵)

اس طرح آپ اردو سے وابستہ ہوئے اور ۱۹۶۰ء میں امتیازی نمبروں سے بی-اے اردو (آنرس) پاس کیا۔ ۱۹۶۰ء میں ہی ایم اے (اردو) کے لیے داخلہ لیا اور ۱۹۶۲ء میں امتیازی نمبروں سے پاس بھی کر گئے۔ چونکہ آپ کو فارسی زبان و ادب سے بھی گہری دلچسپی تھی لہٰذا فارسی سے بھی ایم اے کرنے کا ارادہ کیا اور پرائیویٹ سے یعنی آزاد طالب علم کے طور پر پٹنہ یونیورسٹی سے ہی ۱۹۶۴ء میں ایم اے (فارسی) مکمل کیا۔

بی۔اے۔ میں داخلہ لے کر پٹنہ کالج آئے تو یہاں کی قدیم ادبی انجمن "بزمِ ادب" کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے، آپ اس قدر ذہین اور متحرک طالب علم تھے کہ اساتذہ نے آپ کو بزم کا جوائنٹ سکریٹری بنا دیا، یہاں تک کہ ایم اے میں داخل ہوئے تو بلا انتخاب آپ بزم کے جنرل سکریٹری بنے۔ بزم کے عہدے دار کے طور پر آپ کا سب سے بڑا کارنامہ ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۱ء میں دو شاندار مشاعرہ کا انعقاد ہے جس میں پروفیسر احتشام حسین، جذبی، نازش پرتاب گڑھی، جمیل مظہری، اختر اورینوی وغیرہ جیسی شخصیات کی موجودگی نے مشاعرے کو زینت بخشا تھا اس کے علاوہ پروفیسر صاحب کی طالب علمی کے زمانے کی خوبصورت یادوں میں ان کی مشہور نظم "نذرِ اقبال ہاسٹل" بھی ہے۔

پروفیسر صاحب کو تلاشِ معاش کا مسئلہ درپیش نہیں آیا، ابھی ایم۔اے (فارسی) کی پڑھائی جاری ہی تھی کہ ۱۹۶۳ء میں آپ نے ڈیفینس اکاؤنٹس (Deffence Accounts) کی نوکری کا امتحان پاس کرلیا اور مرکز کی ملازمت حاصل ہوئی، بحیثیت اپر کلاس آڈیٹر (Upper

Class Auditor) پٹنہ میں ہی آپ کی تقرری ہوگئی۔ ابھی چند مہینے ہی اس ملازمت میں گزرے تھے کہ اساتذہ کی دعاء نے اپنا کام کیا اور آپ کا انتخاب ایس۔ڈی۔جین کالج، آرہ میں لکچرر کے طور پر ہوگیا، ڈیفنس کی ملازمت سے استعفیٰ دے کر ے دسمبر ۱۹۶۳ء کو ایس۔ڈی۔جین کالج، آرہ میں اردو کے لکچرر بن کر چلے آئے، آپ کی تقرری کے ساتھ ہی کالج میں مشترک اردو فارسی شعبے کا قیام عمل میں آیا تھا، لہٰذا آپ کالج کے اردو اور فارسی شعبے کے صدر کے طور پر بحال ہوئے تھے۔۴ر فروری ۱۹۸۵ء سے آپ کی خدمات یونیوسٹی منتقل ہوئیں تو آپ وہاں بھی صدر شعبہ کی حیثیت سے مقرر ہوئے، آپ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ جب تک ملازمت میں رہے شعبے کے صدر ہی رہے۔ آپ ۳۱ر جنوری ۲۰۰۱ء کو ملازمت سے بحیثیت صدر شعبہ سبکدوش ہوئے۔

ملازمت میں آنے کے بعد بھی پٹنہ یونیورسٹی سے آپ کا رشتہ قائم رہا، یہیں سے علامہ جمیل مظہری کی نگرانی میں ''شاہ اکبر داناپوری: حیات اور کارنامے'' کے موضوع پر آپ نے ۱۹۷۰ء میں پی۔ایچ۔ڈی مکمل کی۔ یہاں تک کہ پٹنہ یونیورسٹی سے ہی آپ کو ڈی۔لٹ۔ کی ڈگری بھی تفویض ہوئی، ڈی۔لٹ کے لئے آپ نے فارسی شاعری کو موضوعِ تحقیق بنا کر اپنے خانقاہی نسبت کا حق ادا کیا اور ''فارسی شعرائے بہار: مخصوصاً سجادہ نشینان دارائے خانقاہ'' کو ڈی۔لٹ کے لئے تحقیق کا موضوع بنایا۔ آپ کے ڈی۔لٹ کے مقالے کی خوب پذیرائی ہوئی، ابھی حال ہی میں (غالباً ۲۰۱۳ء) اس تحقیقی مقالے کو ''کلچرل کاؤنسل، ایران'' نے بڑے تزک و اہتمام سے شائع بھی کر دیا ہے۔

سبک دوشی کے بعد آپ ریاست کے مختلف امتحانات کے بورڈ ممبر رہے، مظہرالحق یونیورسٹی میں سنڈیکیٹ کے رکن نامزد کیے گئے، ۲۴ر فروری ۲۰۱۰ء سے دو سال کے لیے دہلی یونیورسٹی میں ویزیٹنگ پروفیسر مامور کئے گئے۔ بہار کے علاوہ اتر پردیش اور بنگال اردو اکادمی نے ادبی انعام و اکرام اور سند سے نوازا۔ ہندوستان میں فارسی ادب کی ترقی اور فروغ کے لیے صدر جمہوریۂ ہند کا ''فارسی کے نامور اسکالر An eminent Scholar in Persian

کا اعزاز ملا، ۱۵ر اگست ۲۰۱۰ء کو موجودہ صدر جمہوریۂ ہند محترمہ پرتبھا دیوی پاٹل کے دست مبارک سے دہلی میں آپ کو اس انعام سے نوازا گیا جس میں سند اور میڈل کے علاوہ آپ کو تاحیات پچاس ہزار روپے سالانہ وظیفہ بھی جاری کیا گیا۔

پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ کی ادبی سرگرمی ملک کے باہر بھی رہی ہے جس میں ایران، پاکستان اور برطانیہ کا سفر اہم ہے، آپ کا سب سے پہلا ادبی سفر ایران کا تھا ۱۹۹۶ء میں ایک ماہ کے سفر پر ایران گئے جہاں فارسی شعر و ادب کی باریکیوں کو سمجھا اور سیکھا، تہران یونیورسٹی میں کلاسیں کیں اور کلاسیں لی بھی، مختلف ادبی سرگرمیوں میں شامل ہوئے۔ ایران کے بعد آپ ۲۰۰۴ میں دو ماہ کے لیے پاکستان گئے۔ اس کے بعد دوبارہ 2005 اور 2012 میں لندن کا بھی سفر کیا۔

جہاں تک پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ کے ادبی کارناموں کا تعلق ہے انہیں ادبی ذوق وراثت میں ملا، والد خود ایک باکمال شاعر تھے اور والدہ بھی اچھی شاعری کیا کرتی تھیں جو شاعری کے تمام رموز کا علم بھی رکھتی تھیں بقول شکیل استھانوی

> ''حضرت برق کو صرف والد محترم سے ہی شعر و سخن میں شرف تلمذ حاصل نہیں رہا بلکہ ان کی والدہ محترمہ نے بھی انہیں بچپن میں ہی عروضی نکات سے واقفیت کرادی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے جب ہوش سنبھالا تو والد بزرگوار نے اپنی انگلیوں کے سہارے تصوف و سلوک اور شعر و سخن کی منزلیں طے کرائیں'' (۶)

گویا والد بزرگوار کی صحبت اور والدہ محترمہ کی تربیت کے فیض سے پروفیسر طلحہ رضوی برق کو اردو فارسی شعر و ادب میں انفرادی شناخت حاصل ہوئی، اور آج ان کا نام برصغیر ہند و پاک سے لے کر ایران تک شعر و ادب کے آسمان پر درخشاں ستارے کی مانند روشن ہے، بلکہ آپ نے اپنے کارناموں سے پٹنہ یونیورسٹی کا نام بھی روشن کیا ہے۔

یوں تو پروفیسر طلحہ رضوی برق کے خون میں ہی شاعری تھی، ماں کی لوریوں کے کلام

نے جہاں شعر گوئی سے شغف پیدا کیا وہیں والد کی صحبت میں شاعری کے نکات واضح ہوئے ہوں گے جسے اپنے ہی خانقاہ کے ماہانہ مشاعروں نے پروان چڑھایا محض تیرہ سال کی عمر میں شاعری کا آغاز کرنے والے طلحہ رضوی برق کے کلام اخبار اور رسائل میں مسلسل چھپتے رہے اور مشاعروں کی رونق بڑھاتے رہے ہیں۔ آپ نے حمد و نعت منقبت، رباعیات و قطعات، نظم اور سہرے بھی لکھے ہیں مگر آپ کے مجموعہ کلام میں غزل کو اولیت حاصل ہے۔ شاعری کی پہلی کتاب مجموعہ غزل ''شائگاں'' ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی اس کے بعد ۱۹۹۶ء میں رباعیات کا مجموعہ ''شہابِ سخن'' منظر عام پر آیا۔ فیسر طلحہ رضوی برق کو قطعۂ تاریخ لکھنے میں مہارت حاصل ہے، اردو اور فارسی دونوں زبان میں آپ نے بے شمار تاریخیں رقم کی ہیں۔ ان کے قطعات تاریخ عموماً فقرے اور جملے یا مصر سے برآمد کیے ہوئے تاریخ نہیں ہوتے بلکہ نہایت موزوں اور لطیف مصرعے کی صورت میں برجستہ اور حسب حال ہوتے ہیں، حضرت برق کے لکھے ہوئے فارسی قطعات تاریخ ۲۰۰۷ء میں ''قطعات تاریخ (فارسی)'' کے نام سے اور اردو قطعات تاریخ ''مقدم التواریخ'' کے نام سے شائع ہو کر داد و تحسین بٹور چکے ہیں۔

نعتیہ شاعری میں بھی آپ کو شرف کمال حاصل ہے۔ اب تک آپ کے حمد و نعت و منقبت کے دو مجموعے ''اربعین (نعتیہ مجموعہ)'' مطبوعہ ۲۰۰۸ء اور ''امبر سارا (مجموعہ حمد و نعت و منقبت) مطبوعہ ۲۰۱۸ء منظر عام پر آچکے ہیں آپ نے دوست واحباب اور رشتہ داروں کے یہاں نکاح کے موقع پر سہرے بھی خوب لکھے ہیں، انھیں لکھے اور پڑھے گئے سہروں کو جمع کر کے ۲۰۰۸ء میں ''سہرے ہی سہرے'' کے نام سے شائع کروایا۔ پروفیسر طلحہ رضوی برق نے اردو کی اہم صنف شاعری نظم سے بھی رشتہ استوار رکھا ہے اور نظمیں لکھی ہیں۔ مجموعی طور پر پروفیسر طلحہ رضوی برق کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو نمایاں طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ پروفیسر طلحہ رضوی برق کی شاعری میں نفیس کلاسیکی لہجہ اور لفظوں اور مصروں کی سجاوٹ ملتی ہے۔ انھوں نے اردو شاعری کی خوبصورت روایت کی توسیع کی ہے۔ وہ غزل کے صحیح مزاج داں ہیں، زبان و بیان پر انھیں خاصی قدرت ہے، ان کی شاعری اس امر کی دلیل ہے کہ نئی جذباتی تحریروں اور عصری شعور کا پرانے

لباس فن میں بھی بھرپور اظہار ممکن ہے۔ دوسری طرف ان کی آزاد اور اشاریت کی حامل نظمیں جدید شعری طرزِ اظہار پر ان کی قدرت اور مہارت کی نمائندہ ہیں، ان کے غیر مشروط ذہن نے ان کے کلام کی دلکشی اور زندگی کے کئی پہلو پیدا کر دیے ہیں۔ ان کی کشت سخن کی آبیاری میں ان کے مذہبی شعور کے سرچشمے کا بڑا حصہ ہے۔ مذہبی تلمیحات کو انھوں نے اپنے کلام میں نئی معنویت دی ہے۔'' (۷)

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ آپ کو علم نفسیات سے دلچسپی تھی، اسی دلچسپی کی وجہ کر آپ نے بی۔ اے۔ میں نفسیات کو آنرس کا موضوع بنایا تھا۔ چونکہ علمِ نفسیات ان کے انٹرمیڈیٹ کا بھی ایک پرچہ تھا، اس لئے ان کا سب سے پہلا مضمون جو زیورِ طبع سے آراستہ ہوا ایک نفسیاتی مضمون تھا، انٹرمیڈیٹ کے زمانے میں ہی ۱۹۵۶ء میں '' توجہ'' کے عنوان سے آپ کا پہلا مضمون بی۔ ایس۔ کالج، داناپور کے ترجمان میں شائع ہوا۔ پروفیسر طلحہ رضوی برق کی پہلی کتاب ''اردو کی نعتیہ شاعری'' ۱۹۷۴ء میں منظر عام پر آئی، ایک سو صفحات کی یہ کتاب اردو میں نعتیہ شاعری کی روایت کو عہد بہ عہد مختلف اہم شعراء اور ان کے نعتیہ کلام کے حوالے سے پیش کرتی ہے۔ ۱۹۷۶ء میں آپ کے تنقیدی و تحقیقی مضامین کا پہلا مجموعہ '' غور و فکر'' شائع ہوا، ۱۹۸۲ء میں دوسرا مجموعہ مضامین ''نقد و سنجش'' زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر مقبول خاص و عام ہوا، تنقیدی مضامین کا تیسرا مجموعہ ''ارزش ادب'' ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا، 2014 میں بے حد اہم اور معلومات افزا مضامین کا مجموعہ ''ورق ورق آئینہ'' آیا۔ ابھی حال ہی میں آپ کے تنقیدی و تحقیقی مضامین کا پانچواں مجموعہ '' لمعاتِ سرمدی'' کے نام سے آپ کے پوتے سید محمد علی رضوی نے ترتیب دی ہے۔ اس طرح پروفیسر طلحہ رضوی برق کے ادبی سرمایے میں بڑا حصہ ان مضامین کا ہے جو متواتر ہند و پاک اور ایران کے موقر رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ بیشتر مضامین مذکورہ پانچ کتابوں میں شامل کر لیے گئے ہیں اور کچھ ابھی بھی بکھرے پڑے ہیں جنھیں یکجا کیا جائے تو اردو اور فارسی ادب کے سرمائے کا اہم حصہ ثابت ہوں گے۔ تقریبا (25) تحقیقی و تنقیدی نوعیت کے فارسی مضامین فارسی زبان میں ہند و پاک و ایران کے رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اردو فارسی زبان

کے علاوہ آپ نے ایک کتابچہ انگریزی زبان میں بھی تحریر کیا ہے، اردو شاعری اور تصوف کے حوالے سے ایک اہم مضمون کو موضوع بنا کر لکھی گئی کتاب Mysticism in Our poetry ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی۔

پروفیسر طلحہ رضوی برق کے علمی اور ادبی کارناموں میں ان کے تحقیقی کام کو بھی نمایاں مقام حاصل ہے۔ آپ کی پی۔ ایچ۔ ڈی تحقیق کا مقالہ ''شاہ اکبر داناپوری: حیات اور کارنامے'' کے عنوان سے ۱۹۸۵ میں شائع ہوا۔ اور ڈیلیٹ کی تحقیق ''فارسی شعرائے بہار: مخصوصا سجادہ نشینان ادارہ خانقاہ'' کے عنوان سے ۲۰۱۳ء میں ایران سے شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔

پروفیسر طلحہ رضوی برق ملک اور بیرون ملک میں یکساں طور سے اردو و فارسی کے معروف اور مقبول اسکالر رہے ہیں۔ آپ نے ادبا، شعرا، محققین اور نقاد کی کتابوں کے لیے تقریظیں بھی لکھی ہیں۔ آپ کی علمی نیازمندوں اور قدردانوں کی فرمائش پر ان کی کتابوں کے لیے لکھے گئے ایسے کل اکہتر تعارفی تحریروں ''تقریظ'' کو جمع کر ۲۰۱۱ء میں ''تقاریظ'' کے نام سے آپ کے فرزند عزیز سید جنید رضوی نے کتابی شکل دیا ہے۔ تقریظ کے علاوہ آپ کے تبصروں کا بھی ایک مجموعہ ۲۰۰۹ء میں ''عشرۂ مبصرہ'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ''کشائش نامہ'' مطبوعہ ۲۰۱۱ء اور ''مناصب التواریخ'' مطبوعہ ۲۰۱۲ء بھی پروفیسر طلحہ رضوی برق کی اہم تصانیف ہیں۔ موصوف کے کچھ علمی اور ادبی نیز تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی سرمائے تشنۂ طبع ہیں جن میں ''تذکرۂ شعرائے داناپور''، ''عرفائے سخن سرائے بہار (فارسی)''، ''آئینۂ تصوف''، ''اذکار جمیل بتذکار قتیلؔ''، ''قاموس تاریخ گوئی'' اور نظموں کا مجموعہ ''منتشرات'' شامل ہیں۔

پروفیسر طلحہ رضوی برق نے اپنے والد کے چار اہم ادبی سرمایے کو ترتیب دے کر اردو فارسی ادب کی تاریخ میں انھیں زندہ جاوید کر دیا ہے۔ ''گلستان سخن محمودہ (مجموعہ نعت)'' مطبوعہ ۱۹۵۶ء ''تجلیات قتیلؔ'' (دیوان اردو) مطبوعہ ۱۹۶۵ء ''خورشید سحر'' (دیوان فارسی) مطبوعہ ۱۹۶۸ء اور ''ضیاء العروض'' از حضرت قتیلؔ'' مطبوعہ ۱۹۸۶ء وہ چار کتابیں۔

پروفیسر طلحہ رضوی برق اردو کے پروفیسر، اردو فارسی کے مستند ادیب اور اسکالر کی

حیثیت سے ملک اور بیرون ملک میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ اپنے علمی اور ادبی کارناموں کے لیے موصوف نہ صرف اردو بلکہ فارسی زبان و ادب کی روایت میں بھی نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ تقریباً چھے دہائیوں پر محیط آپ کے علمی و ادبی سفر کا جائزہ لیا جائے تو پروفیسر عبدالقادر جعفری صدر شعبہ عربی و فارسی، الہ آباد یونیورسٹی، کی باتیں حرف بحرف صحیح معلوم ہوتی ہیں کہ:

> ''وہ ایک ادیب، انشاپرداز، نقاد اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ان کی نظم و نثر دونوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی ادبی دلچسپیوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان کی نگاہ دوررس اور تجربہ عمیق ہے۔ تحقیق و تنقید اور تلاش و جستجو کے رموز سے باخبر ہیں۔ شعریات کی پرکھ کی صلاحیت بھی قدرت نے اچھی عطا کی ہے، اس لیے اپنی شاعرانہ بصیرت سے اردو فارسی شاعری کے خزانہ میں قیمتی اضافہ کرتے رہے ہیں۔ وہ اردو و فارسی کے خاموش خدمت گزاروں میں سے ہیں اور نہایت خلوص کے ساتھ اردو فارسی کی خدمت میں مصروف ہیں''(۸)

سرزمین داناپور اور اپنی مادر علمی پٹنہ یونیورسٹی کا نام روشن کرنے والے پروفیسر طلحہ رضوی برق کی شخصیت اور علمی و ادبی سفر اب دنیائے ادب کے لئے محتاج تعارف نہیں ہے۔

حواشی:

(۱) طلحہ رضوی برق کی تاریخ پیدائش کے تعلق سے خود انھیں شمسی تاریخ یاد نہیں مگر والد کی ڈائری کے حوالے سے قمری ماہ جمادی الاول ۱۳۵۷ھ کی پیدائش بتاتے ہیں جس اعتبار سے آپ کی شمسی تاریخِ پیدائش جولائی ۱۹۳۸ء ہوئی اور میٹرک کی سند کے اعتبار سے آپ کی تاریخ پیدائش ۲۵؍جنوری ۱۹۴۱ء ہے۔

(۲) صاحب دیوان شاعر اور خانقاہ چشتیہ نظامیہ، داناپور کے سجادہ نشیں تھے، اسی منصب پر فی الوقت پروفیسر طلحہ رضوی برق فائز ہیں۔ علامہ قتیلؔ عربی، فارسی اور اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان پر بھی قدرت رکھتے تھے، اسلامیات کے موضوع پر علامہ کی چھے کتابیں

موجود ہیں۔علاوہ سرکاری ملازمت میں پٹنہ کمشنری آفس میں Confidential Section کے ذمے دار عہدے پر تھے۔

(۳) محترمہ خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کے سجادہ نشیں کی دختر تھیں، صوم وصلوۃ کی پابند ولیہ صفت خاتون تھیں۔شعر وشاعری کا اعلا ذوق رکھتی تھیں اور شاعری بھی کرتی تھیں۔

(۴) میٹرک کے امتحان سے پہلے (۱۹۵۴ء میں) والدہ محترمہ داغ مفارقت دے گئیں جس کی وجہ سے آپ کی پڑھائی بہت متاثر ہوئی اور میٹرک میں آپ وہ امتیاز نہ حاصل کر سکے جو آپ کی ذہانت کا حصہ تھا، آپ نے میٹرک تھرڈ ڈیویژن سے پاس کیا تھا۔

(۵) طلحہ صاحب سے راقم السطور کی ذاتی گفتگو کا حصہ۔

(۶) ''نقوش حیات'': از شکیل استھانوی: م۔۲۰۱۷ء ص۔۴۱۔

(۷) ''سنگ میل''، ۱۹۷۱ء، انٹلکچوئل فورم، آرہ، مرتبہ۔صبا اکرم اور فیروز، ص ۷۔

(۸) تقریظ، از پروفیسر عبدالقادر جعفری: قطعہ تاریخ (فارسی) م۔۲۰۰۷۔

○○○

سید شاہ محمد طلحہ رضوی برقؔ داناپوری

ڈاکٹر محمد صدر عالم صدیقی

غزل کو برقؔ نئی حیثیت ملے تو کہو
قلم کی نوک لہو میں ڈبو رہے ہیں لوگ

پروفیسر ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ کا شمار مشاہیر شعراء میں ہوتا ہے۔خلاق دوعالم نے انھیں بے پناہ خوبیوں سے نوازا ہے۔آپ کی ولادت باسعادت جمادی الثانی ۱۳۵۷ھ میں اپنے نانیہال پھلواری شریف میں ہوئی۔آپ مشہور صوفی وشاعر حضرت سید شاہ محمد قائم قتیل داناپوری کے فرزند ارجمند ہیں۔آپ کے والد محترم نے تاریخی نام سید ناصر رضوی رکھا۔پیدائش کی چھٹی شب معمول کے مطابق خاندانی تبرکات کے ساتھ قلم چھلوانے کی رسم ادا کرتے ہوئے حضرت محی الملت والدین قادری سجادہ نشیں خانقاہ مجیبیہ (پھلواری شریف) نے جناب شاہ قائم سے فرمایا یہ بچہ میرے زبیر کا بھانجا ہے اس کا نام طلحہ ہونا چاہیے اور اس وقت سے یہ بجائے سید ناصر رضوی کے سید طلحہ رضوی ہوگئے۔آپ کی پرورش وپرداخت محلّہ شاہ ٹولی داناپور کے خانقاہی ماحول میں ہوئی۔ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد اور چھوٹے چچا سید شاہ سراج الدین رضوی چشتی نظامی کے ذریعہ ہوئی۔دینی اور مذہبی تعلیمات میں خود ان کی والدہ ماجدہ بی بی محمودہ خاتون قادری مجیبی پھولواروی نے بڑی محنت فرمائی۔مقامی بلدیوا ہائی اسکول داناپور سے ۱۹۵۵ء میں میٹرک پاس کیا بی ایس کالج داناپور سے آرٹس میں انٹر پاس کیا اور پھر پٹنہ کالج وپٹنہ یونیورسٹی سے بالترتیب اردو آنرس اردو وایم اے اردو فارسی (ایم اے) کے امتحانات نمایاں طور پر پاس کئے۔پٹنہ یونیورسٹی سے ہی ۱۹۷۰ء میں پی ایچ ڈی اور ۱۹۷۹ء میں فارسی میں ڈی لٹ کی اعلیٰ سندیں حاصل کیں۔

۱۹۶۳ء میں مقابلے کا امتحان پاس کر کے مرکزی حکومت کے ڈیفنس اکاؤنٹس میں ملازم ہوئے مگر چند ماہ کے اندر ہی ان کی تقرری نوادہ کالج نوادہ (بہار) میں بحیثیت لکچرر اردو ہوگئی مگر تین ہی مہینے کے اندر بہار پبلک سروس کمیشن سے منتخب ہوکر آپ بحیثیت لکچرر اردو فارسی ایچ ڈی جین کالج، آرہ (بھوجپور) میں فائز ہوئے۔ دسمبر ۱۹۶۳ء سے بحیثیت صدر شعبہ ۱۹۹۷ء تک وہیں رہے درمیان میں محض اٹھارہ مہینوں کے لیے ۱۹۸۵ء میں وائس چانسلر مگدھ یونیورسٹی نے انھیں اے این کالج، پٹنہ میں اردو کا پوسٹ گریجویٹ شعبہ چلانے کے لیے پٹنہ بھیجا تھا۔ اپنے حسن کارکردگی سے اس شعبہ کو مضبوط کر کے وہ پھر جین کالج آرہ واپس چلے گئے۔ ۱۹۹۲ء میں جب ویر کنور سنگھ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا تو وہ اس یونیورسٹی کے شعبہ اردو فارسی کے صدر ہوئے۔ ۱۹۷۹ء میں آپ ریڈر ہوئے اور ۱۹۸۵ء میں پروفیسر یہاں تک کہ ۳۱ جنوری ۲۰۰۱ء کو بحیثیت پروفیسر صدر شعبۂ اردو و فارسی و ڈین فیکلٹی آف ہیومنٹیز ممبر سنڈیکیٹ اپنے باوقار عہدے سے نہایت ہی عزت و احترام کے ساتھ ریٹائر ہوئے۔

لکھنے پڑھنے کا شوق اور ادبی ذوق وشوق آپ کو ورثے میں ملا تھا۔ دانا پور میں علامہ قتیلؔ کے شاگردوں کی ایک انجمن بزمِ احباب کے نام سے مشہور تھی جس کے تحت ماہانہ طرحی مشاعرے بیسیوں سال منعقد ہوتے رہے۔ پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ ان مشاعروں میں اپنے والد کی عطا کردہ طرحی اشعار پڑھا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان میں شعر گوئی کا ذوق پیدا ہوا اور وہ خود شعر کہنے لگے وہ جب اسکول میں تھے اس وقت سے ہی اپنے اشعار کہہ کر والد محترم سے اصلاح لیا کرتے مگر زمانہ طالب علمی کی وجہ سے علامہ قتیلؔ دانا پوری ان کی زیادہ حوصلہ افزائی نہ فرماتے۔ کالج میں پڑھنے کے دوران ہی ان کے علمی اور ادبی مضامین موقر جرائد مثلاً نگار لکھنؤ اور نوائے ادب ممبئی وغیرہ میں شائع ہونے لگے۔ اس طرح ان کے اندر شمع تخلیق کی لو تیز ہوتی گئی اور وہ ادبی دنیا میں ایک شاعر ایک ادیب اور ایک نقاد کی حیثیت سے پہچانے گئے۔ آپ کی تصنیفات علمی و ادبی اور شعری منظر عام پر آتی گئیں اور ان کی شناخت ایک مسلم الثبوت استاد شعر و ادب کی حیثیت سے تسلیم کی گئی۔ ملکی و بین الاقوامی مشاعروں کانفرنسوں اور سمیناروں میں آپ کی شرکت

ہوتی رہی اور انھیں اردو کے ساتھ ساتھ فارسی زبان و ادب کا بھی ایک مستند استاد مانا گیا۔

۲۰۰ سے زائد علمی و ادبی مذہبی و تحقیقی مقالات کے علاوہ آپ کی ایک درجن تصنیفات معرض وجود میں آچکی ہیں۔ اکثر اہم فارسی مقالات ہندستان پاکستان اور ایران کے نہایت باوقار اہم رسالوں میں شائع ہوتی رہیں۔ نثر میں آپ کی کتابیں تنقیدی و تحقیقی مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) اردو کی نعتیہ شاعری مطبوعہ ۱۹۷۴ء (۲) غور فکر (تنقیدی مضامین) ۱۹۷۶ء (۳) نقد و سنجش (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) ۱۹۸۲ء (۴) شاہ اکبر دانا پوری (تحقیق) ۱۹۸۵ء (۵) مسٹزم ان آور پوٹیری (انگلش) (۶) ارزشِ ادب (تنقیدی مضامین) ۱۹۹۵ء (۷) شایگاں (مجموعۂ کلام) (۸) شہاب سخن (رباعیاں) ۱۹۹۶ء (۹) اربعین (نعتیہ مجموعہ)۔

کچھ کتابوں کی تدوین اشاعت بھی کی۔ مثلاً (۱) گلستانِ سخنِ محمودؔہ (مجموعہ نعت) ۱۹۵۶ء (۲) تجلیات قتیلؔ (دیوان اردو) ۱۹۶۵ء (۳) خورشید سحر (فارسی دیوان قتیلؔ) مطبوعہ ۱۹۶۸ء (۴) ضیاء العروس از حضرت قتیلؔ ۱۹۸۶ء۔

شاعری میں آپ کے دو شعری مجموعے حسب ذیل ہیں:

شایگاں (غزلوں اور نظموں کا مجموعہ، مطبوعہ ۱۹۸۹ء) شہاب سخن (۲۰۰ اردو رباعیوں کا مجموعہ) مطبوعہ ۱۹۹۶ء ان کے علاوہ آپ کی کئی تصنیفات تشنہ طبع مثلاً تذکرہ شعرائے دانا پور، آئین تصوف، قطعات تاریخ وصال مشائخ کرام۔

پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ ایک نہایت شریف النفس خلیق باوضع اور ہمدرد خلائق انسان ہیں۔ قومی و ملی درد رکھتے ہیں۔ اپنے والد کے جانشین اور سجادہ نشیں آستانہ عالیہ چشتیہ نظامیہ دانا پور ہیں۔ اپنے والد کی طرح ہی انھیں تحریر و تقریر پر یکساں ملکہ حاصل ہے۔ ادبی جلسوں کے علاوہ مذہبی جلسوں اور سیرت کے مذہبی کانفرنسوں اور سیرت پاک کے جلسوں میں آپ خطاب کے لیے بلائے جاتے ہیں۔ شمالی ہند سے لے کر جنوبی ہند کے اکثر و بیشتر بڑے شہروں میں آپ کی تقریریں ہوتی ہیں۔

مولانا عبداللہ عباس ندوی پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ کے متعلق رقم طراز ہیں:

’’پروفیسر شاہ طلحہ رضوی برقؔ کو ایک ادیب، صاحب قلم اور ناقد و محقق کی حیثیت سے عرصہ سے جانتا ہوں۔ ان کے مضامین موقر علمی مجلّات و رسائل میں دیکھتا رہا ہوں۔ ان کے تحقیقی مقالات کا مجموعہ ’’نقد بخش‘‘ ایک علمی ماخذ کا درجہ رکھتا ہے۔ فارسی کا ذوق ان کو ورثہ میں ملا ہے، اس پر وہ ماہرانہ دسترس رکھتے ہیں۔ فن رباعی پر ان کے مقالات، ان کی نکتہ رسی، دقیقہ سنجی اور وسعت معلومات کا آئینہ ہیں۔ ان اوصاف دانشوری اور معاصر دانش گاہ کے استاد و مربی ہونے کے ساتھ پروفیسر برقؔ شاہ صاحب بھی ہیں۔ صاحب سبحہ و سجادہ اور حامل جبہ و دستار، ذکر خفی اور ضرب جلی دونوں سے آگاہ اور منازل سلوک و مقامات کے آشنا۔ ان کی رباعیوں میں اگر ایک طرف قدرت کلام اور قوت تعبیر جلوہ گر ہے، فن کی باریکیاں اور موضوع سخن کے لحاظ سے الفاظ کا انتخاب، حسن تلاش نمایاں ہے تو دوسری طرف دعوت و اصلاح، فرد و معاشرہ کی تربیت کا پہلو بھی لفظ لفظ سے آشکارا ہے۔ وہ مشرکانہ عقائد پر بجلی بن کر کڑکتے اور برق بن کر گرتے ہیں۔ مسلم معاشرہ جن معاصی میں مبتلا ہے، جہل و اسراف اور جاہلانہ رسوم کا خوگر ہو گیا ہے ان پر ان کی کڑی نظر ہے۔ وہ معصیت کے زخموں اور فاسد مواد کو دیکھ رہے ہیں اور ان پر اپنی رباعیوں سے نشتر لگا رہے ہیں۔ فلم، ٹی وی کی پیدا کردہ نحوستوں سے آگاہ کرتے ہیں۔ رشوت، بداخلاقی، جنسی بے راہ روی پر متنبہ کرتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں براہ راست کہتے ہیں۔ میں نے ان کی رباعیوں کو جہاں تک پڑھا کوئی بے مقصد نہیں ہے اور نہ شاعری برائے شاعری ہے اور نہ ہی لفظ و انشاء کی نمایش ہے‘‘۔

پروفیسر سید وحید اشرف کچھوچھوی (سابق صدر شعبۂ اردو و فارسی و عربی مدراس

یونیورسٹی مدراس) برقؔ صاحب کے متعلق یوں رقم طراز ہیں:

’’پروفیسر سید طلحہ رضوی برقؔ ہماری نسل کے اردو اور فارسی کے ممتاز دانشوروں میں ہیں۔ اردو و فارسی کا شعری اور ادبی ذوق ان کو ورثہ میں ملا ہے۔ ادبی ماحول اور اساتذہ کی صحبت و تربیت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ روحانی گھرانے کے پروردہ ہونے کے سبب خانقاہیت اور صوفی منشی طبیعت میں رچ بس گئی۔ ماحول، تربیت اور فطری ذوق نے ان کی شخصیت میں وہ نکھار پیدا کر دیا جس میں دل و دماغ، دین و دنیا اور روح و مادّہ کا متوازن امتزاج نظر آتا ہے۔ خانقاہیت کے ساتھ عمل، حرکت اور محنت و مشقت، روحانیت کے ساتھ ادبی اور شعری لطافت اور گوشہ گیری کے ساتھ دیدہ وری، یہ ان کی متوازن شخصیت کے چند پہلو ہیں‘‘۔

پروفیسر برقؔ ادب کے ساتھ محقق اور انتقادی بصیرت کے حامل دانشور ہیں۔ تعلیم و تدریس کے ساتھ تحقیق میں رہنمائی ان کے پیشہ ورانہ فرائض میں داخل ہے اس کے علاوہ نثر و نظم میں ان کے رشحات قلم ہمارے ادب کا قابل فخر سرمایہ ہیں۔

رباعیوں کے موضوعات میں تصوف، نعت، منقبت، مذہبی اخلاقیات موجودہ دور کے سماجی بگاڑ اور ان کی اصلاح کا جذبہ اور سسکتی ہوئی انسانیت کے لیے پیغام عمل سبھی کچھ موجود ہیں۔ رباعی ابتدا ہی سے صوفیانہ خیالات اور اخلاقی تعلیمات کی حامل رہی ہے۔ برق نے اردو میں یہ رباعیاں لکھ کر اس روایت کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی یہ صحت مند جرأت قابل ستایش ہے یہ ان کا حق بھی تھا اور فرض بھی جسے انھوں نے پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔

پروفیسر طلحہ رضوی برق نے اپنی رباعیوں سے اصلاح کا کام لیا ہے۔ انھیں اس کی پرواہ نہیں کہ ادب کے بازار میں کون سا سکہ رواں ہے۔ وہ صرف سچائی کا کھرا سکہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی بیشتر رباعیاں صاف و سادہ اور چست و چاق ہیں۔ بیان میں کوئی جھول نہیں ہے نہ بیان بالکل سپاٹ ہے ان میں زبان کا لطف بھی ہے اور بیان کی تاثیر بھی۔ برق رباعی کے مزاج

سے پوری طرح واقف ہیں اور اس کو مہارت کے ساتھ برتنا جانتے ہیں۔

پروفیسر برقؔ کا شمار صوبۂ بہار کے ان شعرا میں کیا جائے گا جنھوں نے دبستان عظیم آباد کی شعری روایت کو تحفظ دیا ہے وہ ادب کی کلاسیکی قدروں کے امین ہیں۔ان کے شعری مجموعہ شایگاں سے متعلق اردو کے مشہور شاعر وادیب وناقد ڈاکٹر کرامت علی کرامت لکھتے ہیں:

> ''برقؔ صاحب کے دیگر معاصرین جدیدیت کی طرف مائل ہیں،جس کا ظاہر ہے دبستانِ عظیم آباد سے کوئی رشتہ نہیں۔اس لیے موصوف اپنے ہم عصروں میں واحد شاعر نظر آتے ہیں جو عظیم آباد کی عظیم روایت کو اب بھی سینے سے چمٹائے ہوئے ادبی منازل طے کررہے ہیں۔ان کے کلام میں وہی پاکیزگی وطہارت، وارداتِ قلبی کی وہی پرخلوص عکاسی نیز حیات و کائنات کے رشتوں کو سمجھنے کی وہی سنجیدہ کوشش پائی جاتی ہے جو دبستانِ عظیم آباد کا خاصہ ہے''۔

(مقدمہ شایگاں از کرامت علی کرامت،ص۴)

طلحہ رضوی برقؔ کی شاعری میں جو چیز مجھے سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ ان کی حزنیہ لے ہے۔یہ مخصوص لے زندگی کے تمام درد واضطراب کو ایک مرکز پر سمیٹ لاتی ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ضرور چوٹ کھائی ہے لیکن ان کی شاعری میں اس چوٹ کا کہیں براہِ راست ذکر نہیں ملتا۔اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ وہ رمز وایما کی مدد سے حدیث خلوتیاں بیان کرنے کا طریقہ جانتے ہیں۔حزنیہ لے پر مبنی ان کے چند اشعار درج ذیل کر رہا ہوں جو رفتہ رفتہ ہمارے دل کی گہرائیوں میں تو اترتے چلے جاتے ہیں،لیکن ہمیں اس کا اندازہ نہیں ہوتا کہ شاعر کو کس قسم کا غم نصیب ہے۔یعنی یہ غم روزگار ہے یا غم جاناں غم ذات ہے یا غم دیگراں (یا پھر ان سب کا حسین وجمیل امتزاج) بس غم ہی غم کا سمندر ہے جو ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آتا ہے۔ملاحظہ ہو ؎

موت جینے کی سزا ہے تو یہ ارشاد بجا — زیست کس جرم کی پاداش ہے کیا کہیے گا

لگا کے درد کے پیوند اوڑھتے رہیے — بنی ہے زندگی آج ایک عذاب کی چادر
پھر کوئی آبلہ پا جانب صحرا نہ گیا — نخل شاداب جنوں سوکھ گیا میرے بعد
تشنہ کامی پر مری خودنم ہوئی ساقی کی آنکھ — دیر تک روتا رہا ایک ایک پیمانہ مجھے

طلحہ رضوی برقؔ کی حزنیہ لے کے بعد جو چیز مجھے سب سے زیادہ پسند ہے وہ ہے ان کی شاعری میں فلسفیانہ اور متصوفانہ رنگ وآہنگ کا امتزاج جس سے شاعر کا مفکرانہ لب ولہجہ واضح ہوتا ہے۔برقؔ خود خانقاہی آدمی ہیں ان کی شاعری کا متصوفانہ آہنگ غالباً تصوف سے ان کی اسی عملی وابستگی کا نتیجہ ہے ان کے مفکرانہ لب ولہجہ کی چند مثالیں درج ذیل کررہا ہوں ؎

کیا ہے کہاں سے ہے اور کیا ہوگا بالآخر اس کا وجود
مل کے سمندر سے وہ کہے گا بولا اک قطرہ پانی

قطرہ مجھے آمادہ طوفان نظر آیا
ذرہ ہے کہ خورشید درخشاں نظر آیا

مری حکایت ہستی مرا یہ قصہ شوق
ہے ماجرائے جنوں داستان حدث وقدم

مجھے اس بات پر خوشی ہے کہ برقؔ جدید شاعر ہی نہیں بلکہ روایت سے وابستگی کی وجہ سے جدید شاعروں کی بھیڑ سے ہٹ کر اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔پھر بھی اس عہد میں سانس لینے والا ایک باشعور اور حساس شاعر کہاں تک عصری حسیت سے نظر بچا کے گزر سکے۔طلحہ رضوی برق کے درج ذیل اشعار سے بہتر طریقے پر جدید حسیت کا اظہار اور کیا ہوسکتا ہے ؎

رہِ حیات پہ انبوہ کس پر ساں ہے — کسے غرض کہ تمھیں ہٹ کے راستہ دے گا
لہو کے شعلے لپکتے ہیں جسم کے اندر — غموں کا ضبط عناصر کو ہی جلادے گا

صاحب نظر بھی ہونا عجب سانحہ ہوا — جو نقش آیا سامنے دیکھا مٹا ہوا
ہر طرف کٹ رہی ہے یوں گویا — اک کھڑی فصل نسل آدم ہے

جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے طلحہ رضوی برق کی شخصیت دو حصوں میں بٹی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ایک کا تعلق فصیح اور عام فہم زبان سے ہے اور دوسرے کا تعلق بلیغ اور عربی و فارسی آمیز مشکل زبان سے ہے۔ان کے یہاں اول الذکر اسلوب نسبتاً زیادہ موثر اور دلکش ہوتا ہے۔کیونکہ ان میں وہ کاٹ ہوتی ہے جو بہت کم افراد کو نصیب ہوگی۔چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے ۔

ہاں خوشی مجھ سے بھی ایک بار ملی تھی شاید — آپ سے ہو جو ملاقات دعا کیجیے گا
شب غم تری یاد کیا لے گئی — اک احساس جینے کا تھا لے گئی

خفا موت سے زندگی سے غمیں — قضا آکے آخر منا لے گئی
یوں یاد تری دل کو چھوتی ہوئی گذری ہے — جیسے کبھی غربت میں یاد آئے وطن اپنا

ان کی عربی و فارسی آمیز زبان کی مثالیں ملاحظہ فرمائیے جو عبدالعزیز خالدؔ کے اسلوب کی یاد تازہ کردیتی ہے ۔

متاع جرأت دل وقف یک نگاہ کرم — وجود بے سرو ساماں رہین ملک عدم
بڑھی جو تشنہ لبی ضامن حیات ہوا — خدنگ حرملہ وقت ولولہ بن کے
گہنا چکا ہے کب سے مری شخصیت کا چاند — اے دوستو یہ وقت صلوۃ الکسوف ہے
ساقی اس آبگینہ نازک کی ہو خیر — صہبائے تند و تیز شکست ظروف ہے
صوفیٔ صاف قلب کی نسبت کا پاس ہو — کہنے کو برقؔ آپ کا ملبوس صوف ہے

طلحہ رضوی برقؔ کے بعض اشعار ایسے ہیں جن میں چونکا دینے والی عجیب و غریب تشبیہات و استعارات پائے جاتے ہیں جنھیں ان سے قبل غالباً کسی اور نے نہیں باندھا تھا۔مثلاً ۔

ایک توہّم سو اندیشے عشق میں ناکامی کا سبب — ان کی گلی تک جب بھی پہنچا بلی رستہ کاٹ گئی
ہم اپنے سینے میں رکھتے ہیں حسرت و ارمان — کبوتر ان حرم کی طرح بسائے ہوئے
لوح جبیں سے مٹ نہ سکا ایک حرف بھی — لکھا ہے لکھنے والے نے کتنا دبا کے ہاتھ

برقؔ کی ایک غزل کا آغاز یوں ہوتا ہے ۔

نگاہ عشق اٹھ گئی جدھر جدھر جہاں جہاں

اس غزل میں ٹکنک کا یہ نیا تجربہ انجام دیا گیا ہے کہ ہر شعر کے مصرعہ ثانی میں صنعت ذو قافتین کے ساتھ ہر قافیہ کی دو دو مرتبہ تکرار ہوئی ہے

(۱)بھٹکتی جائے یہ نظر، کدھر کدھر کہاں کہاں
(۲)مرا وجود ضوفشاں ، سحر سحر اذاں اذاں
(۳)میں بام و در مکاں مکاں، اثر اثر، زماں زماں
(۴)جگر جگر تپاں تپاں ، نظر نظر دھواں دھواں
(۵)وہ ابرو و مژہ بہم تبر تبر سناں سناں
(۶)فسانۂ حیات بھی خبر خبر گماں گماں

طلحہ رضوی برقؔ کا یہ شعر پڑھ کر ۔

یہ آنکھیں لاسکیں گی تاب کیسے ان کے جلووں کی
رخِ پرنور کا پرتو زمین سے آسماں تک ہے

غزل کے پہلو بہ پہلو برقؔ صاحب کو نظم گوئی پر بھی عبور حاصل ہے۔آج کے دور میں کتنے شاعر ہیں جو اس قسم کی پختگی اور شستگی سے اپنے خیالات کو منظوم کر سکتے ہیں؟ ۔

مستیٔ فقر و جذبِ عشق ، پردہ درِ رخِ حیات
چشمِ حقیقت آشنا، منہمکِ تجلیات
درد جو نقش بن گیا سینۂ واشگاف کا
ضبطِ قلم ہوئی تمام قلب کی تازہ واردات
رازِ درونِ میکدہ ، فاش ہوئے جو سر بسر
خونِ جگر سے ہر غزل تابشِ چہرۂ ثبات

(نظم ''نذرِ اقبالؔ'')

ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ کی شعری ونثری خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے مشہور شاعروں نے بھی اظہار خیال کیا ہے۔ پروفیسر عبد المغنی لکھتے ہیں:

”ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ اردو کے ان معدودے چند ادیبوں اور شاعروں میں ایک ہیں جو فارسی زبان وادب کی بھی اچھی واقفیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اردو نظم ونثر دونوں کے اظہار وبیان پر قدرت رکھتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے معتد بہ تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں اور اشعار بھی۔ ان کے مضامین واشعار قابل ذکر ادبی رسایل میں شایع ہوتے رہے ہیں۔ نثر میں ان کی پانچ کتابیں شایع ہوچکی ہیں اور اب وہ نظم میں اپنا پہلا مجموعۂ کلام دنیاے ادب کے سامنے پیش کررہے ہیں۔

اس مجموعے میں بیش تر غزلیں ہیں۔ چند پابند نظمیں اور کچھ آزاد نظمیں۔ اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ برقؔ ہر ہیئتِ فن میں دادِ سخن دے سکتے ہیں۔ بہرحال ان کی غزلوں میں اردو شاعری کی بہترین روایات کا عکس ہے اور ان کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ شاعر اپنے ادب کے سرمایے سے نہ صرف بخوبی آگاہ ہے بلکہ اسے پر اثر انداز سے استعمال کرنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے“۔

پروفیسر حفیظؔ بنارسی (سابق صدر شعبہ انگریزی ویر کنور سنگھ یونیورسٹی آرا) پروفیسر برقؔ کے متعلق لکھتے ہیں:

”شاعر شایگاں جناب طلحہ رضوی برقؔ شایقینِ شعر وادب کے لیے محتاجِ تعارف نہیں۔ مدّتِ مدید سے وہ نگارِ سخن کے گیسو سلجھاتے رہے ہیں۔ وہ استاد الشعراء حضرت علامہ قتیلؔ داناپوریؒ کے خلف الرشید ہیں اور شاعری ان کو ورثے میں ملی ہے۔ مگر انھوں نے اس گراں مایہ ورثہ کی نہ صرف حفاظت کی ہے بلکہ اپنے گوناں گوں تجربات ومشاہدات اور علمی توانائی

کے سہارے اس میں بیش بہا اضافہ بھی فرمایا ہے“۔

شایگاں میں جو کلام شامل ہے اس میں فکر وخیال اور زبان وبیان دونوں کی رعنائیاں جلوہ گر ہیں۔ غزلیں ہو یا نظمیں یا رباعیات ان کی مشاقی اور قادر الکلامی ہر جگہ نمایاں ہے۔ صوفی صافی ہونے کے باوجود ان کی رندمشربی اور تہذیبی عاشقی کے نقوش بھی ان کے کلام میں جا بجا نظر آجاتے ہیں۔ انھوں نے شاعری میں کوئی نیا تجربہ تو نہیں کیا ہے مگر روایت کے پورے احترام کے ساتھ قدرے جدت طرازی کی سعی کی ہے۔

آج سے ۳۶ سال پہلے ڈاکٹر وزیر آغا، طلحہ رضوی برق سے متعلق لکھتے ہیں:

”ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ کے کلام میں روایت کا مخصوص نکھار اور جاذبیت تو موجود ہے لیکن ساتھ ہی ان کے ہاں ماحول کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کا میلان بھی ابھر آیا ہے۔ اسلوب کے سلسلے میں وہ فارسی تراکیب اور بندشوں کے رسیا ہیں لیکن ان کے لہجے پر گذرتے ہوئے زمانے کی کلبلاہٹ اور بےسمتی کا احساس بھی ثبت ہے جو ان کی جدیدیت پسندی کا ایک روشن ثبوت ہے“۔

مشہور شاعر اور ناقد پروفیسر عنوان چشتی برقؔ سے متعلق فرماتے ہیں:

”ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ اردو کے ان مخلص اور ممتاز شاعروں میں شامل ہیں جن کی شخصیت ادب، تہذیب اور تصوف کا حسین پیکر ہے۔ ان کی تربیت میں حضرت علاّمہ قتیلؔ داناپوری کی دعائیں اور نیک تمنائیں بھی شامل ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری میں وہی غنائیت اور رنگِ معرفت ہے جو ان کی شخصیت کا جوہر ہے۔ ”شایگاں“ موصوف کا شعری مجموعہ ہے جس میں غزلیں، رباعیاں اور نظمیں شامل ہیں۔ ان کی شاعری میں ایک طرف ان کے رنگ افشاں جذبات اور متنوع کیفیات کی جلوہ گری ہے اور دوسری طرف زندگی اور زمانے کے وہ تاثرات بھی ہیں جن سے انسان کے شب

وروزعبارت ہیں۔ان کی شاعری میں ہماری تہذیبی اوراخلاقی قدروں کی
چاندنی بھی چھٹکی ہوئی ہےاوران کی نظموں میں روحانیت کے سایے بھی
لرزاں ہیں۔انھوں نے اردوشاعری کی مہذب شعری زبان میں اپنے
افکاروجذبات کو جمالیاتی انداز سے پیش کرنے کی سعیٔ بلیغ کی ہے‘‘۔

(عنوان چشتی شائگاں بیک کور)

ڈاکٹر مصلح الدین اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ طلحہ رضوی برق کی غزلوں کا تجزیہ کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ وہ شاعری کے محاسن اورزندگی کے حقیقی حسن سے واقف ہیں۔ان کی غزلوں میں عصری حسیت اورموجودہ دور کے المیہ کا فنکارانہ بیان موجود ہےان کی شاعری میں شوروہنگامہ نہیں لطیف اشارات ہیں اوروہ غم بھی نہیں جو مایوسیوں کے قریب لے جائے اورنہ وہ رجائیت ہے جورومانیت کی پردہ دار ہوتی ہے۔برق کی شاعری میں تیز روشنی یا گہرے اندھیرے کا احساس بھی نہیں ہوتا لیکن ان کے یہاں سماجی اورذاتی غم ضرور ہے۔اس کی ترجمانی ملاحظہ ہو ؎

درد کی لذت متاع زیست ہے　　　زخم دل بیگانۂ مرہم رہا

برق ان کی بے رخی کا کیا گلہ　　　جب مزاج وقت ہی برہم رہا

ستارے جھانکتے ہیں شام کی فصیلوں سے　　　نہ جانے آخر شب ان کا حال کیا ہوگا

لہو کے شعلے لپکتے ہیں جسم کے اندر　　　غموں کا ضبط عناصر کو ہی جلادے گا

وہ خارزار حیات اور یہ آبلہ پائی　　　لہو جلاکے شب سانحات کاٹی ہے

نظریں آتی رہیں ہرسمت سے پتھر بن کے　　　میں جھکا ہی رہا ایک شاخ ثمرور بن کے

قفس میں زخم جگر پھول سے نظر آئے　　　کہیں قریب سے شاید بہار گذری ہے

برق نے اپنی غزلوں کی ترتیب وتزئین کے لیے نئی ترکیبیں ،تشبیہیں اور نئے استعارے تراشے ہیں۔نیا اسلوب اورنئی علامتیں اپنائی ہیں اوراس کی تازگی وندرت کو برقرار رکھنے کے لیے روایات اوراقدار سے رشتہ قائم رکھا ہے۔ان کی غزلوں میں توانائی ،شوخی، برجستگی اورایک مخصوص کیفیت ہے۔ان کا عزم وحوصلہ اوراندرونی بے چینی نے انھیں ہرلمحہ نئی منزل، نئے

سفراورایک معاشرے کی تلاش میں سرگرم کیا ہے جو ہماری بقااور شناخت کے لیے ضروری ہے۔ برق کی نگاہ حالات کی سختیوں اورزندگی کی ناہمواریوں پر بھی جاتی ہے۔ وہ ہمارے ماحول اور موجودہ تہذیب کی کرشمہ سازیوں کومنظر عام پرلاکراپنے محسوسات کودل نوازی کے ساتھ پڑھنے اور سننے والوں کے ذہن ودماغ تک پہنچاتے ہیں۔ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

حواس یورش تہذیب نو میں گم جو ہوئے　　　ہم اپنے گوہر اقدار کھوئے جاتے ہیں

کریہہ چہرے پہ رنگیں نقاب ہے گویا　　　فریب زندگی آج اک عذاب ہے گویا

کسی کو ٹوٹ کے یوں چاہنا سزادے گا　　　سنوگے آخر شب درد جب صدا دے گا

پھول کھلے ہیں گلشن میں یاآگ لگی ہےچارطرف　　　تختۂ گل کے شعلوں پر ہی گوہر شبنم جلتا ہے

جینے کی رشک اور نہ مرنے کی تمنا　　　کیا دن مجھے دکھلائے ہیں گم کردہ رہی ہے

دل کا لہو جب منہ میں آیا گھونٹ گیا ہنس کر　　　میں نے کیونکر شعر کہے ہیں تم کو کیا معلوم

چراغ عزم لہو سے جلا کے شب کاٹی　　　بجھا ہوں برق میں جینے کا حوصلہ بن کے

بنے ہیں چہرے نشان سوال جسموں پر　　　شکست و ریخت ہی ان کا جواب ہے گویا

برق کے مندرجہ بالا اشعار کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ ان کی شاعری میں غوروفکر،عصری حسیت اورحکیمانہ نظریہ موجود ہے۔گرچہ وہ حسن وشباب کے شاعرنہیں لیکن حسن کی کرشمہ سازیوں اوراس کی ادائے دلبری سے کورے بھی نہیں۔وہ نہایت خاموشی اورراز داری کے ساتھ زندگی کے سفرمیں اس سازکوچھیڑکراس کی آواز کے شیدائی ہوئے ہیں۔وہ ایک صوفی صافی ہونے کے باوجودایسے اشعارتخلیق کرتے ہیں جن سے ان کے رومانی مزاج کا پتہ چلتا ہے۔برق نےحسن اورمتعلقات حسن کی جن رنگینیوں اوررعنائیوں کا ذکر کیا ہے وہ ان کی شاعری کوزندہ دلی اورزندگی کی توانائیوں سے قریب کردیتی ہے۔برق جب حسن وعشق کے موضوعات پراپنی جولانی طبع کا مظاہرکرتے ہیں تو یہ موضوعات حسن بیان کی نادرہ کاری کے سبب برق بداماں ہوجاتے ہیں۔وہ متعلقات حسن کی ترجمانی میں خوداپنی مخصوص سرمستی اورسرشاری سے مصرف لیتے ہیں۔ ان کا مزاج ایک مخصوص رومانیت کا حامل ہے جس کے طفیل وہ اپنی شاعری کے رنگین پیکر تراشنے

میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ملاحظہ ہوں یہ چند اشعار ؎

لطف و کرم کہ جور و ستم دیکھتے رہے — ہم آپ کو خدا کی قسم دیکھتے رہے
تمام یادوں کے اصنام ہیں شکستہ پڑے — ترا خیال ہی دل کو خدا رسول ہوا
آپ کی زلفیں سلامت رشتہ گیسودراز — عمر بھر کہتے رہیں گے لوگ دیوانہ مجھے
بجلیاں گرتے کبھی دیکھی ہے — وہ یہ کہنے لگے ہنس کر اک دن
میں بھول کے گر ہنس دوں دیوانہ کہے دنیا — یادوں نے تری مجھ کو اس درجہ رلایا ہے
سحر کا وقت ہے سورج بھی ہے نکلنے کو — وہ آگئے ہیں سر بام دیکھیے کیا ہو
زندگی ختم ہوئی بس اسی حسرت میں کہ وہ — مجھ کو پاس اپنے بلالے مجھے چاہے گا ہے

برق کی غزلوں میں تنوع ہے جس میں مخصوص رنگ و آہنگ ہے گرچہ ان کا مزاج غزل گوئی سے زیادہ ہم آہنگ ہے لیکن ان کی نظمیں قطعات اور رباعیات میں بھی یہ وصف موجود ہے کہ ہم انسانی زندگی کے حالات پر سوچیں اور سوچنے پر مجبور ہوں؟ برق کی غزلوں کا جائزہ لینے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے غزل کے میدان میں ایک الگ راہ بنائی ہے جس کا رشتہ روایت سے مضبوط و مستحکم ہے قدیم روایت سے رشتہ استوار کر کے انھوں نے اپنی شاعری کے لیے جدید راہ اپنائی ہے۔ اسی وجہ سے ان کے کلام میں ایک خاص رنگ و آہنگ ہے، ایک ندرت اور شگفتگی ہے۔ ان کی غزلوں کی ابتدا جس خاص تاثر سے ہوتی ہے انھوں نے اپنی شاعری کی اس خصوصیت کو قائم رکھنے کے لیے دل کش اور رواں زمینوں اور ردیف وقوافی کا انتخاب کیا ہے۔ برق زبان کے لحاظ سے بھی دوسرے شعرا سے آگے ہیں۔ ان کی زبان شستہ اور ٹکسالی ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

کسی کی ایسی بھی پروردگار گذری ہے — تمام عمر مری سوگوار گذری ہے
دل شکستہ کی صبر آزمائیاں توبہ — ٹھہر ٹھہر کے شب انتظار گذری ہے
قفس میں زخم جگر پھول سے نظر آئے — کہیں قریب سے شاید بہار گذری ہے
صبا کو رشک ہے ان پر کہ زندگی جن کی — حضور دامن خوشبوے یار گذری ہے

برق کی اچھی غزلوں میں تغزل کی مثالیں ملتی ہیں۔ ان کی غزلیں سجیلی ہیں، بناوٹی

نہیں۔ آرائش ہے مگر تصنع نہیں کیونکہ انھوں نے اپنی شاعری کی بنیاد اپنے خون جگر پر رکھی ہے اس لیے ان کے کلام میں شگفتگی اور دل کشی ہے ؎

اشک جب قطرۂ خوں ہو تو غزل ہوتی ہے — ضبط غم حد سے فزوں ہو تو غزل ہوتی ہے
عشق کی آگ میں جل جائے متاع ہستی — برق کہتا ہے کہ یوں ہو تو غزل ہوتی ہے
کہیں نہ برق کی محرومیوں کا ذکر آئے — عدو نے عشق و محبت کی بات کاٹی ہے
ان آنکھوں سے خون بہے ہیں تم کو کیا معلوم — دل پر کیا کیا زخم سہے ہیں تم کو کیا معلوم
گردش وقت نے کیا کیا نہ چلائی تلوار — دوش ایام پہ باقی رہا میں سر بن کے
ہم شہیدان محبت کو جو موقع ملتا — تختۂ دار و رسن اور بھی اونچا کرتے

اردو شعرا کی موجودہ نسل نے غزل کے رمز و ایما کے آداب جس قدر اور جہاں تک سمجھا ہے برق نے اسے کچھ زیادہ ہی سمجھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں نشتریت، سوز و گداز، ترنم فکر اور زور بیان موجود ہے۔ برق نے شاعری کے ان تمام اجزاء کو نہایت ہنرمندی اور سلیقہ سے یکجا کیا ہے جس سے ان کی غزلیں زندگی سے قریب ہوگئی ہیں۔ ان کے کلام میں آہستگی اور دھیما پن ہے۔ تبصرہ نہیں سلجھے ہوئے ذہن کا اشارہ ہے۔ برق غموں کے سمندر میں ڈوبتے ہیں اور سیاہی کے انسانی وجود کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے عشق میں عارفانہ حدّت ہے جو زندگی کی حرکت و عمل پر مائل کرتی ہے۔ برق غم ذات اور غم کائنات دونوں کے شاعر ہیں ان کی شاعری کو کسی عصری پیغام سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا'' (شناخت)

پروفیسر طلحہ رضوی برق اردو کی نہایت اہم اور ادق صنف یعنی فن تاریخ گوئی میں بھی اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ آج جب کہ اس روایتی مگر مشکل فن کے ماہرین بہت کم رہ گئے ہیں۔ جناب برق کا نام گنتی کے چند تاریخ گویوں میں نمایاں ہے۔ آپ کی برجستہ تاریخ گوئی کیا اردو کیا فارسی دونوں میں ہے۔

جناب برق نے نعتیں بھی لکھی ہیں جن کی تعداد ۶۰ سے اوپر ہی ہوگی۔ آپ نہایت محتاط انداز رکھتے ہیں۔ چار بار انھیں فریضۂ حج اور زیارت حرمین شریفین کی سعادت بھی نصیب

ہوئی ہے۔لہٰذا ان کی نعتوں میں عشق رسول کا جذبہ بہت نمایاں ہے۔اور کیوں نہ ہو۔آپ کا سلسلہ نسب حضرت امام حسین (رضی اللہ عنہ) تک پہنچتا ہے جو حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے اور حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے لخت جگر تھے۔برقؔ نے سلام اور منقبتیں بھی لکھی ہیں۔

جناب برق مسلم معاشرے میں ایک نہایت ہر دل عزیز شخصیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے اپنے عزیز واقارب اور دوست واحباب کے ساتھ اپنی محبتوں کا بے پناہ اظہار کیا ہے جس کا ثبوت آپ کے لکھے ہوئے وہ سہرے ہیں جو عزیزوں دوستوں کی تقریبات شادی میں پڑھے اور شائع کیے گئے۔سہرا نویسی بھی اردو شاعری کی ایک قدیم روایت اور اعلا قدروں کی حامل ہے۔طلحہ رضوی برق دانا پوری نے اس صنف کو بھی تر وتازہ وشاداب رکھا ہے۔

اسم اعظم چراغ تہہ دامن شب
شہپرِ مرغ تخئیل کی جنبش بے صدا
مثل موج صبا
فکر خوابیدہ کو عابد زندہ شب جان کر
خلوت ذہن میں آ کے چونکا گئی
جذبۂ بندگی غنچۂ ناشگفتہ کی صورت
تبسم سے محروم تھا
اے خوشا فرط احساس
اشک ندامت کی شبنم سے شاداب ہوکر
ایک انگڑائی لیتا ہوا کھل گیا
گنج عقل وخرد عشق کی خوشبوؤں سے معطر ہوا
اور جبینِ تصور ستارے لیے
سجدۂ شکر میں یک قلم جھک گئی

رشتہ جاں میں تسبیح کے موتی پھرنے لگے
اسم اعظم چراغ تہہ دامن شب
علیمٌ خبیرٌ سمیعٌ بصیرٌ
ازل بھی وہی ہے ابد بھی وہی
جو سیہ تیرہ وتار شب میں
کسی سنگ اسود پہ چلتی ہوئی
کالی چیونٹی کے
ننھے سبک خوبصورت
مشینوں کے مانند چلتے ہوئے پاؤں کی
وہ صدا
جس کو معدوم کہیے
سنا کرتا ہے بلکہ یوں دیکھتا ہے
مرے دل میں پیدا
تمنائے ناکردہ جرم وخطا جس طرح

سر بہ محراب تو کل خم رہا — میں نہ زندانی بیش و کم رہا
دل نشاط و کرب کا سنگم رہا — عمر بھر بادیدۂ پرنم رہا
نالۂ بلبل جگر کی ٹیس تھی — خندۂ گل کیا ہے یہ مبہم رہا
تھا شکستہ شیشۂ دل ہی بہت — سامنے ہر چند جام جم رہا
جلوۂ خورشید کا ساماں لیے — قطرۂ بے مایۂ شبنم رہا
درد کی لذت متاع زیست ہے — زخم دل بیگانۂ مرہم رہا
اے خوشا ہنگام فکر ان کا خیال — ہر سخن معیار کیف و کف رہا
دل کی دھڑکن میں بھی تھی شائستگی — نغمہ ہم آہنگ زیر و بم رہا

برقؔ ان کی بے رخی کا کیا گلہ
جب مزاج وقت ہی برہم رہا

دل کو آداب غم عشق کا محرم رکھیے　　پاس وابستگی گیسوئے پر خم رکھیے
آستیں وقف پے دیدۂ پرنم رکھیے　　زخم اپنوں نے دیے ہوں تو نہ مرہم رکھیے
ربط ہے نظم دوعالم سے رہے یہ بھی خیال　　اس قدر اپنا مزاج آپ نہ برہم رکھیے
لذت درد و محبت کی قسم ہجر کی شب　　ہے دعا وصل کی امید اثر کم رکھیے
آتش گل سے گذرتا ہوا آیا ہے کوئی　　راہ میں آپ بھی کچھ گوہر شبنم رکھیے
بوریا فقر کا اور رنگ سلیمانی ہے　　کس لیے پھر ہوس تخت کے وجم رکھیے
دل ہے اے برقؔ مرا آئینہ حسن و جمال
نظر اس شیشۂ کمیاب پہ ہردم رکھیے

کتنی کشتی ایک پہ ایک اس گھاٹ کھلی اس گھاٹ کھلی
میری تو ہر رات کنارے جوہتے ان کی باٹ گئی
ایک توہم سو اندیشے عشق میں ناکامی کا سبب
ان کی گلی تک جب بھی پہنچا بلی راستہ کاٹ گئی
میری کتاب زیست سے اک اک نام پری رخساروں کا
روپا جیسی چم چم کرتی وقت کی مچھلی چاٹ گئی
کوئی خریدے یا نہ خریدے جنس وفا انمول تو ہے
ایک خلا تھا دل میں کب سے نظر تمھاری پاٹ گئی
خط میں لکھا تھا خون سے نام اس شوخ کا ہم نے برقؔ کبھی
بھولی بسری یاد کی شدت پیشانی پر ساٹ گئی

فکر رکھتا تھا ثمر دار نہالوں کی طرح　　میں کہ ہوں آج پراگندہ خیالوں کی طرح
زندگی کوچۂ قاتل سے عبارت ٹھہری　　لوگ کہتے ہیں میں گذرا ہوں جیالوں کی طرح
یاد آجاتی اگر ان کی تو شانہ کرتا　　ذہن کا حال ہے الجھے ہوئے بالوں کی طرح
ظلم کی کور نگاہی نہ رہی بعد مرے　　درد تھا پھیل گیا دل پہ اجالوں کی طرح
دل عجب شاخ ہے اے برقؔ نہال غم کی
پھول ہر فصل میں کھلتے رہے لالوں کی طرح

حصول شوق میں پاگل سے ہورہے ہیں لوگ　　زمین شور میں سنبل ہی بورہے ہیں لوگ
خیال سود و زیاں کیا ہے فکر نفع و ضرر　　اس احتساب سے بیگانہ ہورہے ہیں لوگ
ہوا و حرص کا میلا لگا ہوا ہے تمام　　مفاد ذات کی کثرت میں کھورہے ہیں لوگ
نگاہ وقت کی فرد عمل پہ رکتی ہے　　حیات عرصہ محشر ہے سو رہے ہیں لوگ
خدا کی شان ہر اک غم سے بے نیاز ہوئے　　تمھارے چاہنے والوں میں جورہے ہیں لوگ
ہے یہ بھی خوب کہ داغ اپنے اپنے دامن کا　　مرے ہی اشک ندامت سے دھورہے ہیں لوگ
جلا سکا بھی کوئی جان دے کے شمع وفا　　مری طرح تری محفل میں گورہے ہیں لوگ
میں رورہا تھا تو سب ہنس رہے تھے کیا کہیے　　چلا جو ہنس کے یہاں سے تو رورہے ہیں لوگ
حجاب کرب و اذیت ہوا تبسم لب　　ہے زندگی کا جنازہ جو ڈھورہے ہیں لوگ
شکست فہم کی ہے رشتہ سخن میں گرہ　　یہ کس خیال کے موتی پرورہے ہیں لوگ
غزل کو برقؔ نئی حسیت ملے تو کہو
قلم کی نوک لہو میں ڈبو رہے ہیں لوگ

علی ہے عقل علی عشق انتہا پر لکھ　　یہ نام نام خدا ہے ہر اتبدا پر لکھ
جبین شوق سے سجدوں کو نقش پا پر لکھ　　یہ داستاں محبت نہ یوں ہوا پر لکھ

بس اک نظر میں سراپا کا عکس اتار لیا ‏ سزائے جرم مری چشم بے خطا پر لکھ
غبار اڑتے ہیں انگڑائیوں کا حسن لیے ‏ گلاب کھلتے ہیں کس شوخ کی ادا پر لکھ
اجالا مانگ کے روشن ہے دن ترے رخ سے ‏ فدا ہے تیرہ شبی گیسوئے دوتا پر لکھ
نجانے کب یہ عناصر کا قرض اترے گا ‏ حیات شرم سے پانی ہے جا قضا پر لکھ
پکار اٹھے نہ کوئی سنگ خارا چلتے چلو ‏ کہ صاحب قلم آ میرے دست و پا پر لکھ
قریب ہے کہ ملے شہر بے صدا میں اماں ‏ جو ہو سکے تو مرے حرف مدعا پر لکھ
غور کیا ہے تجلی وجود واجب کی ‏ جو لکھ تو زندگی برق آشنا پر لکھ

رباعیاں

کب ، کون ، کہاں، کس کے لیے کیا کہہ دے
ظالم کو غریبوں کا مسیحا کہہ دے
نگری ہے سیاست کی یہ اے اہلِ نظر
شاباش! اندھیرے کو اجالا کہہ دے

•

آواز میں درد، لے میں غم پنہاں ہے
صدمے جو سہے ہیں وہ الم پنہاں ہے
تڑپا ہوں ستم دیکھ کے انسانوں پر
ہر لفظ میں اک دیدۂ نم پنہاں ہے

•

اک آہ اگر دل سے نکل جاتی ہے
ہو سر پہ مصیبت بھی تو ٹل جاتی ہے
جب فکر و تدبّر ہو رضائے مولیٰ
تدبیر سے تقدیر بدل جاتی ہے

•

وہ نیک بھلا کیسے ہو بد جس کو کہیں
جس حرف پہ ہو، کھینچ دے، مد جس کو کہیں
ہونٹوں کا شفق رنگ تبسّم جل جائے
وہ آگ ہے سینے کی حسد جس کو کہیں

•

ضد، جہل، حسد، بغض، عداوت، کینہ
دل سینے میں عِلّتوں کا ہے گنجینہ
ہے انس عجب نظر کو تاریکی سے
گُم کیوں نہ ہو پھر ترقّیوں کا زینہ

پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ صوبہ بہار میں بیسویں صدی کی وہ پرکشش دلآویز اور ہمہ جہت ادبی شخصیت ہیں جنھوں نے اپنی ذہانت وطباعی سے دنیائے شعروسخن میں اپنی شناخت بنالی ہے۔ ۱۹۳۸ء میں آپ پیدا ہوئے۔ اعلاتعلیم حاصل کرنے کے بعد ۲۳ سال کی عمر میں ہی درس وتدریس کی خدمات انجام دینے لگے۔ تقریباً ۳۸ سال کالج اور یونیورسٹی میں شعروادبیات کا درس دے کر

اب وہ سبکدوش ہو چکے ہیں۔قصیدہ ومثنوی ورباعیات وقطعات،تضمین،نظمیں اور سہرے نیز قطعات تاریخ لکھنے میں وہ بہار ہی نہیں پورے ہندستان میں جانے جاتے ہیں اور اردو کے ساتھ فارسی کے رشتے سے وہ بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔

بہر حال اردو شاعری کی مقبول صنف غزل جناب برقؔ کی بھی پسندیدہ صنف ہے اور اس میں انھوں نے اپنی پروازِ فکر وخیال کا کمال دکھایا ہے۔ برقؔ نہ ترقی پسند تحریک سے منسلک رہے نہ جدیدیوں کے نرغے میں گئے۔ وہ ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی دونوں کے قائل ہیں۔

پروفیسر برقؔ اپنی غزلوں میں عصری آگہی اور نفسیاتی حیثیت کے لحاظ سے ہر دور میں یاد کیے جائیں گے۔اپنی انھیں شعری خصوصیات کی وجہ سے معاصر شعر وادب میں ان کا مقام بلند اور محفوظ ہے۔

○○○

’’اربعین‘‘:ایک مطالعہ

پروفیسر سید وحید اشرف کچھوچھوی

پروفیسر سید محمد طلحہ رضوی برقؔ کی شخصیت کسی تعارف کا محتاج نہیں ان کا ادبی ذوق نہایت پختہ اور انتقادی بصیرت صحت مند ہے۔ وہ اردو و فارسی کی تمام اصناف سخن میں شعر کہنے کی قدرت رکھتے ہیں۔اربعین ان کی لکھی ہوئی منتخب نعتوں کا مجموعہ ہے اور فی الحال اسی پر مجھے کچھ اظہار رائے کرنی ہے۔

اربعین کی نعتوں میں تفکر کے ساتھ جذبہ کا امتزاج وہ نمایاں خصوصیت ہے جو اقبال اور غالب کے کلام میں ملتی ہے۔اس میں قافیہ کی ندرت بھی لطف انگیز ہے کیونکہ یہ محسوس نہیں ہوتا کہ شعر محض قافیہ پیمائی کے لیے کہا گیا ہے۔موجودہ دور میں جدیدیت کے نام پر شاعری کا خون ہو رہا ہے بلکہ اسے نعتوں پر آزما کر نعت گوئی کے آداب سے کھلا ہوا انحراف کیا جا رہا ہے۔اس کی مثالیں میں نے اپنی کتاب ’’اردو زبان میں نعت گوئی کے فن‘‘ میں دی ہیں۔اربعین کی نعتوں میں جدید لہجے نے اسلوب کی پرکشش بنا دیا ہے جو دل کو چھو لیتے ہیں۔

ان مذکورہ خصوصیات نے اربعین کی نعتوں کو وہ اسلوب عطا کر دیا ہے جو نعتیہ شاعری میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔

کتاب اربعین کے مطالعہ سے قاری کو نظر آئے گا کہ کس طرح افکار کے گل بوٹے اس کے صفحات پر کھلے ہوئے ہیں جن سے لطف اندوز ہونے کے لیے غور وفکر کی ضرورت ہے۔ساتھ ہی ان کی تفہیم کے لیے ان میں استعمال کردہ تلمیحات سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ یہاں صرف

ایک شعر کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں جس میں صوفیہ پر ایک عام اعتراض کا جواب مضمر ہے۔ شعر یہ ہے۔

اتصالِ قطرہ و دریا جسے سمجھا گیا
کب ہوا بندہ کوئی یوں اپنے مالک کے قریں

اس شعر سے پہلے درج ذیل شعر کو بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے ۔

دی شبِ معراج وہ رخصت اللہ نے
آپ کے قدموں کے نیچے آگیا عرشِ بریں

شبِ معراج جو قربت محبّ و محبوب میں ہوئی وہ کسی کو نصیب ہوئی نہ ہوگی۔ اس قربت کے باوجود عبد اور معبود کا فرق باقی رہا۔ یہ نہیں ہوا کہ قطرہ دریا میں مل گیا۔ تصوف میں کچھ اصطلاحات ہیں مثلاً فنا فی اللہ، وصال، وحدۃ الوجود وغیرہ۔ اس سے شعرا نے طرح طرح کی حاشیہ آرائی کی۔ مثلاً قطرہ دریا میں مل گیا۔ بندہ کا وجود خدا کے وجود میں فنا ہو گیا اور بعض صوفیہ کے شطحیات سے بھی شاعروں نے اپنی فکر یا بےفکری کو ہوا دی۔ اس لیے اربعین کے شاعر نے کہا کہ جب محبوب ترین اور افضل ترین بندہ سے بڑھ کر کسی بندہ کو قربِ الٰہی حاصل نہیں ہوسکتا تو پھر قطرہ یعنی بندہ دریا یعنی خالق میں کیسے ایک ہوسکتا ہے۔

اربعین کے اشعار غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔ باذوق قارئین اس کے ادبی محاسن کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے رہیں گے جس سے عام قاری بھی مستفید ہوسکیں گے۔ راقم الحروف تو ابھی پوری کتاب کو سرسری طور پر بھی نہیں پڑھ سکا ہے۔ جسمانی توانائی اور دماغی کمزوری تفصیلی بحث کرنے میں مانع ہیں۔ چند اشعار نقل کر کے اس مختصر تحریر کو ختم کرتا ہوں ۔

نبی کی شان میں سوء ادب حبط عمل جانو
یہی وہ معصیت ہے جس کا کفارہ نہیں ہوتا
زمانے کی ہوا مسموم ہے کچھ اس قدر شاہا
کہ اپنی روح سینے میں دھواں معلوم ہوتی ہے

اپنی بداعتدالیاں، سومِ بخت وننگ دیں
روتی ہیں مسجدیں ہمیں ، ہنستا ہے مقبرہ فقط
رنگ و بو نقطوں میں ہے خجلت دہِ فصل بہار
میرا اک اک شعر ہے تحدیثِ نعمت کا گلدستہ
ہوالرزاق والقوۃ ہے معطی اور وہ قاسم
ہے اس کشکول ہستی میں اک اک دانہ محمد کا
یہ چادر زندگی کی برق میلی ہو نہیں سکتی
کہ اس میں تانا ہے اللہ کا بانا محمد کا

برقؔ کو تاریخ گوئی کا بھی ملکہ حاصل ہے۔ کتاب کے آخر میں سات شعر کا قطعہ تاریخ ہے اور لفظ نغمۂ اربعین سے تاریخِ طباعت نکالی ہے جو پرلطف ہونے کے ساتھ طبع رسا کی عکاس ہے۔

افسوس ہے کہ کتاب پر تفصیلی بحث کرنے سے معذور ہوں۔ اور یہ بھی ہے کہ کتاب کے محض سرسری مطالعہ سے اس کے تمام ادبی محاسن کو گرفت میں لانا ممکن نہیں۔

○○○

شاہ طلحہ رضوی برقؔ کی نعت گوئی

علیم صبانویدی

اردو دنیا میں طلحہ رضوی برقؔ کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ یہ نام اردو کے معمولی طالب علم کے لیے بھی شناسا ہے۔ شاعری کی تقریباً تمام اصناف پر آپ کو عبور رہے اور آئے دن رسالوں میں آپ کا کلام پڑھنے کو ملتا ہے۔ سب سے زیادہ جو چیز طلحہ رضوی برقؔ کی قاری پر اثر انداز ہوتی ہے وہ اظہار کی شسگتی اور خیالات کی مہذبانہ ادائے گی ہے۔ لفظیات آپ کے قلم کی پابند ہیں اور موضوع کی ادائے گی میں موصوف کو کسی طرح کی کھینچ تان کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ موضوع آپ خود الفاظ میں ڈھلنے لگتا ہے اور جب شاعری ہوتی ہے تو رنگ و آہنگ کی آمیزش آپ خود ہونے لگتی ہے۔

غزل پر پوری طرح دسترس رکھنے والے طلحہ رضوی برقؔ نے جب نعت گوئی کی طرف دھیان دیا تو غزل کے فارم نے آپ کو سہارا دیا اور غزل کے فارم میں نعت گوئی کو بیشتر شعرا نے موزوں قرار دیا ہے کیونکہ نعتوں میں جمالیتی عنصر بہت زیادہ ہوتا ہے اور عشقِ رسولؐ بھی غزل کی صنف میں بڑی آسانی سے جگہ پا سکتا ہے۔ قوافی اور ردیف کی پابندی کے باعث نعتیں غزل کا مزہ دیتی ہیں اور ان میں بحروں کا تنوع بھی غنائیت کو جگہ دیتا ہے۔ حضور اکرمؐ کی تحمید و ثنا و سلام کو خود رب العالمین نے اپنایا اور ملائکہ کو بھی اس کا حکم دیا اور بندوں پر اسے فرض کیا ہے تو کیوں نہ ایک عاشقِ رسولؐ شاعران کو اپنائے۔ طلحہ رضوی برقؔ کی نعتوں میں مدحتِ رسولؐ بھی ہے اور عشقِ رسولؐ بھی۔ احترام و اکرامِ رسول تو لازمی امر ہے اور حق بات کے کہنے میں بے باکی بھی ہے اور احتیاط بھی۔

چوں کہ طلحہ رضوی برقؔ نے غزل کے فارم میں نعتیں کہی ہیں ان میں غزل کے معشوق کی طرح حضور کو لینے میں طلحہ رضوی برقؔ نے ایک ہلکی سے جنبش کی ہے اور بڑی نزاکت سے اسے غزل کے معشوق سے علاحدگی بخشی ہے۔ یہ احتیاط بہت ضروری تھی۔ چلیے اس قبیل کے چند شعر لیتے ہیں اور ان میں شاعر کی اس ''ہلکی سی جنبش'' کو محسوس کرتے ہیں ؎

تڑپنا بھی فراقِ دوست میں لذت کا باعث ہے
یہی اک روگ تو لگ کر کبھی اچھا نہیں ہوتا

اس شعر میں غزل کے دیگر اشعار کے قوافی کے درمیان یہ شعر نعت کا شعر بنتا ہے دیگر قوافی ہیں ''قاب قوسین او ادنی''، 'یٰس وطہٰ، محمد کا'، وغیرہ۔

اسی نعت کا ایک اور شعر بھی سنیے ؎

کہاں پھر چھیڑتا مضرابِ غم یہ نغمۂ الفت
دلِ بسمل کا سینے میں جو اکتارا نہیں ہوتا

دیگر نعتوں میں بھی اسی طرح کے اشعار آئے ہیں ؎

ترے جلوں کے تصور کا ہی فیض ہے کہ یہ دل — ہے وہ آئینہ شکستہ نہ ہوا، نہ ہے، نہ ہوگا
سرخ آنسوؤں کو ہجر میں صہبا بنا دیا — آنکھوں کو جام قلب کو مینا بنا دیا
خواہش کی چاندنی سے تمنا کی دھوپ نے — اک ظرفِ نقرئی کو مطلاّ بنا دیا
اللہ رے خونِ حسرت و ارماں کی دلکشی — زخموں کو روکشِ گل و لالہ بنا دیا
دیکھتے ہی ان کا دیوانہ مجھے کہہ دے کوئی — ایسا بھی اے ضبطِ غم اک بار ہونا چاہیے

مگر نعتوں کے درمیان یہ جب آتے ہیں تو ان میں نعتیہ موضوع آپ خود چھلک آتا ہے۔

چند اشعار میں طلحہ رضوی برقؔ نے علویتِ خیال کو جگہ دی ہے ان میں ذیل کے اشعار ایک خاص ڈھنگ کی مدحت کو جگہ دیتے ہیں ؎

سنگِ اسود بوسہ گاہِ ختمِ پیغمبرؐ بنے — دل یہ کہتا ہے کہ چوما سنگ نے لب آپؐ کا

خود وجودِ مہ و خورشید ہے صدقہ انؐ پر   نور کا چاندنی یا دھوپ میں سایہ ہوتا
قبر میں ہوگا نصیب انؐ کی زیارت کا شرف   ہے یہ حسرت کہ کئی بار میں پیدا ہوتا
برقؔ کی مٹی سوارت تھی اگر پس کے یہ دل   ان کے قدموں سے لگی خاک کا ذرّہ ہوتا
ہے داغِ عشق سے دل اشرفیّوں کا وہ گنجینہ   میسّر قدسیوں کو بھی جو سرمایا نہیں ہوتا
وہ نور چھن رہا تھا جو قندیل عرش سے   ارض و سما کی آنکھ کا تارا بنادیا
ہے دل پہ نسبتِ چشتی کی ضرب الاالله   اب اپنے نام کی سرکار آبرو رکھنا
یہ چادر زندگی کی برقؔ میلی ہو نہیں سکتی   کہ اس میں تانا ہے اللہ کا بانا محمد کا
یہ ماینطق سے ہوا صاف ظاہر   کلامِ خدا ہے کلامِ محمدؐ
دفترِ کائنات میں مصحفِ ناطق آپؐ ہیں   متنِ حقیقت اک یہی اور تو حاشیہ فقط
خونِ دل صرف ازپئے اشعار ہونا چاہیے   نعت گو کو حاملِ ایثار ہونا چاہیے

طلحہ رضوی برقؔ نے اپنے ایک شعر میں یہ اطلاع دی ہے کہ آپ کا تعلق سلسلۂ چشتیہ سے ہے اوراس کے بعد یہ گمان جاتا رہا کہ طلحہ صاحب نے اشعار میں محض دیگر شعرا کی طرح تک بندیوں سے کام لیا ہے۔ کیونکہ جو آدمی سلاسلِ اربعہ میں سے کسی سے بھی منسلک ہوتا ہے اس میں عشقِ رسولؐ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے اوراس کی کہی ہوئی باتوں میں صدق ہے، عشق ہے، ایثار ہے، احترام ہے اورسب سے بڑھ کر حضورؐ کی ذاتِ برکات کا صحیح عرفان ہے۔ان کے اشعار میں ایک دم ہم کو نور ہی نور لگنے لگا ہے اور از سرِ نو ان کی نعتوں پر نظر گئی اوران کے ہر شعر میں ایک نہ ایک زاویہ سے حضورؐ کی شان میں مدحت ملی، التجا ملی، ان کی ذات کے آگے شاعر کی خاکساری ملی اورسب سے بڑھ کر حضورؐ سے امیدِ شفاعت کی پختگی ملی۔

(''جہانِ نورِ محمدیؐ:ص ٦٦)

○○○

حضرت برقؔ کی نعت گوئی

ڈاکٹر امجد رضا امجد

اردو کے ساڑھے تین سو سالہ سرمایہ پر نظر ڈالیں تو اس صداقت پر ایمان لانا ہی پڑے گا کہ اردو میں نعتیہ ادب کی عمر اتنی طویل ہے جتنی خود اردو زبان وادب کی ۔اردو کے ابتدائی اور قدیم دکنی سرمائے میں مولودنامے، معراج نامے، نورنامے، معجزے اور شمائل نامے وغیرہ کی یافت اس کی واضح دلیل ہے۔مگر اتنی طویل مسافت طے کرنے کے بعد بھی صنف نعت کو وہ مقام نہیں مل سکا جس کی وہ مستحق ہے۔

آج مذہب کے حوالے سے معرض وجود میں آنے والے ادب پارے کو صرف اس لیے گردن زدنی قرار دے دیا جاتا ہے کہ وہ محض ادب برائے ادب کا حامل نہیں ہوتا بلکہ ادب کے ساتھ مذہبی قدروں کی جمالیات بھی اپنے جلو میں لیے ہوتا ہے۔فن شاعری کی سب سے قدیم، پاکیزہ اور کثیر الجہت صنف نعت بھی ناقدین فن کے اسی منفی نظریے کا شکار ہوئی اور بہانہ یہ تراشا گیا کہ صنف کے لیے ہیئت کا ہونا ضروری ہے اور نعت کی کوئی متعینہ ہیئت نہیں اس لیے اسے صنف سخن کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔حالانکہ حق وصداقت کے پیمانے سے اگر دیکھا جائے تو کہنا پڑے گا کہ نعت کا تعین ہیئت کی شرط سے آزاد ہونا ہی تمام اصناف سخن میں اسے ممتاز کرتا ہے۔ یہ صنف نعت کا ہی اعجاز ہے کہ وہ ادب کی ہر ہیئت، غزل، قصیدہ، مثنوی، قطعہ، رباعی، مخمس، مسدس، ہائیکو، سانیٹ اور ماہیے کو اپنے اندر جذب کرنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔کسی ایک ہیئت میں مقید ہونا نعت کے لیے مناسب نہیں تھا۔اس کا تعلق جس ذات گرامی سے ہے وہ لامحدود صفات کی حامل ہے۔اس لیے اس کی توصیف کے لیے محدود ہیئت درست ہو ہی نہیں سکتی تھی اور جس طرح

اردو زبان ہر زبان، بھاشا اور بولی کی لفظیات کو اپنے اندر ضم کر کے اپنی شناخت عطا کر دیتی ہے اسی طرح نعت بھی ہر صنف کی ہیئت کو قبول کر کے اپنا لیتی ہے۔ پھر صنف کے لیے محض ہیئت کا ہونا ہی ضروری نہیں بلکہ موضوعاتی اعتبار سے بھی صنف کا تعین ہوتا ہے اور نعت اپنے وسیع موضوعات کے اعتبار سے اس کی متقاضی ہے مگر ناقدان فن اور ارباب فکر ونظر نے اس کے ساتھ غیریت کا برتاؤ کیا۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ اتنے لمبے عرصے کے بعد بھی دیگر اصناف سخن کی بہ نسبت تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی نقطۂ نظر سے صنف نعت پر اس کے شایانِ شان کام نہیں ہوا۔ صرف نو کتابیں اب تک اس موضوع پر سامنے آسکیں۔ اشاعت کے اعتبار سے سب سے پہلی کتاب طلحہ رضوی برق کی ہے۔ انھوں نے اردو میں نعتیہ شاعری کے عنوان سے ایک تاریخی اور تحقیقی کتاب جنوری ۱۹۷۴ء میں شائع کی پھر اس موضوع پر بالترتیب مندرجہ ذیل کتابیں منظر عام پر آئیں:

اردو کی نعتیہ شاعری	ڈاکٹر فرمان فتح پوری لاہور ۱۹۷۴ء
اردو میں نعتیہ شاعری	ڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق کراچی ۱۹۷۶ء
اردو نعت: تاریخ وارتقاء	سید افضال حسین نقوی فتح پوری کراچی ۱۹۸۹ء
اردو نعت گوئی	ڈاکٹر ریاض مجید لاہور ۱۹۹۰ء
اردو شاعری میں نعت گوئی	ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی گیا، بہار
اردو شاعری میں نعت (دو جلدیں)	اسمٰعیل آزاد فتح پوری لکھنؤ ۱۹۹۲ء
فی احسن تقویم	جاوید احسن جان ڈیرا غازی خان ۱۹۹۷ء

ان میں ڈاکٹر رفیع الدین اشفاق کی کتاب ''اردو میں نعتیہ شاعری'' ان کی پی۔ ایچ۔ ڈی کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر ناگپور یونیورسٹی نے ۱۹۵۵ء میں انھیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ غالباً نعت کے موضوع پر یہ پہلی پی۔ ایچ۔ ڈی ہے مگر اس کی اشاعت ۱۹۷۶ء میں کراچی سے ہوئی۔

اردو کے نعتیہ سرمائے میں ہمیں دو طرح کی نعتیں ملتی ہیں۔ ایک رسمی دوسری حقیقی۔ اردو نعت گوئی میں رسمی نعت گوئی کی بہتات ہے۔ عزت وشہرت، تقاضائے مصلحت اور جاہ طلبی کے لیے

کہی گئی نعتوں کا بھلا اس حقیقی نعت سے کیا علاقہ جو صحابہ کی سنت اور صوفیہ کا وظیفہ رہی ہے۔ جو دماغ کی نہیں روح کی شاعری ہوتی ہے جہاں الفاظ محض جذبات کا اظہار اور سوز دروں کی ترسیل کا کام دیتے ہیں بازی گری کا نہیں۔ مگر اس حقیقت کے باوصف ہماری نعتیہ شاعری کا وافر حصہ اسی رسمی نعت گوئی پر مشتمل ہے جو بغیر وضو کے پڑھی گئی نماز کی طرح ہے۔

اس تناظر میں اگر ہم پروفیسر طلحہ رضوی برق کے نعتیہ سرمائے کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ان کی شاعری رسمی آلودگی سے آزاد اور صداقت کے عناصر سے مملو ہے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کے صحیفۂ غم کی تفسیر، ان کے جذبات کے منظر نامے اور ان کے قلبی واردات کے تجسیمی پیکر ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کو آفاقی اور موثر بنانے کے لیے درد وغم اور سوز واضطراب کی داخلی کیفیات کو کہیں باہر سے مستعار نہیں لیا ہے بلکہ اپنی ہی کشش عشق سے ان لوازمات عشق کی کاشت کی ہے اور اسے اپنی شاعری کا لازمی عنصر بنایا ہے۔ پروفیسر عنوان چشتی لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر طلحہ رضوی برق اردو کے ان مخلص اور ممتاز شاعروں میں شامل ہیں جن کی شخصیت ادب، تہذیب اور تصوف کا حسین پیکر ہے۔ ان کی تربیت میں حضرت علامہ قتیل دانا پوری کی دعائیں اور نیک تمنائیں بھی شامل ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری میں وہی غنائیت اور رنگ معرفت ہے جو ان کی شخصیت کا جوہر ہے''۔

جناب طلحہ رضوی برق کا شجر علم بہت بلند ہے۔ اردو فارسی زبان وادب پر تو انھیں کامل دسترس ہے ہی ان کے نعتیہ اشعار اور تحقیقی وتنقیدی مقالات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علم کا رشتہ عربی زبان سے بھی جڑا ہوا ہے۔ ان کی علمی مصروفیات اور فکری ہمہ جہتی کا اندازہ ان کی مندرجہ ذیل خدمات سے لگایا جا سکتا ہے:

(۱)	کلیات سخن محمودہ	تدوین دیوان نعت بی بی محمودہ خاتون
(۲)	تجلیات قتیل	علامہ قتیل داناپوری کی 'اردو غزلیات کی تدوین ومقدمہ

(۳) خورشید سحر — علامہ قتیل کی فارسی غزلیات کا مجموعہ مع مقدمہ
(۴) اردو کی نعتیہ شاعری — نعت کے موضوع پر ایک تحقیقی مقالہ
(۵) غور وفکر — تنقیدی مضامین کا مجموعہ
(۶) نقد وبخش — تنقیدی مضامین کا مجموعہ
(۷) شاہ اکبؔر داناپوری: حیات وخدمات۔ — پی ایچ۔ڈی۔تھیسس
(۸) شائگان — اردو غزلوں کا مجموعہ
(۹) ارزشِ ادب — مضامین کا مجموعہ
(۱۰) شہابِ سخن — اردو فارسی رباعیات کا مجموعہ
(۱۱) چہل قطعۂ تاریخ — فارسی قطعات کا مجموعہ

اور بھی وہ کتابیں جو تشنۂ طبع ہیں ان میں:

(۱) ڈی لیٹ کا فارسی مقالہ۔عرفاء فارسی گوے بہار مخصوصاً سجادہ نشیں ودارائے خانقاہ
(۲) صد قطعات تاریخی۔ بہ زبان فارسی
(۳) اربعین۔مجموعہ نعت اردو
(۴) آئینۂ تصوف۔اردو
(۵) قاموس تاریخ گوئی اردو
(۶) تذکرۂ شعرائے داناپور

علاوہ ازیں فارسی زبان میں لکھے گئے متعدد مقالے بھی ان کی عظمت فکر اور قدرت زبان کا مظہر ہیں جو مجلّہ بیاض دہلی ،معارف اعظم گڈھ، ماہنامہ دانش اسلام آباد، نامہ فرہنگ تہران اور قند پارسی نئی دہلی میں شائع ہوتے رہے۔

روحانی اعتبار سے بھی آپ کی شخصیت بڑی مقناطیسی، جاذب نظر اور قابل تقلید ہے۔ زندگی کا ہر پہلو سنت رسول کا آئینہ دار اور محبت کے زخموں سے لالہ زار نظر آتا ہے۔ہم نے انھیں وارفتگی شوق میں نعت پڑھتے اور نعت سن کر مچلتے اور بلکتے بھی دیکھا ہے۔عشق کا یہ انداز آج کے

اردو نعت گو شعرا کے یہاں خال خال ہی نظر آئے گا۔ان کی شاعری میں یہ عناصر بنیادی مواد کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔اس لیے ماننا پڑتا ہے کہ ان کی شاعری حقیقی شاعری ہے رسمی نہیں۔

نعت گوئی ان کے نزدیک عبادت بھی ہے اور دل مبتلائے غم کے لیے سامان راحت بھی۔ وہ اسی جذبے سے نعت کہتے ہیں اور اسے توشۂ آخرت سمجھ کر خونِ دل تک صرف کرنا اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔مگر اپنے جذب دروں کو شعری آہنگ عطا کرتے وقت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی کے معیار کو سامنے ضرور رکھتے ہیں۔امام احمد رضا کو اردو کا سب سے بڑا نعت گو شاعر تسلیم کیا گیا ہے۔وہ فرماتے ہیں ؎

ہوں اپنے کلام سے نہایت محظوظ
بے جا سے ہے المنۃ للہ محفوظ
قرآن سے میں نے نعت گوئی سیکھی
یعنی رہے احکام شریعت ملحوظ

اور برقؔ یہ تعلیم دیتے ہیں ؎

شوق نعت سید ابرار ہونا چاہیے
سامنے قرآن کا معیار ہونا چاہیے
خون دل صرف از پئے اشعار ہونا چاہیے
نعت گو کو حاملِ ایثار ہونا چاہیے

اور قرآنی آیات سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

وتعزروہُ دیکھو وتوقروہ سمجھو
مری نعت ہے عبادت یہ فقط ہنر نہیں ہے
ہے ثنائے مصطفیٰ ہی مجھے توشہ آخرت کا
لکھو برقؔ خونِ دل سے اگر آب زر نہیں ہے

ان کی نعتیہ شاعری میں قرآنی تلمیحات اور احادیث کے اشارے کثرت سے ملتے ہیں۔انھوں نے جس خوبصورتی ، زبان کی صفائی اور شائستگی سے قرآنی آیات اور احادیث کی عبارتوں کو اپنے مصرعوں کا جزو بنایا ہے اس سے ان کی قادر الکلامی، فنی مہارت اور اسلامی ماخذ سے معرفت کا اظہار ہوتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کریں ؎

پڑھی آیت قاب قوسین جس دم
ہوا دل پہ روشن مقام محمدؐ
یہ ما ینطق سے ہوا اوصاف ظاہر
کلام خدا ہے کلام محمدؐ
لگی صبح ازل مہر یداللہ فوق ایدیھم
سند یہ دستگیری کی ید پیر مغاں تک ہے

ابوالقاسم محمد ابن عبداللہ صلی اللہ　　فدا ان پر مرے ماں باپ میرا خاندان تک ہے

یہی کیفیت ان کی نعتیہ رباعی کی بھی ہے۔انھوں نے جس صفائی کے ساتھ رباعی جیسی مشکل صنف میں معجزات اور آیات قرآن واحادیث کو پیش کیا ہے اس کی مثال شاید ہی کہیں ملے۔ اس خصوص میں اس دور میں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔اس تناظر کی چند رباعیاں ملاحظ کریں ۔

ہے حکم خدا درود ہر دم پڑھیے　　جتنا ممکن ہو بیش و کم پڑھیے
آجائے زباں پہ جب کبھی نامِ نبیؐ　　صلی اللہ علیہ وسلم پڑھیے

محبوب اِلٰہ مالک یوم الدین　　اے صاحب مزمّل و طٰہٰ یٰسین
ایماں تو یہ ہے کہ نبی آپ ہوئے　　آدم بھی تھے جب میانِ ماء والطین

ہیں رحمت عالمین اتری جن پر　　نصّ انّا اعطیناک الکوثر
طائف میں ستم سہہ کے بھی خاموش رہے　　اللھم اھد قومی کہہ کر

حق یہ ہے کہ حق مومن بیباک کہے　　معصوم نبی کو آل کو پاک کہے
اللہ ری وہ ذات جسے رب قدیر　　لولاک لما خلقت الافلاک کہے

طلحہ رضوی برقؔ کی مشکل پسندی مشہور ہے۔وہ اپنی کتابوں کے نام بھی ایسے الفاظ سے ترتیب دیتے ہیں کہ بقول ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی جس کو سمجھنے کے لیے ''ڈکشنری سے مدد لینا پڑے یا کسی ماہر زبان کی طرف رجوع کرنا پڑے''۔ ہوسکتا ہے کہ انتخاب الفاظ کی حد تک ان کی بات صحیح ہو مگر قرآنی تلمیحات سے ناآشنائی کے سبب ان پر مشکل پسندی کا الزام قطعاً غلط ہوگا۔ہاں ان کی شاعری میں جابجا قوافی ایسے استعمال ہوتے ہیں جو قاری اور سامع کی توجہ فوری طور پر اپنی طرف مبذول کرلیں۔ان قوافی کی عجب شان ہوتی ہے جس میں تنوع کا اک جہان آباد ہوتا ہے۔

غزل ہو یا نعت، رباعی ہو یا اور کوئی صنف ان کی قافیہ پیمائی کا اندازہ ہوتا ہے۔اس تعلق سے چند اشعار دیکھیں جہاں قافیے کا آہنگ کس طرح ہمارے انفاس کو موسیقیت بخشتا ہے ۔

عشق صادق ہو تو بن جاتی ہے کلفت راحت　　آکے پتھر تہِ پا روئی کا گالا ہوجائے
نہ ہوا ہے نہ کبھی ہوگا نگوں حق کا علم　　غیر ممکن ہے تعالیٰ کا امالہ ہوجائے
میں اسیر دشت ملال ہوں غم صد گہنہ سے نڈھال ہوں　　دیا شامیانۂ عفو جب نگہِ کرم کی قنات دے
غم عشق میں نبی کے تروتازہ ہے ہمیشہ　　دل داغدار میرا گل نیلوفر نہیں ہے
نہیں ہوتا خدا کا جو محمد کا نہیں ہوتا　　نہیں ہوتا نہیں ہوتا ارے بابا نہیں ہوتا

اور فکری پرواز کے ساتھ عشق کا کیا نرالا انداز پیش کیا ہے ۔

دل ہوا ہے سینے میں روضہ جمال یار کا　　سر کو گنبد ہاتھ کو مینا ہونا چاہیے
ہوں لحد میں خوش کہ ان کے شربت دیدار سے　　چشم روزہ دار کا افطار ہونا چاہیے

ان کی ایک نعت ہے جس کی ردیف ہے''کچھ بھی نہیں'' جس میں مضامین کے تنوع کے ساتھ تصوف کا رنگ اپنے جوبن پر ہے اور کچھ بھی نہیں کی تکرار نے ایک موسیقیت سی پیدا کردی ہے۔ملاحظہ کیجیے ۔

ماسوا اللہ بجز نور مبیں کچھ بھی نہیں　　آسماں کچھ بھی نہیں ہے یہ زمیں کچھ بھی نہیں
پرتو روئے منور سے مہ ومہر خجل　　رشک صد یوسف کنعاں سے حسیں کچھ بھی نہیں
ناصیہ فرسا ہوں دن رات جہاں جن و ملک　　اسی در قدس پہ طلحہ کی جبیں کچھ بھی نہیں

طلحہ رضوی برقؔ کو حج بیت اللہ کی سعادت اور روضہ رسول میں حاضری کا شرف بھی حاصل ہے۔اس حاضری سے پہلے اور حضوری کے بعد فراق وہجر کے جو لمحے گزرے ہیں وہ ان کی نعتیہ شاعری کا قیمتی جزو بن گئے ہیں۔ان کے اس حزنیہ لے میں ایک خاص کیفیت ہے جو ہماری روح کو بھی سرشاری کی کیفیت سے ہم آغوش کردیتی ہے۔وہ جنت کے بجائے سگ تسمہ دار بن کر دیوانہ وار مدینے میں پھرنا اپنی معراج سمجھتے ہیں اور نزع کے وقت آنکھوں کے سامنے گنبد خضریٰ کے طالب اور ہونٹوں پر نام پاک احمد مختار کے خواہش مند ہیں۔

طلحہ رضوی برقؔ کی نعتیہ شاعری میں فکری بلندی، ندرت مضامین، شوکت الفاظ، زور بیان اور جدت ادا کے ساتھ عشق کی سرمستی و جاں سپردگی سب کچھ موجود ہے۔ وہ غزل کی طرح نعت کے بھی کامیاب اور قادرالکلام شاعر ہیں۔ انھوں نے تقریباً تمام مروّجہ ہیئتوں میں نعت کہی ہے اور شعری و شرعی اعتبار سے کہیں ٹھوکر نہیں کھائی۔ ویسے ان کی نعتیہ شاعری کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ کلی طور پر ان کے نعتیہ مجموعہ اربعین کی اشاعت کے بعد ہی ہوگا۔ سردست جو کچھ بھی میں نے عرض کیا ہے وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ ان کی نعتیں ہمارے ادبی سرمایے میں گراں قدر اضافہ ہیں۔ انھوں نے نعت کہہ کر جہاں اپنے لیے توشہ آخرت مہیا کیا ہے وہیں ہماری ادبیات کو بھی ادبی اور مذہبی جواہر پاروں سے مالا مال کیا ہے ؎

یارب آں غنچہ خنداں کہ تو دادی بہ منش
می سپارم بہ تو از چشم حسودی چمنش

OOO

اردو کی نعتیہ شاعری:
از ڈاکٹر طلحہ رضوی برق

پروفیسر شفقت رضوی

اردو کی نعتیہ شاعری کے بارے میں شائع ہونے والی پہلی کتاب (ہماری معلومات کے مطابق) ڈاکٹر طلحہ رضوی برق کی ہے جو نہایت مختصر ہے اور صرف ۹۶ر صفحات پر مشتمل ہے اور جنوری ۱۹۷۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ حرفِ آغاز پر تاریخ ۱۹ر شوال المکرّم ۱۳۹۳ھ درج ہے۔ مصنف کی صراحت کے مطابق:

''تقریباً چھے سال ہوئے حضرت علامہ ارشدالقادری صاحب مدظلہ نے اپنے رسالہ ''جام نور'' کے لیے مجھے ''اردو کی نعتیہ شاعری'' پر ایک مضمون لکھنے کا حکم دیا۔ تعمیلِ ارشاد میں بہ عجلت ایک سرسری مضمون لکھ کر روانہ کر دیا جو شائع بھی ہو گیا مگر اس مضمون کی تشنگی کا احساس برابر ہوتا رہا۔ فرصت ملی تو اس مضمون کو کچھ بسط دینے کی کوشش کی جوں جوں لکھتا رہا اس قلزم ذخار و بحر ناپیدا کنار کی وسعت کا اندازہ ہوا بالآخر اپنے عجز کے شدید احساس نے اس تحریر کو گویا نامکمل ختم کرنے پر مجبور کر دیا۔ احباب کے مشورہ و اصرار پر اب یہ سرمایہ کتابی شکل میں پیش ناظرین ہے۔''

(ڈاکٹر طلحہ رضوی برق: حوالہ مذکورہ ص ۴)

کتاب کیا ہے ایک مضمون کی تفصیلی شکل ہے جو کتابی صورت میں شائع ہونے کے باوجود احساس دلاتی ہے کہ اسے ایک مضمون باور کرتے ہوئے پڑھا جائے۔ خود مصنف کو اعتراف

ہے کہ وہ موضوع کی وسعت کی قائل ہیں لیکن اس کا جامع احاطہ کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ اس کے باوجود کتاب کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ایک ایسے موضوعِ سخن پر جس کا رواج کئی صدیوں پر محیط ہے اور جس کی حیثیت و اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے اس کے تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی جائزے کی جانب توجہ کرنے کی کوشش تو کی گئی۔ اسے ہم ایک انفرادی کاوش کا نام دے کر گزر جانے کو ادبی بددیانتی سمجھتے ہیں۔ ہماری نظر میں یہ کتاب ایسی مدہم لَو ہے جس سے خوب روشنی دینے والے چراغوں کو روشن کرنے کی روایت نے جنم لیا۔ اگر جامع اور بسیط کتاب منظر عام پر آجائے تو موضوع سے دل چسپی رکھنے اور اس پر اظہار خیال کرنے کا ولولہ محسوس کرنے والوں کے لیے لکھنے کا کوئی موقع باقی نہیں رہتا۔ اگر ایسی صورت میں کوئی کوشش بھی کرتا ہے تو وہ نقل ہی کرتا ہے البتہ ہنرمندی، فن کاری، خلوص نیت اور اپنی محدود صلاحیتوں اور وسائل کے باوجود قابل توجہ تحریر سامنے آتی ہے تو وہ شوق کو مہمیز کرتی ہے، لوگوں کو عزائم کی صورت دیتی ہے، خواہش تکمیل کار پر مائل کرتی ہے۔ جو کتاب موضوع سے دل چسپی پیدا کرے اور کام کو آگے بڑھانے کا حوصلہ عطا کرے اس کی اہمیت مابعد کی تکمیلی شکل سے کم نہیں ہوتی۔ اہلِ علم کے اور بعد کے لکھنے والوں نے ڈاکٹر طلحہ کی کتاب کا ذکر کیا ہو یا نہیں، اس سے مستفیض ہونے کا اقرار کیا ہو یا نہیں، علم کے جویا اور علم کے قدردان اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے ہوں گے۔

ڈاکٹر طلحہ رضوی کی شخصیت کو متعارف کروانے کی کوئی کوشش یا تو کی ہی نہیں گئی یا کم از کم میرے علم میں نہیں ہے۔ میں اپنی اس کتاب کے ذریعہ پہچان پایا ہوں اور یہ کہنے میں حق بجانب محسوس کرتا ہوں کہ وہ اہلِ علم بھی ہیں اور اہلِ جذب بھی اگر کسی رسالہ کے مدیران سے اردو نعت پر لکھنے کی فرمائش کی تو یقیناً وہ ان کے علمی مرتبہ اور بالغ النظری کے قائل رہے ہوں گے۔ ہم ان کے مرتبہ شناس ان کی تحریر سے ہوئے ہیں۔ وہ اردو کے علاوہ فارسی اور عربی پر عبور رکھنے کی تحریری شہادت کے ساتھ کتاب میں جلوہ گر ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے کہ انھوں نے عربی، فارسی، دکنی اردو نعتوں کا کمالِ واقفیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ موضوع کی وسعت کو دیکھتے ہوئے خیال ہوتا ہے کہ انھوں نے بیان کو پھیلانے کے بجائے سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ طوالت نگاری سے

بچنے اور اختصار میں جامعیت کو سمونے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر طلحہ رضوی اس کتاب کے ذریعہ محقق اور مبصر کے طور پر بھی سامنے آئے ہیں۔ ان کی تحقیق کے مطابق عربی میں پہلا قصیدہ میمون بن قیس سے منسوب ہے اور عربی زبان کا شعری ادب نعتیہ شہ پاروں سے بھرا ہوا ہے (ص ۷) انھوں نے مذکورہ زبانوں میں نعت کے مضامین کی وسعت کا بھی ذکر کیا ہے کیونکہ وہ معترف ہیں کہ ''ہیئتی طور پر بھی یہ صنف شاعری غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی، قطعہ، مربع، مخمس، مسدس، ترجیع بند، ترکیب بند، مستزاد حتیٰ کہ آزاد و معرا پیکروں میں بھی موجود ہے''۔ (ص ۵) یہ صرف دعوا نہیں اس کی شہادت کے طور پر انھوں نے کلام کے نمونے پیش کیے ہیں۔ نعت کے موضوعات کو اختصار سے بیان کیا ہے تب بھی وہ دو صفحات (ص ۲۳، ۲۴) پر محیط ہیں۔ یہ ایسے عنوانات ہیں جو عام طور پر شعرا کے پیشِ نظر رہے۔ تخلیق کار کی بساط کے مطابق ان میں بے پایاں اضافہ کی گنجائش موجود ہے۔ مصنف نے بلحاظ ہیئت بھی نعت گوئی کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے اور تاریخی اعتبار سے بھی۔ جب وہ تاریخ وار جائزہ لیتے ہیں تو ادوار کا تعین نہیں کرتے اور نہ ہر دور کی خصوصیات گنواتے ہیں۔ تحقیق کی روایت کے مطابق ان کا تاریخ وار جائزہ دکنی شعریات سے شروع ہوا ہے اور وہ بھی ہمارے ہم خیال ہیں کہ ''کدم راؤ پدم راؤ'' کو اردو کی تصنیف شمار نہ کریں۔ انھوں نے واضح طور پر لکھا ہے کہ:

> ''دکن میں بہمنی دورِ حکومت کے شاعر فخر الدین نظامی کی مثنوی ''کدام راؤ پدم راؤ'' کا زمانہ تصنیف ۸۲۵ھ سے ۸۳۸ھ تک قیاس کیا جاتا ہے۔ اسے اردو کی ابتدائی اور قدیم تر تصنیف کہا گیا ہے مگر حقیقتاً اس کی زبان ٹھیٹھ قسم کی ہندی ہے۔ رسم الخط اور اردو میں مروجہ ایک دو لفظ کے ملنے سے اس زبان کو اردو کہنے میں مجھے تامل ہے۔'' (ص ۲۵)

ڈاکٹر طلحہ کو جس امر میں تامل ہے راقم الحروف کو بھی اس میں تامل ہے لیکن فی الحال یہ بحث کا موضوع نہیں ہے۔

دکنی شعریات کے حوالے سے مصنف نے کئی مثنویوں کے حوالے دیے ہیں جن میں

نعت شامل ہے مثلاً اشرف (نوسرہار) خوب محمد چشتی (امواج خوبی، خوب ترنگ) ملا وجہی (قطب مشتری) نصرتی (علی نامہ) کی مثنویاں۔

انھوں نے مثنویوں کے بعد ''معراج ناموں'' پر روشنی ڈالی ہے جس کا دکن میں رواج عام تھا اور ''معراج نامہ'' کی مقبولیت نے اسے الگ سے ایک صنفی حیثیت عطا کردی تھی یہاں تک کہ سیرت و اخلاق رسول کے بیان میں ''نورنامے، مولودنامے اور وفات نامے نظم ہونے لگے اور اسے بھی بے حد مقبولیت حاصل ہوگئی'' (ص۲۹) اس تمہیدی بیان کے بعد انھوں نے تاریخی ترتیب میں معراج ناموں کا ذکر کیا ہے جن میں ہاشمی بیجاپوری، اعظم دکنی، محمد بن مجتبیٰ شاہ کمال الدین، سید بلاقی، معظم بیجاپوری، مختار لچھمی نرائن، شفیق قرنی بیجاپوری، فتاحی کے معراج ناموں کا بالترتیب ذکر کیا ہے وہ فتاحی کو گیارہویں صدی ہجری کے آخر کا شاعر قرار دیتے ہوئے ''مولودنامہ'' کی ایجاد کا سہرا اس کے سر باندھتے ہیں۔ نعت کے لیے قصیدہ اور غزل کی شکل اس زمانہ میں رائج ہوئی ''فدی خاں فدوی اور مہر محمد شریف مفتوں اورنگ آبادی نے غزل اور قصیدہ کے فارم میں نعت گوئی شروع کردی'' (ص۳۳) جس دور میں دکن میں نعت کی مختلف ہیئتیں رائج ہی نہیں بلکہ مقبول بھی تھیں اس زمانہ میں شمالی ہند میں شاہ مبارک آبرو، شرف الدین مضمونؔ، شاکر ناجی، محمد احسن احسنؔ، مصطفیٰ یک رنگ، سراج الدین آرزو، اشرف فغاں شاعری کررہے تھے۔ ان سب کے کلام میں ڈھونڈنے سے نعتیہ اشعار مل جائیں گے مگر فنی طور پر اہل دکن کی طرح ان حضرات نے نعت گوئی نہیں کی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ شمالی ہند کی شاعری کو معیار قرار دے کر تاریخی اور تحقیقی کتابیں لکھی گئیں چونکہ وہاں نعت گوئی عام نہیں تھی اس لیے اس صنف کے ذکر سے اجتناب برتا گیا اور چونکہ نعت کی متعدد ہیئتوں سے شمالی ہند کے لوگ واقف نہیں تھے اس لیے ادبی تواریخ مولودناموں، نورناموں، معراج ناموں، وفات ناموں کے ذکر سے خالی ہیں۔ نعت کے موضوع پر جو کتابیں پچھلی ربع صدی میں منظر عام پر آئی ہیں ان میں بھی ڈاکٹر طلحہ کی طرح خاص توجہ سے ان اصناف کے بارے میں تحقیق سے گریز ملتا ہے۔

ڈاکٹر طلحہ نے دکنی شعریات کا بڑی حد تک احاطہ کیا ہے۔ شاعروں کے مختصر احوال کے ساتھ نعتیہ اشعار کے نمونے بھی پیش کیے ہیں مگر تنقید و تبصرہ سے گریز کیا ہے۔ اس طرح ان کی کتاب کے اکثر حصے تذکرہ نگاری کے وصف سے آگے نہیں بڑھ سکے ہیں۔

شمالی ہند میں پہلے قابلِ ذکر نعت گو کی حیثیت سے مصنف نے سودا کا ذکر کیا جن کا ۴۸ اشعار پر مشتمل قصیدہ مشہور ہے:

> ''اس قصیدے کو شمالی ہند میں اردو کی نعتیہ شاعری کا ابتدائی نمونہ کہا جاسکتا ہے۔ قصیدے کی شان، الفاظ کا شکوہ اور بیان کا زور ایک ایک شعر سے ظاہر ہے'' (ص۳۴،۳۵)

مصحفی کے استادانہ رنگ کے قصائد کے بعد سب سے جاندار اور شاندار نعت نظیر اکبرآبادی کی ہے جو خمسہ کی صورت میں ہے، نعت کیا ہے جذبات اور ہم آہنگ الفاظ کا بہتا دریا ہے۔ ڈاکٹر طلحہ نے انھیں زبردست خراج تحسین دے کر حق شناسی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ انھوں نے اس کے بعد کے ادوار کا جائزہ لیتے ہوئے کسی قابل ذکر شاعر کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ نعت گو کی حیثیت سے دیگر مصنفین نے حسرت موہانی اور جوش ملیح آبادی کا ذکر نہیں کیا ہے جبکہ ڈاکٹر طلحہ ان کو بھی اس صنف کے خدمت گزاروں میں شامل کرتے ہیں۔ جوش کی نعت گوئی کے بارے میں ان کا تبصرہ وہی ہے جو مجموعی طور پر جوش کی شاعری پر کیا جاسکتا ہے۔ یعنی:

> ''جوش ملیح آبادی اپنے اسلوب و آہنگ کے لحاظ سے منفرد ہیں مگر ان کے یہاں لفظوں کے طمطراق، شوکت الفاظ، زور بیان اور علوے تخئیل میں گداختگی، قلب میں رقت جذبات کا دور دور پتہ نہیں۔ نعت رسول میں عقیدت و عبدیت کی گھلاوٹ طرہ امتیاز سمجھی گئی ہے جوش کی نعتیں محض رسم شاعری کے طور پر لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں'' (ص۶۷)

یہ تبصرہ اس وقت کیا گیا جب جوش نے نعت گوئی سے رجوع نہیں کیا تھا۔ ۱۹۸۱ء میں ان کی بہن کے داماد مائل ملیح آبادی ان سے ملاقات کی غرض سے اسلام آباد تشریف لائے تھے۔ انھوں نے جوش سے کہا تھا کہ:

''آپ کے کلام پر تنقید و تحقیق کرنے والا آپ کے نعتیہ کلام اور مجموعہ مراثی اور منقبت حضرت علی و شہیدان کربلا پر اپنی رائے دے گا تو آپ کو ایک دین دار اور سچا مسلمان ثابت کر کے چھوڑے گا''۔ جوش نے جواب دیا ''کیا وہ یہ نہیں سوچے گا کہ وہ میرے بالغ ہونے سے پہلے کا کلام ہے''۔
(مائل ملیح آبادی: کتاب ''جوش دیار دکن میں'' مطبوعہ لکھنؤ، جون ۱۹۸۴ء ص ۹۸)

غالباً اس بیان کی معنویت سے دیگر مصنفین و محققین ذاتی طور پر واقف تھے۔ کسی نے بھی جوش کی نعتیہ شاعری کو موضوع بحث بنانا گوارہ نہیں کیا۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہر شاعر کو جس نے رسماً اور روایتاً یا اظہار ہنر کی خاطر دو ایک نعتیں کہی ہوں تو ان کے حسن و قبح کو لائق اعتنا سمجھا جائے۔ اگر نعت کہنے کا مقصد محض شہرت طلبی اور اظہارِ ہنرمندی سے قاری یا سامع کو مرعوب کرنا مقصود ہو اور اس کی شاعری مجموعی طور پر اس خلوص سے خالی ہو تو اس کا ذکر کرنا بذات خود معیوب ہے۔ یہ بات باعث اطمینان ہے کہ دیگر محققین نے جوش کی دہریت اور خدا سے لاتعلقی کو ذہن میں رکھا اور ان کے ذکر سے اس پاک موضوع پر داغ نہیں لگایا۔

ڈاکٹر طلحہ نے دور جدید کی نعت گوئی کا احاطہ موجودہ صدی کے نصف اول تک کیا ہے ان میں وہ اختر شیرانی کی نعتوں کو ان کی عشقیہ شاعری سے زیادہ وقیع مانتے ہیں (ص ۷۵) دیگر شعرا میں عبدالحمید عدم، عندلیب شادانی، نازش پرتاب گڑھی، شکیل بدایونی، عبدالعزیز عمیق حنفی، بھگوان داس، جگن ناتھ آزاد اور بعض دیگر غیر مسلم شعرا کی نعتوں پر تبصرے کیے ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ ان میں سب سے زیادہ عبدالعزیز خالد کی نعت گوئی بلکہ ان کی علمیت اور قوت اظہار سے زیادہ متاثر ہیں۔

اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی کا تبصرہ مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ جامع بھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اردو کی نعتیہ شاعری پر تنقیدی و تحقیقی جائزے کے حوالہ سے اردو نعت کا یہ معتبر مطالعہ ہے جو اپنے اندر اختصار کے ساتھ جامعیت بھی رکھتا ہے''
(بحوالہ مضمون: ''اردو میں مطالعات نعت'' مشمولہ اوج نعت نمبر، جلد ۲، مطبوعہ ۱۹۹۲ء لاہور، ص ۷۰۷)

حسب روایت نعتیہ کلام میں کبھی کبھی ایسے اشعار بھی آ جاتے ہیں کہ ان کو اس نعت سے الگ کر کے پڑھا جائے تو وہ عام غزل کے معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں نعت سے متعلق ہونے کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا اگر چہ یہ عیب نہیں لیکن احتیاط کا تقاضا ہے کہ ایسا نہ ہو تو اچھا ہے۔

ڈاکٹر طلحہ نے ان اشعار کو توصیف کے ساتھ جگہ دی ہے جو مناسب نہیں ہے۔

رہ کے دریا ہی میں رہ سکتا ہے قطرے کا وجود ملتی ہے شاخوں ہی میں برگ و ثمر کو زندگی
تم جو ہو سب کچھ ہے ورنہ تم نہیں تو کچھ نہیں گھر کے مالک سے ملا کرتی ہے گھر کو زندگی
(ص ۷۰)

کیا کہوں فرقت میں کیسا حال اپنا ہوئے ہے روز ان اشکوں کا جاری ایک دریا ہوئے ہے
پیچ جو سر کے ترے گیسو کا سودا ہوئے ہے گھر ستی باہر نکل صحرا بصحرا ہوئے ہے
(ص ۹۰)

نہ رکھو ہجر میں بیمار مجھ کو پلا دو شربت دیدار مجھ کو
(ص ۹۱)

اپنے پلے کوئی سوغات نہیں اس کے سوا نقد جاں نذر کر اے دل یہی دستور ہے آج
(ص ۶۳)

سراپا حسن بن جاتا ہے جس کے حسن کا عاشق بھلا اے دل حسیں ایسا بھی ہے کوئی حسینوں میں
(ص ۵۹)

اسی طرح نمونہ کلام میں ایسے اشعار توصیفی انداز میں نقل ہوئے ہیں جو اقدار اسلامی کے خلاف ہیں۔ شاعر کا نام چاہے کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو بغیر احتسابی نظر ڈالے ہر شعر کو لائق

توصیف قرار دینا بھی زیادتی ہے اوراس کا حوالہ دینا بھی زیادتی ہے۔ ہمارے خیال میں حسب ذیل اشعار کے لیے توصیفی کلمات نہیں کہے جاسکتے۔

میرے شعروں میں جلوہ شاہد معنی کا پیدا ہے — نظر آتا ہے لفظوں کا فقط ہلکا سا اک پردا

(ص۵۶)

وہ رخ آئینہ وحدت نما معلوم ہوتا ہے — نبی کو دیکھتا ہوں اور خدا معلوم ہوتا ہے

(۶۹)

عربی نعت کے مطالعہ کے بعد اردو کی قدیم نعت زیر بحث لائی گئی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کی نعتیہ شاعری کے ساتھ ساتھ قیام پاکستان اوراس کے بعد کی نعتیہ شاعری کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ دور جدید میں اگر چہ پاکستانی شعرا کی نعتیہ شاعری کا تفصیلی ذکر ہے تاہم بھارت کے نعت گو شعرا کا کلام بھی زیر نظر رہا ہے۔

''......کتاب کو اردو نعت کا ایک تفصیلی و جامع جائزہ تو قرار نہیں دیا جاسکتا لیکن مطالعہ نعت کے حوالہ سے مطبوعہ کتب میں اسے جو اولیت کا اعزاز حاصل ہے وہ کسی اور کتاب کے حصہ میں نہیں آیا''

(ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی: مضمون اردو میں مطالعات نعت مشمولہ رسالہ اوج، نعت نمبر۲: لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۷۰۷)۔

(''اردو میں نعت گوئی'' ص ۲۸)

○○○

اردو کی نعتیہ شاعری مصنفہ پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ

ایک جائزہ

ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی

اردو نعت کا آغاز اردو زبان ہی کے ساتھ ہوا اور اردو نعت گوئی کی تاریخ تقریباً چھے ساڑھے چھے صدیوں پر محیط ہے لیکن یہ بڑی عجیب اور افسوس ناک بات رہی کہ ایک مدت دراز تک اردو نعتیہ شاعری کی باقاعدہ تاریخ مرتب ہوکر منظر عام پر نہ آسکی۔ اردو نعت گوئی کا تاریخ پر تحقیق اور تدوین وترتیب کا جو بھی کام ہوا وہ تقسیم ہند کے بعد ہوا۔ ڈاکٹر سید رافع الدین اشفاق اردو نعت کے اولین محقق ہیں جنھیں ۱۹۵۵ء میں ان کے تحقیقی مقالے ''اردو میں نعتیہ شاعری'' پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ایوارڈ کی گئی۔ لیکن ڈاکٹر اشفاق کا یہ ڈاکٹریٹ مقالہ ۱۹۷۶ء میں اردو اکیڈمی سندھ کراچی سے کتابی شکل میں شائع ہوی۔ ۲۰ ویں صدی کی ۷ ویں دہائی کے بعد اردو کی نعتیہ شاعری پر دو کتابیں اور بھی منظر عام پر آئیں۔

(۱) اردو کی نعتیہ شاعری از ڈاکٹر فرمان فتح پوری

(۲) اردو کی نعتیہ شاعری از ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ

اور اردو نعت گوئی پر اب تک شائع ہونے والی کتابوں میں جو سب سے زیادہ ضخیم کتاب ۱۹۹۰ء میں اقبال اکیڈمی پاکستان (لاہور) سے شائع ہوئی ہے وہ ہے ''اردو میں نعت گوئی'' جو ڈاکٹر ریاض مجید فیصل آبادی کا ڈاکٹریٹ مقالہ ہے۔ نعت گوئی کی تاریخ پر اب اولیت کے اعتبار سے ہم دیکھتے ہیں تو دو ہی کتابیں نظر آتی ہیں۔

(۱)اردو کی نعتیہ شاعری از ڈاکٹر فرمان فتح پوری

(۲)اردو کی نعتیہ شاعری از ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ۔سنہ اشاعت ۱۹۷۴ء(آرہ بہار)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب ''اردو کی نعتیہ شاعری'' کا سال اشاعت بھی قریب قریب وہی ہے جو طلحہ رضوی برق صاحب کی کتاب کا ہے۔فرمان صاحب کی کتاب پاکستان سے شائع ہوئی۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر طلحہ رضوی برق کی کتاب بھارت میں اردو نعتیہ شاعری کی تاریخ پر پہلی کتاب ہے جو شائع ہوکر منظرِ عام پر آئی۔۱۹۷۴ء کے بعد ہند و پاک میں جن اسکالروں نے اردو نعت گوئی یا کسی مخصوص نعت گو پر تحقیق یا جائزہ نگاری کا فریضہ انجام دیا ہے۔اس کتاب کو ماخذ کے طور پر کام میں لیا ہے اوراس کا حوالہ دیا ہے۔

زیرِ نظر کتاب ''اردو کی نعتیہ شاعری'' گو زیادہ ضخیم نہیں ہے لیکن جامعیت کے اعتبار سے بہت خوب ہے۔یہ کتاب اگر دیکھا جائے تو ایک طرح سے تاریخ نعت گوئی پر ایک ابتدائیہ ہے لیکن ابتدائیہ میں بھی اکملیت کا جلوہ پورے طور سے نمایاں ہے۔

فاضل مصنف ڈاکٹر طلحہ برق نے مختصراً اردو زبان کی ابتدائی نشو ونما، نعت کی تعریف، قرآن واحادیث سے نعت رسول اکرم ﷺ کی نشاندہی۔خدائے لم یزل کا اپنے حبیب کا ناعت ہونا اور محبوب کو اپنا منعوت بنانا وغیرہ ثابت کرنے کے بعد عربی وفارسی نعت گوئی کی تاریخ کا اجمالی خاکہ پیش فرمایا ہے۔

عہدِ رسول کونین ﷺ کے عربی نعت گو شعرا کے کلام کے نمونے بھی پیش کیے ہیں۔عہد مابعد صحابہ کے نعت نگاروں کا بھی تذکرہ کردیا ہے اور پھر فارسی کے مشاہیر نعت گویوں کا ذکر کرتے ہوئے چند فارسی کلام کے نمونے بھی درج کیے ہیں۔

وہ سلام جو مرثیہ یا امام عالی مقام اور شہدائے کربلا کی شان میں لکھے گئے ان سے علاحدہ نعت سے متعلق سلام۔سلام بر خیر الانام علیہ السلام کے تذکرہ میں طلحہ صاحب نے عربی اور فارسی سلاموں کے چند اشعار پیش کرنے کے بعد اردو میں رقم کیے جانے والے سلاموں کا بھی حوالہ دیا ہے اور حفیظ جالندھری، ماہر القادری، عبدالحمید صدیقی وغیرہ کے سلاموں سے بطور نمونہ

چند اشعار پیش کیے ہیں البتہ فاضل مصنف اس موقع پر امام احمد رضا فاضل بریلوی کے مشہور زمانہ سلام ''مصطفےٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام'' کا حوالہ دینا بھول گئے۔بہر کیف اس سے فاضل مصنف کی تحقیق یا ان کی کاوش پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔آگے چل کر انھوں نے امام احمد رضا فاضل بریلوی کی نعت گوئی پر تبصرے رقم فرمایا ہے۔

مشہور میلاد ناموں اور معراج ناموں کی فہرست مع منصفین بھی اس کتاب میں موجود ہے۔

ڈاکٹر طلحہ صاحب موصوف نے زبان اردو کی ابتدا اور اس کی تقدیس نیز نعت کے موضوع پر جو کچھ لکھا ہے گو مختصر ہے مگر نہایت جامع اور چند جملوں میں بھرپور وضاحت وصراحت اور پورا نقشہ پیش کردیا ہے۔لکھتے ہیں:

> (۱) ''عربی وفارسی کی بنسبت اردو ایک بہت ہی کمسن زبان ہے پھر بھی اردو کا شعری ادب نہایت ہی اہم و گرانمایہ ہے۔اس میں تقریباً تمام اصناف سخن کے عمدہ ترین نمونے اور شہہ پارے موجود ہیں......بہر حال اردو کو دیگر زبانوں کے درمیان یہ اعزاز وافتخار حاصل ہے کہ یہ اپنی پیدائش کے وقت سے ہی مومنہ اور کلمہ گو رہی۔صوفیاے کرام اور مبلغین کے ہاتھوں دین متین کی ترویج واشاعت کے لیے یہ پروان چڑھی اور شروع ہی سے اس کی توتلی زبان پر حمد وثنا اور نعت رسول مقبول ﷺ جاری ہوگئی۔ (ص:۵)

اردو کا مومنہ ہونا ہی اس کی پاکیزگی، لطافت اور شیرینی کی ضمانت ہے اور یہی سبب ہے کہ یہ ایک جمہوری زبان ہے۔اس نے جہاں دین فطرت کی تبلیغ واشاعت میں نمایاں کردار ادا کیا،تہذیب واخلاق اور شرافت وانسانیت کے اعلا اقدار کو فروغ دیا۔وہاں ہندی اور ہندوستانی عناصر کو بھی خوب خوب اجاگر کیا اور تقدیسی و مذہبی نغمات سنانے کے ساتھ ساتھ عظمت ہندوستاں اور ایک جشن کے ترانے بھی سنائے اور آج بھی تمام تر پابندیوں اور راہ ترقی پر رکاوٹوں کے باوجود

یہ اپنا تقدیسی کردار ادا کرنے میں مصروف ہے۔

(۲) ص ۳۳ پر فاضل مصنف نے موضوع نعت پر جو بحث کی ہے اس بحث سے یہ واضح کر دیا ہے کہ نعت ۔صرف شاعری ہی نہیں عبادت ہے، سنت الٰہیہ اور حکم الٰہی کی تعمیل ہے۔ نیز نعت ۔عقیدہ اور عقیدت دونوں کا مظہر ہے۔

ڈاکٹر رفیع الشفاق نے حضرت گیسو درازؒ کو اردو کا اولین نعت گو لکھا ہے اور ان سے منسوب اشعار بھی نمونۃً پیش کیے ہیں اور اس کے لیے بابائے اردو مولوی عبدالحق کی کتاب ''اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا حصہ'' کا حوالہ بھی دیا ہے۔ (اردو میں نعت گوئی ص ۱۲۶)

ڈاکٹر ریاض مجید نے بھی مولوی عبدالحق اور نصیر الدین ہاشمی (دکن میں اردو) کے حوالے سے خواجہ گیسو دراز قدس سرہٗ العزیز کو اردو کا سب سے پہلا نعت گو شاعر تسلیم کیا ہے۔

(اردو میں نعت گوئی ص ۱۶۸)

البتہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے حضرت خواجہ گیسو دراز اور ان کے صاحبزادے حضرت سید محمد اکبر حسینیؒ کی کسی بھی اردو تصنیف یا اشعار کی نفی کرتے ہوئے فخر الدین نظامی کی مثنوی ''کدام راؤ پدم راؤ'' کو اردو کی سب سے پہلی تصنیف قرار دیا ہے لہٰذا خود ڈاکٹر جالبی اور ان کے متبعین نعت اردو کا نمونۂ اول فخر الدین نظامی کے ان اشعار کو تسلیم کرتے ہیں ۔

تہیں ایک سماچا گسائیں امر
سری دوئی تیں جگہ توڑا دگر
امولک مکٹ لپس سسنار کا
کر لے کام نردھار کرتار کا

(مثنوی کدم راؤ پدم راؤ مرتبہ جمیل جالبی ص ۳۰۔۳۵۔۶۹۔۷۳)

ڈاکٹر طلحہ رضوی برق نے زیر نظر کتاب میں حضرت سید قطب عالم کی نعت کا ایک مصرعہ پیش کرنے کے بعد شیخ بہاؤ الدین باجن کا ایک نعتیہ شعر پیش کیا ہے۔ اس کے بعد دکن میں بہمنی دور حکومت کے فخر الدین نظامی کے مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' سے نعتیہ اشعار درج کے نے کے

بعد انھیں اردو تسلیم کرنے میں تامّل کا اظہار کیا ہے۔

بہر کیف اس بحث سے قطع نظر کہ اردو کا پہلا نعت گو کون ہے۔ طلحہ صاحب نے جنوبی ہند کے مشاہیر نعت گو شعرا قلی قطب شاہ، ملا وجہی، نصرتی......غواصی اور ابن نشاطی وغیرہ کا مختصراً تذکرہ کرتے ہوئے ان کے کلام کے نمونے بھی پیش کیے ہیں۔

فاضل مصنف نے شمالی ہند میں اردو شاعری کا آغاز ولی اورنگ آبادی سے دکھایا ہے اور شاہ مبارک، مضمون، شاکر ناجیؔ، محمد احسن احسنؔ، مصطفٰی یکرنگ سراج الدین آرزوؔ، اشرف فغاںؔ وغیرہ کے کلام میں بھی نعتیہ اشعار کی موجودگی کا ذکر کیا ہے۔

شمالی ہند میں شعرائے متقدمین سوداؔ، دردؔ، میر اور مظہر جاں جاناں وغیرہ کے کلام میں بھی نعتیہ اشعار کی موجودگی ظاہر کی ہے اور سوداؔ او درد کے چند اشعار نمونۃً پیش بھی فرمائے ہیں۔

طلحہ صاحب نے ایک بہت ہی اہم تحقیقی بات پیش کر دی ہے اور وہ یہ ہے کہ:

''انشاء و مصحفی و نظیر کے عہد سے اردو میں نعت نویسی فنی و صنفی حیثیت اختیار کرتی چلی گئی'' (ص ۳۶)

طلحہ رضوی صاحب نے مشہور غیر مسلم شاعر دیا شنکر نسیمؔ کی مثنوی ''گلزار نسیم'' سے حمد و نعت کے اشعار بھی نموبۃً پیش کیے ہیں۔

فاضل مصنف برق صاحب نے اس کتاب میں ایک اور بہت ہی اہم بات ظاہر کی ہے کہ ذوقؔ، غالبؔ اور مومنؔ کے دور میں بہادر شاہ ظفرؔ کی طرف سے نعتیہ مشاعرہ کا اہتمام بھی ہونے لگا تھا۔ (ص ۴۲)

ڈاکٹر طلحہ رضوی برق صاحب نے اردو کے مشاہیر نعت گویوں غلام امام شہیدؔ، شہیدیؔ، لطفؔ، شاہ نیازؔ بریلوی، امام احمد رضا بریلوی، آسیؔ غازی پوری وغیرہ۔ علاوہ ان مستقل نعت گویوں کے حسرتؔ، شادؔ، اقبالؔ وغیرہ کا تذکرہ بھی خوب ہے۔

ماہر القادریؔ، حفیظؔ جالندھری، ظفر علی خاںؔ وغیرہ کے تذکرے بھی بڑی دیانت داری سے انھوں نے اس کتاب میں کیے ہیں اور بہت سے گمنام شعرا و غیر مسلم شعرا کے نعتیہ اشعار کے

نمونے پیش کیے ہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد ہندو پاک میں ابھر کر سامنے آنے والے نعت نگاروں کا تذکرہ بھی ہے اور نعت کے مختلف اصناف سخن اور ہیئتوں میں رقم کیے جانے کا ذکر بھی۔

صنف نعت کے بارے میں فاضل مصنف نے حقیقت کا جو اظہار کیا ہے وہ بہت خوب ہے۔ لکھتے ہیں:

''صنف نعت کو بجا طور پر مشرقی شاعری کا گل سرسبد کہا جاسکتا ہے............اردو شاعری میں نعت گوئی ایک ایسی شیریں اور دل نشیں صنف بن گئی جس کی مثال دوسری مذکورہ زبانوں میں کم ملتی ہے۔ کون ہے جو سیرت و شخصیت مصطفوی ﷺ سے متاثر نہ ہوگا۔ دنیا کی عظیم غیر مسلم شخصیتوں نے بھی حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں نثر و نظم کے ذریعہ دلی عقیدت کا اظہار کیا ہے'' (ص ۸۳۔۸۴)

اخیر میں فاضل مصنف ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ اس سچائی کا اظہار بھی کر دیتے ہیں کہ ابھی یہ تذکرہ نامکمل ہے اور اپنے نعتیہ اشعار سے اس کتاب کا اختتام فرماتے ہیں۔

اس کتاب کی زبان بہت ہی صاف، سادہ اور نکھری ہوئی ہے۔ اندازِ بیان شگفتہ اور دل نشین ہے۔ برقؔ صاحب کی تحریر میں توضیحی اور بیانیہ نثر اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ موجود ہیں۔

گہری نظر سے اس کتاب کا مطالعہ اس حقیقت کو واضح کر دیتا ہے کہ فاضل مصنف نے اس کی ترتیب میں بہت ہی محنت، تلاش و تحقیق اور عرق ریزی سے کام لیا ہے اور دیانت داری کو ہر مقام پر رہنما بنائے رکھا ہے۔ یہ کتاب بذات خود ایک ڈاکٹریٹ مقالہ کی حیثیت رکھتی ہے حالانکہ اسے ڈاکٹر طلحہ برقؔ نے ڈاکٹر ہونے کے بعد ہی مرتب کی ہے اس طرح یہ ان کے ڈاکٹریٹ پر دوہری سند ہے اور ان کی ڈگری کو دو آتشہ بنا دیتا ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ جب راستہ ہموار ہو جاتا ہے۔ سنگ میل نصب ہو جاتے ہیں اور راستہ کے نشیب و فراز اور پیچ وخم کی نشاندہی کر دی جاتی ہے اس وقت مسافر کو راستہ چلنے میں کوئی

دقت نہیں ہوتی اور نہ ہی راستہ بنانے والوں کی مشقت و محنت اور برداشت کیے گئے تکالیف کا احساس ہوتا ہے لیکن اس وقت کا عالم کوئی پوچھے جب ہر سمت سناٹا ہے، تاریکی ہے، جنگل ہی جنگل ہیں۔ ایسے عالم میں جو اذیت و مصائب برداشت کر کے راستہ بناتا ہے اصلی مرد میدان وہی ہوتا ہے۔

تقسیم ہند کے برسوں کے بعد تک بھی نعت کی تاریخ مرتب کرنے کی طرف کسی کی توجہ نہیں ہوئی۔ لوگ متفرق طور پر نعت، نعت کے موضوع یا اپنے پسندیدہ نعت گو پر ضرور لکھتے رہے لیکن تحقیق اور تاریخ نویسی کا کارنامہ انجام دینے کی یا تو ہمت کسی نے نہ کی یا فن نعت کو بے التفاتی کا شکار بنائے رکھا۔

بہر حال یہ حقیقت ہے کہ بھارت میں پہلی بار نعت گوئی کی تاریخ پر جو کتاب منظر عام پر آئی وہ ڈاکٹر برق صاحب کی یہ کتاب ''اردو کی نعتیہ شاعری'' ہے۔ یہ کتاب ضخامت میں گو کم ہے لیکن ہے بہت ہی گرانقدر۔

اردو نعت کی تحقیق کی طرف آج بھی کام کرنے کی ضرورت ہے خصوصاً تقسیم ہند کے بعد کی اردو نعت گوئی پر جائزہ نگاری کی ضرورت ہے۔ پاکستان میں نعت پر بہت کام ہو رہا ہے اور وہاں نعت کو ایک تحریک کی شکل دے دی گئی ہے۔

اب بھی بہت سے ایسے نعت گو شعرا خصوصاً طبقۂ علما میں ایسے ہیں جن کی شاعری فنی و ادبی اعتبار سے بہت ہی وقیع اور گرانقدر ہے لیکن وہ بھلا دیے گئے ہیں۔ روہیل کھنڈ ہونی ورسٹی میں مفتی اعظم علامہ مصطفیٰ رضا خاں بریلوی اور حافظ پیلی بھیتی کی نعتیہ شاعری پر ریسرچ ورک ہو رہا ہے۔ ابھی علامہ قتیلؔ دانا پوری، علامہ شمسؔ بریلوی جیسے بہت سے نعت گو شعرا بے توجہی اور عدم التفاتی کے شکار ہیں۔

اردو شاعری کا آغاز حقیقتہً نعت نگاری ہی سے ہوا اور اسے بھلا کر اردو کی پاکیزگی، لطافت، عصمت و حرمت کو برقرار نہیں رکھا جاسکتا۔

کتابیات

(۱) اردو کی نعتیہ شاعری:از ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ

(۲) اردو میں نعتیہ شاعری:از ڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق

(۳) اردو میں نعت گوئی:از ڈاکٹر ریاض مجید

(۴) اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا حصہ:از مولوی عبدالحق

(۵) دکن میں اردو:از نصیر الدین ہاشمی

(۶) مثنوی کدم راؤ پدم راؤ۔:مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی

OOO

اردو کی نعتیہ شاعری:از ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ

پروفیسر محمد اکرم رضا

ڈاکٹر طلحہ رضوی کی یہ کتاب جنوری ۱۹۷۹ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ یہ کتاب صرف ۹۶ رصفحات پر مشتمل ہے۔مصنف کی تحریر کے مطابق تقریباً چھ سال ہوئے حضرت علامہ ارشد القادری صاحب مدظلہ نے اپنے رسالہ ''جام نور'' کے لیے مجھے اردو کی نعتیہ شاعری پر ایک مضمون لکھنے کے لیے کہا۔تعمیلِ ارشاد میں بہ عجلت ایک سرسری مضمون لکھ کر روانہ کر دیا جو شائع بھی ہو گیا مگر اس مضمون کی تشنگی کا احساس برابر ہوتا رہا۔فرصت ملی تو اس مضمون کو کچھ بسط دینے کی کوشش کی۔ جوں جوں لکھتا رہا اس قلزم ذخار اور بحرِ ناپیدا کنار کی وسعت کا اندازہ ہوا۔۔۔اب یہ سرمایہ کتابی صورت میں پیشِ ناظرین ہے۔

(ڈاکٹر طلحہ رضوی برق: حوالہ مذکورہ)

پروفیسر شفقت رضوی لکھتے ہیں کہ کتاب کیا ہے ایک مضمون کی تفصیلی شکل ہے۔۔ ڈاکٹر طلحہ رضوی کی شخصیت کو متعارف کروانے کی یا تو کوشش ہی نہیں کی گئی یا کم از کم میرے علم میں نہیں۔ میں اپنی اس کتاب کے ذریعہ پہچان پایا ہوں۔

پروفیسر صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں ''ڈاکٹر طلحہ رضوی برق''اس کتاب کے ذریعے محقق اور مبصر کے طور پر سامنے آئے ہیں۔اُن کی تحقیق کے مطابق عربی میں پہلا قصیدہ میمون بن قیس سے منسوب ہے اور عربی زبان کا شعری ادب نعتیہ شہ پاروں سے بھرا ہوا ہے۔(ص ۷)

انھوں نے مثنویوں کے بعد معراج ناموں پر روشنی ڈالی ہے۔معراج نامہ کی مقبولیت نے اسے الگ سے ایک صنفی حیثیت عطا کر دی ہے۔یہاں تک کہ سیرت و اخلاقِ رسول ﷺ کے بیان میں نور نامے،مولود نامے اور وفات نامے نظم ہونے لگے۔(ص ۴۳)

ڈاکٹر طلحہ رضوی برق نے دورِ جدید کی نعت گوئی کا احاطہ موجودہ صدی کے اوّل تک کیا ہے۔اس میں اختر شیرانی کی نعتوں کو ان کی عشقیہ شاعری سے زیادہ وقیع مانتے ہیں۔(ص ۵۷) معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ عہدِ حاضر کے شعرا میں بھی عبدالعزیز خالد کی نعت گوئی بلکہ ان کی علمیت اور قوتِ اظہار سے زیادہ متاثر ہیں۔ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی کہتے ہیں:

> ''اردو کی نعتیہ شاعری پر تنقیدی و تحقیقی حوالے سے اردو نعت کا یہ معتبر مطالعہ ہے اور اختصار کے ساتھ جامعیت رکھتا ہے''۔

(اردو میں مطالعاتِ نعت: اوجِ نعت نمبر، جلد ۲، ص ۷۰۲)

حسبِ روایت نعتیہ کلام میں کبھی کبھی ایسے اشعار بھی آجاتے ہیں کہ ان کو نعت سے الگ کر کے پڑھا جائے تو وہ عام غزل کے معلوم ہوتے ہیں۔اگرچہ یہ عیب نہیں مگر احتیاط کا تقاضا ہے کہ ایسا نہ ہو تو اچھا ہے۔ڈاکٹر طلحہ نے ان اشعار کو توصیف کے ساتھ جگہ دی ہے۔یہ امر نعت کے شایانِ شان محسوس نہیں ہوتا۔اسی طرح نمونۂ کلام میں ایسے اشعار توصیفی انداز میں نقل ہوئے ہیں جو اقدارِ اسلامی کے خلاف ہیں۔ہر شعر کو بغیر احتساب کے تعریف کے لائق قرار دینا ایک بڑے شاعر تو کجا ایک عام شاعر کے شایانِ شان بھی نہیں۔ہم اس کتاب کو نعت کا انتہائی تفصیلی مطالعہ تو قرار نہیں دے سکتے لیکن زیرِ تبصرہ کتاب کی اوّلیت کے پیشِ نظر اسے بلند مقام ضرور عطا کیا جا سکتا ہے۔

○○○

''شایع نظمیں'' ایک مطالعہ

ڈاکٹر ظفرؔ کمالی

فی زمانہ صوبۂ بہار میں جن چند بزرگوں کے دم سے اردو ادب کی آبرو قائم ہے ان میں ممتاز ترین نام حضرتِ طلحہ رضوی برقؔ کا ہے۔ان کا شمار اردو اور فارسی کے جیّد ادیبوں میں ہوتا ہے۔وہ بحرِ تصوف کے شناور بھی ہیں اور عالمِ باعمل بھی۔جہاں وہ ایک کامیاب مصلح ہیں وہیں بہترین مقرر بھی۔انھیں آستانۂ عالیہ چشتیہ نظامیہ دانا پور کے صاحبِ سجّادہ ہونے کا فخر بھی حاصل ہے۔فقر و درویشی کی وہ تمام صفات ان میں موجود ہیں جو کسی صاحبِ دل کا خاصّہ ہوا کرتی ہیں۔مزاج میں حد درجہ استغنا اور خاک ساری ہے۔ان کی بصیرت افروز گفتگو سن کر دل و دماغ میں روشنی پھوٹنے لگتی ہے۔والدِ ماجد حضرت سید شاہ محمد قائم قتیل دانا پوری رحمۃ اللہ علیہ اور والدۂ ماجدہ بی بی محمودہ خاتون قادری مجیبی پھلواری کی بہترین قربت نے ان کے جوہرِ ذاتی کو نکھارنے کے ساتھ ساتھ ان کی علمی و ادبی صلاحیتوں کو بھی جلا بخشی۔

جنابِ طلحہ رضوی برقؔ کو اردو نثر و شاعری پر یکساں مہارت حاصل ہے۔فارسی ادب کا رچا ہوا شعور اس پر مستزاد ہے۔انھوں نے ہر دو زبانوں میں اپنی تخلیقی صلاحیت کا لوہا منوایا ہے۔شاعری میں نعت شریف،غزلوں،نظموں،سہروں اور رباعیات میں انھوں نے اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔قطعاتِ تاریخ کہنے میں تو ان کا جواب ہی نہیں۔اچھی تاریخیں کچھ اور لوگ بھی کہتے ہیں لیکن طلحہ صاحب اس کے شہسوار ٹھہرے۔اردو میں اب تک ان کے چار شعری مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔پہلا مجموعہ ''شایگاں'' غزلوں پر مشتمل تھا۔''شہابِ سخن'' میں رباعیاں تھیں۔

''سہرے ہی سہرے'' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے سہروں کا اور ''اربعین'' نعتوں کا مجموعہ تھا۔ ''شایع نظمیں'' حضرتِ برقؔ کی نظموں کا مختصر مجموعہ ہے جس کا مزاج ان کے دیگر مجموعوں سے مختلف ہے۔ اس میں تہنیتی نظمیں بھی ہیں اور استقبالیہ اشعار بھی۔ منظوم تبصرہ بھی ہے اور امّتِ مرحومہ کی اخلاقی پستی کا نوحہ بھی۔

تہنیتی اور تقریباتی نظموں، منظوم تبصروں اور خطوط وغیرہ میں ''شاعری'' کی گنجایش بہت کم ہوتی ہے لیکن پختہ کار شعرا کا کمال یہی ہے کہ وہ معمولی موضوعات کو بھی غیر معمولی بنا دیتے ہیں۔ غالبؔ نے ''چکنی ڈلی'' پر تیرہ اشعار کا جو قطعہ لکھا اس کی مثال سامنے ہے کہ انھوں نے تشبیہات کا سہارا لے کر ڈلی کو مُہرِ مکتوب، مسّی آلودہ سرانگشتِ حسیناں، خاتمِ دستِ سلیماں، سرِ پستانِ پریزاد، اخترِ سوختۂ قیس، حجرالاسودِ دیوارِ حرم، نافہ آہوے بیابانِ ختن اور خشتِ خم صہبا سے تعبیر کیا اور اسی معمولی موضوع کو معنوی بلندیوں کی انتہا پر پہنچا دیا۔ طلحہ رضوی برقؔ کے یہاں بھی یہ کمالِ فن موجود ہے کہ وہ عام موضوع کو خاص موضوع میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ انھیں زبان پر اس بلا کی قدرت ہے کہ لگتا ہے بیان کا دریا سینے میں موجیں مار رہا ہے۔ رضا نقوی واہیؔ کی کتاب ''متاعِ واہی'' کے ملنے پر ان کے شعری جذبات میں جو تلاطم برپا ہوتا ہے اسے انھوں نے ''شاخِ گلِ محبت شاداب یا الٰہی'' کے عنوان سے سپردِ قلم فرمایا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؂

وہ قدردانِ عشق و راز آشنائے الفت حضرتِ رضائے نقوی عالی جناب واہی

طنزو مزاحِ اردو کے محسنِ حقیقی شعر و ادب کے ماہر اور شاعرِ فکاہی

ارضِ دکن تک اونچا ہے پرچمِ ظرافت دانشورِ مسلّم صاحب نظر کماہی!!!

وہ حامیِ روایت ماحیِّ خبطِ جدّت ''سورج بچونچ مرغا'' جن کی نظر میں واہی

آلایشِ جدیداں بیت الغزل میں گویا بکری کی مینگنی ہے یا مرغیوں کی لاہی

مضمون گنجلک بھی پانی ہے ان کے آگے حق سے عطا ہوئی ہے لفظوں کی بادشاہی

ان کا قلم نمونہ برجستگی کے فن کا دنیاے شاعری میں ازماہ تا بماہی

تشبیہ پر تصدّق ہر تازگی و ندرت آہوے استعارہ صیدِ شکار گاہی

ترسیل انوری کی ابلاغ عسجدی کا اور سہلِ ممتنع میں ہم رتبۂ فراہیؔ

جو بات منہ سے نکلی بس تیرِ بے خطا ہے کیا نالۂ شبانہ کیا آہِ صبحگاہی

ناکتخدا بناتِ مضمون پہ ہے تصرّف ہاں جن کو کہیے کہیے اردو میں بن بیاہی

واہیؔ فقیہِ جیّد شرعِ سخنوری کے روشن گرِ اوامر نکتہ رسِ نواہی

برجستگی اور قادرالکلامی ہر شعر سے ظاہر ہے۔ واہیؔ ظریف شاعر ہیں اس مناسبت سے ع ''ناکتخدا بناتِ مضمون پہ ہے تصرّف'' جیسا شوخ مصرع نظم کی دلکشی میں مزید اضافہ کرتا ہے۔ ''ظہورِ مظہرِ حق''، ''اجرا رضا بک ریویو'' اور ''واہ کیا بات سید ین نمبر کی'' بھی اسی قبیل کی نظمیں ہیں۔ موخرالذکر نظم کی دشوار زمین کو بھی شاعر نے پانی کر دیا ہے۔ حفیظ بنارسی کو ''امتیازِ میر'' ملنے پر تہنیت نامہ، پروفیسر ابوالمظفر کی شان میں ''شکریہ'' کے عنوان کے اشعار، پروفیسر وہاب اشرفی کے نبیرے کی ولادتِ باسعادت پر تہنیتی نظم اور پروفیسر فاروق احمد صدیقی کی تصنیف لطیف کے جشنِ اجرا پر ''تبریک واعتراف'' کے اشعار بہ طورِ خاص اچھے ہیں۔ وزیرِ تعلیم کے استقبالیہ موقع و محل کی مناسبت سے ہندی الفاظ کا استعمال بڑی خوبصورتی اور سلیقے سے کیا گیا ہے۔

اس مجموعے کی کچھ نظمیں خالص اصلاحی جذبے کے تحت لکھی گئی ہیں جن میں مسلمانوں کے اندر پیدا ہونے والی کمزوریوں اور اخلاقی پستی کو نمایاں کیا گیا ہے۔ شاعر کے دل کی تڑپ اس کے ایک ایک شعر سے نمایاں ہے۔ آج مسلمانوں کے درمیان ذات برادری کا مسئلہ جس شدّت کے ساتھ موجود ہے اس سے ہر حسّاس انسان کا بے چین ہونا فطری ہے۔ یہ وہ مسئلہ ہے جس نے مسلمانوں کے ''امّتِ واحدہ'' کے تصور کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ایک خدا اور ایک رسول کو ماننے والی قوم مختلف فرقوں میں بٹ کر دنیا کے لیے ہنسی کا موضوع بن چکی ہے۔ حضرتِ طلحہ رضوی برقؔ نے ''کہنے کو ہیں مومن مگر ایمان سے خالی'' میں اس معاشرتی بحران کا نقشہ بڑی دلسوزی کے ساتھ کھینچا ہے۔ شاعر کی نظر میں دنیا کے سارے انسانوں کی نسبت حضرت آدم اور بی بی حوّا سے ہی ہے۔ آدم مسجودِ ملائک تھے۔ دنیا کی ویران زمین کو آباد کرنے کے لیے اللہ نے جنّت سے اس حسین جوڑے کو نکالا لیکن اس روے زمین پر صرف اسی کی نسل میں یہ خاصیت رکھی گئی کہ وہ کردار

وعمل سے چاہے تو ولی بن جائے یا شیطان۔ انسان مٹّی سے بنا ہے اور ایک دن مٹّی میں مل جائے گا۔ اللہ کے پیارے محبوب نے کلمۂ طیبہ کے ذریعے انسانوں کے درمیان مضبوط رشتے کی بنیاد ڈالی تھی اور یہ ارشاد فرمایا تھا کہ سبھی مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ انھوں نے یہ پیغام بھی سنایا تھا کہ عربی اور عجمی میں کسی کو کسی پر فضیلت نہیں ان میں اللہ کے نزدیک اکرم وہ ہے جو زیادہ متّقی ہے لیکن افسوس کہ اتنے واضح پیغام کے باوجود بھی مسلمانوں نے اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنالی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سب کا خدا، سب کا نبی اور سب کی کتاب علاحدہ ہے۔ سبھی ابلیس کے پھندے میں پھنسے ہوئے ہیں۔ بقولِ شاعر ؎

سیّد ہیں مگر پاکیِ نسبت کا نہیں پاس — چمچہ جو بنے ہوگئے قابوں کے سوالی
صدّیقی ہیں اور رکھتے ہیں ضد صدق وصفا سے — کیا لٹ گئی دولت کی طرح صدق مقالی
ہیں خان مگر جرأتِ مردانہ ہوئی گم — اس عہد نے شیروں کو سکھائی ہے شغالی
ایوّبی ہیں اور صبر کی خوبو نہیں رکھتے — اللہ نے رحمت کی نظر ہم سے ہٹالی
منصوری ہیں اور دار پر چڑھنے سے ہیں ڈرتے — حق چھوڑ کے کیا چوٹ ہے جو ہم نے نہ کھالی
صبّاغی ہیں ہر رنگ میں رنگ جاتے ہیں ہم تو — کیا خوب جو ہوتی پسند اسلام کی لالی
ہم جتنے بھی خانوں میں بٹیں بٹتے رہیں گے — ہے دور بہت ذہنوں سے جب فکرِ مآلی
کردار کی پامالی نے صورت کو بگاڑا — احمق بھی بجاتے ہیں ہمیں دیکھ کے تالی
بھولے ہیں مساوات کی تعلیم نبی کی — قرآن کے احکام میں تاویل نکالی
طاقت کا ہو نشّہ کہ وہ منصب کی اکڑفوں — ہاں ریت پہ پندار کی دیوار اٹھالی
ایمان کے دعوے سے ہی مومن ہوئے ہم سب — ہے ثبت اک اک دل پہ وہی نقشِ ہلالی
افسوس مگر آستیں خالی نہیں بت سے — یہ نسلی ہو یا مصلحتی خواہ عیالی

شاعر کو یہ احساس ہے کہ انصاف کے خون سے جس کام میں رنگینی آئے گی وہ کام حشر میں داورِ محشر سے فریاد کناں ہوگا اور یہ فریاد لوگوں کی جان کا وبال بنے بغیر نہیں رہے گی۔ ایسے

لوگوں کے روزے اور تہجد ان کے کام نہیں آسکیں گے۔ اس اظہار افسوس کے بعد شاعر اللہ سے دعا کرتا ہے کہ وہ اقبال سے محروم ملّت کے فرزندوں کے مقدّر میں خیر سگالی کا جذبہ رکھ دے۔ وہ حضورِ اکرم کی بارگاہ میں بھی فریاد کناں ہے کہ اس کی امّت ایک اللہ کی ڈوری کو پکڑ لے اور اس کی کثرت میں بھی وحدت کی شان پیدا ہوجائے۔ نظم کے اس حصّے میں حالی کی نظم ''اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے'' کا اثر نمایاں ہے۔ اقبالؔ نے اپنی نظم ''جوابِ شکوہ'' میں جو بات کہی تھی ؎

یوں تو سیّد بھی ہو مرزا بھی ہو افغاں بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلماں بھی ہو

اور ؎

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

جناب برقؔ نے اپنی نظم میں اقبالؔ کے اجمال کی تفصیل بیان کردی ہے۔ حالؔی کا مسدّس ہو یا اقبال کا ''جوابِ شکوہ'' یا طلحہ رضوی برقؔ کی نظم، تینوں شعرا کا درد مشترک ہے۔ فرق یہ ہے کہ حالی اور اقبال کے موضوعات کی دنیا وسیع ہے جب کہ طلحہ صاحب نے صرف ایک مسئلے کو موضوعِ سخن بنایا ہے لیکن بات تینوں کے دل سے نکلی ہے اس لیے اثر آفرینی کی کیفیت سب کے یہاں اپنے اپنے انداز کی ہے۔ قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ جناب طلحہ رضوی برقؔ بذات خود سادات خاندان سے تعلق رکھتے ہیں لیکن انھوں نے حقایق کے بیان میں ذرا بھی چشم پوشی سے کام نہیں لیا اور غیر جانب داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اصل حقیقت کو بڑی خوش اسلوبی اور مضبوطی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اپنے کھلے پیغام اور اعلا مقصد کے اعتبار سے یہ اس مجموعے کی اہم نظم کہی جاسکتی ہے۔

''مسجد کی فریاد'' اپنے محلّے کی مسجد کی خستہ حالی اور مسجد سے متصل مقبرے کی پاک زمین پر مردہ ضمیروں کے ذریعے دکان بنانے کی کوششوں کے خلاف احتجاجی نظم ہے۔ بیان میں طنز

اور برہمی کا انداز ہے جو حالات کے اعتبار سے فطری ہے۔ چند اشعار دیکھیے ۔

مسجد پکارتی ہے کوئی دیکھے میرا حال
ڈر ہے نہ اس محلّے کا ہو تیز تر زوال

اندر پلاسٹر کو کچھ ایسا ادھیڑا ہے
قصّاب اتارے جیسے کسی جانور کی کھال

عیدین دو گزر گئیں ننگی دیواروں پر
خوش پوشیاں مصلّیوں کی بے حسی پہ دال

خس پوش تھے مکان کئی پختہ ہوگئے
اربابِ فقر کے یہاں بڑھنے لگا ہے مال

آپس میں مل کے خدمتِ مسجد نہ کرسکے
چندے کی لت ہوئی ہے خود ان کے لیے وبال

ایثار سے غرض نہ محبت سے کام ہے
ذاتی مفاد کے لیے آمادۂ جدال

ان اشعار کو پڑھ کر سوداؔ کے قصیدے ”ہے چرخ جب سے ابلقِ ایّام پر سوار“ کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ طلحہ رضوی برقؔ کے یہاں سوداؔ کا زورِ بیان اور تفصیل تو نہیں ہے اور ویسا مبالغہ بھی نہیں لیکن تیور میں کچھ یکسانیت ضرور ہے۔ شاعر نے اپنوں کی نیتوں کے کھوٹ کو دیکھ کر اپنے غم و غصّے کا اظہار کیا ہے اور مقبرے کی زمین میں کیسی کیسی پاک روحیں دفن ہیں اس کو بیان کر کے لوگوں کی غیرت کو للکارا ہے کہ وہ اس بے حرمتی سے بچیں اور خدا کا خوف کھاتے ہوئے حرام وحلال کا خیال کریں۔

”ڈھہ جائے ظلم و جور کی دیوار دوستو“ بھی اصلاحی نظم ہے جس میں خطابت کا رنگ نمایاں ہیں۔ خالص عبادتوں میں نام ونمود کی طلب، سیاسی دعوتِ افطار اور ایسی دعوتوں میں حلال و حرام کی تمیز کا اٹھ جانا، رمضان میں ہفتہ عشرہ میں قرآن ختم کر کے نمازِ تراویح سے غافل ہوجانا، مسکینوں، مفلسوں اور ناداروں سے قوم کی غفلت، رنگداروں کے ذریعے چرسئہ قربانی کی نیلامی کی بولیاں بولنا اور قوم کے پیسے کا بے جا استعمال جیسے موضوعات پر شاعر اپنے دکھی اور زخم خوردہ احساسات کا ذکر کرتا ہے ۔

شامل عبادتوں میں ہے نام و نمود اب
شہرت طلب ہوے ہیں ریا کار دوستو

مسکینوں کے گھروں میں ہے اجناس کی کمی
پوچھا تو ہوتا ان کو بھی اک بار دوستو

یہ صدقہ و زکات یہ فطرہ ہے کس لیے
ہیں بے شمار مفلس و نادار دوستو

دریافت تو کرو کہ اندھیروں میں کون ہے
تم روشنی کے مارے ہو بیمار دوستو

فطرہ ، زکات ، صدقہ کمیشن پہ ہوگیا
مشکل سے نصف لیتے ہیں حق دار دوستو

شاعر اتنے پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ اپنی فکر اور نظر کے دائرے کو وسعت دیتے ہوئے کہتا ہے ۔

یہ ایک ملک کی نہیں عالم کی بات ہے
گفتار ہے مگر نہیں کردار دوستو

ہیں قایدیں ممالکِ اسلامیہ کے آج
صیہونیوں کے حاشیہ بردار دوستو

ہے رازق العباد تو ربِّ کریم ہی
پھر انحصار غیروں پہ بے کار دوستو

ٹونی و بش کی سازشیں مکڑی کا جال ہیں
مردانِ حُر بھی جاگیں تو اک بار دوستو

اس نظم میں شاعر کی اسلامی فکر پوری طرح بیدار ہے۔ اس کی روح کی بے کلی خیالات کے بے محابا اظہار پر مجبور ہے۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ خوابیدہ قوم کو جگانے کے لیے لوریوں کی ضرورت نہیں بلکہ اسے جھنجھوڑنے کی ضرورت ہوتی ہے ع

نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی

نیند گہری ہو لہجے کی لطافت کے بدلے آہنگ کی بلندی بلکہ خارا شگافی ہی اپنا اثر دکھاتی ہے۔ اس زاویے سے دیکھا جائے تو اپنی برہنہ گفتاری کے باوجود نظم اپنے مقصد میں کامیاب ہے۔

اس شعری مجموعے میں کچھ طنزیہ نظمیں بھی ہیں جو بہ طورِ خاص ہماری توجہ کی مستحق ہیں۔ حضرتِ طلحہ رضوی برقؔ نے راقم الحروف کے نام ایک خط میں تحریر فرمایا تھا کہ ”شروع سے ہی کچھ طنزیہ نظمیں لکھ لیتا تھا ویسے میرا مزاج وہ نہیں ہے“۔ البتہ فاروق ارگلی کے نام اپنے منظوم خط میں لکھتے ہیں کہ ۔

اقبال کی دعائیں غلامِ حسین کو
سنجیدہ طبع وہ ہیں مری طبع منچلی

اس ”طبع منچلی“ کو محض شاعرانہ بیان کہہ کر نظر انداز بھی کر دیجیے تو یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ اپنے تمام زہد و ورع کے باوجود انھوں نے ظرافت کو شجرِ ممنوعہ نہیں سمجھا۔ ”شایگاں“ کی غزلوں میں تو ظریفانہ رنگ کے اشعار تقریباً نہیں ہیں لیکن ان کی رباعیوں کے مجموعے ”شہابِ

سخن‘‘ میں خاصی تعداد میں بہترین طنزیہ رباعیاں موجود ہیں اور یہ رباعیاں ہی انھیں طنز نگار ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ حضرتِ طلحہ رضوی برقؔ کی طنزیہ نگارشات عام طنز نگاروں سے ہٹ کر ہیں۔

’’شایع نظمیں‘‘ کی نگارشات میں ’’پیروی نامہ‘‘، ’’ظفر اقبال کی نذر‘‘، ’’سبزی باغ‘‘ ’’آہنگ ہر زبان پہ ہے کچھ کر دکھاؤ کا‘‘ اور ’’اک طرفہ تماشا ہے یہ بازارِ تماشا‘‘ اپنے ظریفانہ رنگ و آہنگ کے سبب پر کشش بن گئی ہیں۔ ’’پیروی نامہ‘‘ میں امتحانی پیروی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ جناب برقؔ مختلف درجات اور یونیورسٹیوں کے ممتحن رہ چکے ہیں۔ پیروی کاروں کو بھگتنے کا انھیں خوب خوب تجربہ ہے لہٰذا اس عمل سے کسی ایماندار پروفیسر کی جان کس طرح ضیق میں پڑ جاتی ہے اور سیزنل ملاقاتی خواہ مخواہ کے رشتے ناتے جوڑ کر مختلف نفسیاتی حربے آزماتے ہوئے کس طرح اپنا الّو سیدھا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس کی مضحک تصویر کشی سے بے ساختہ ہونٹوں پر ہنسی آجاتی ہے۔

’’ظفر اقبال کی نذر‘‘ میں جدیدیت کی بڑھی ہوئی اس بے راہ روی پر طنز ہے جو اس تحریک کے عروج کے زمانے میں اس کے حامیوں سے سرزد ہو رہی تھی اور وہ اوٹ پٹانگ موضوعات پر سرسری انداز میں اشعار کہہ رہے تھے۔ انھیں کے انداز میں غزل کہہ کر جناب برقؔ نے اس طرز کا مذاق اڑایا ہے۔ یہ دراصل اسی انداز کی فکری پیروڈی ہے جیسی پیروڈیاں ’’مداوا‘‘ اور ’’ناروا‘‘ میں فرقت کاکوروی نے کی تھیں۔ دل چسپی کی خاطر چند اشعار دیکھتے چلیں ؎

شعر کا معنی ہو کہ نہ ہو غزل خدارا سن تو لو
دیکھیے کب تک شادی ہو عرصہ گزرا منگنی کو
جینے سے مایوس نہ ہو تنہائی کی بھیڑ میں کھو
آج کا ہے بس اتنا کام اپلے تھاپ اور کپڑے دھو
اپنے ہاتھ سے وہ اک کام ہاں ہاں میں نے کیا ہے تو
لیموں لے کے دوڑ کے آ دس پیسے میں ملیں گے دو
برقؔ سے ایسی غزلیں تم اٹھتے بیٹھتے لکھوا لو

جو اصحاب جدیدیوں کے امام میراجی کے ’’کام‘‘ سے واقف ہیں وہ حضرتِ برقؔ کے شعر ؎

اپنے ہاتھ سے وہ اک کام ہاں ہاں میں نے کیا ہے تو

سے صحیح طور پر لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ غزل کی نشتریت اس کی مضحکہ خیزی میں پنہاں ہے جو ہمارے دل و دماغ کو گدگداتی اور مسکرانے پر مجبور کر دیتی ہے۔

’’سبزی باغ‘‘ پٹنہ میں سبزی باغ کے نکڑ کی منظر کشی کی گئی ہے جسے پڑھ کر قارئین پر تبسّم زیر لب کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ شاعر نے اس میں وہ دل چسپ حادثہ بیان کر دیا ہے جو اسے سبزی باغ میں پیش آیا تھا۔ ’’آہنگ ہر زباں پہ ہے کچھ کر دکھاؤ کا‘‘ میں ملک و قوم کی بگڑتی صورتِ حال پر کچھ جھنجھلاہٹ، کچھ غم و غصّہ، کچھ تنبیہ، کچھ طنز و تبسّم اور کچھ مشورے کے پردے میں دل کی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ طنز و تبسّم کا رنگ دیکھتے چلیے ؎

کرتا ہے آنکھیں چار دھتورا گلاب سے　　وقت آپڑا ہے آج چمن کے بچاؤ کا
بے پردگی نے دیدوں کے پانی گرا دیے　　فیشن چلا ہے حسن گریباں دکھاؤ کا
کھا کر علف مویشی کا گنبد نما ہے پیٹ　　بولا طبیب اس میں تو گولا ہے باؤ کا

’’اک طرفہ تماشا ہے یہ بازارِ تماشا‘‘ میں شاعر نے گفتار، کردار، سرکار، مئے پندار اور جبہ و دستار کے ہی تماشے نہیں دکھائے بلکہ رمضان کی عبادت کے تقدس کی پامالی، تراویح کی تفریح، مفتی ملّا قاضی کا سیاسی کردار، نقلی سیکولرزم، حلیۂ شرعی کی آڑ میں فرائض سے اجتناب، مقابر، مساجد اور اوقاف کی جائداد کی لوٹ اور خطیبانِ منبر اور اماموں کی مصلحت آمیز خاموشی پر بھی بڑے واضح اور چبھتے ہوئے انداز میں چوٹیں کی ہیں۔

’’مقبرہ تیمور کا‘‘ پاکستانی سفارت خانے پر لکھی گئی نظم ہے۔ شاعر نے مئی جون کی شدید گرمی میں دو ہفتے تک سر توڑ کوششیں کیں لیکن اسے ویزا حاصل نہیں ہو سکا تو اس نے غصّے میں یہ نظم لکھی۔ اس کی ذہنی اذیت اور غم و غصّہ ہر شعر سے ظاہر ہے۔ سفارت خانے کے عملوں کے غیر ہمدردانہ بلکہ ظالمانہ سلوک کے خلاف وہ اپنے دل کے پھپھولے اس طرح پھوڑتا ہے ؎

ہے قیامت پاک امبیسی سے ویزا کا حصول وہ جنھیں خوفِ خدا ہے اور کچھ پاسِ رسول

ہاں سہانا ڈھول لگتا ہے سبھی کو دور کا پاک امبیسی تو ہے ایک مقبرہ تیمور کا

ایک قلعہ ہے جسے ہر سمت دربستہ کہو ہے بسیرا اس میں جنّاتوں کا برجستہ کہو

بھاڑ میں جائے ترا ویزا کہ تو مردود ہے فطرۃً فرعون ہے ہامان ہے مردود ہے

ظریفانہ نظموں کی اس کڑی میں ''ہر ایک تہذیب گویا شاعری ہے'' کا ذکر نا گزیر ہے۔ یہ اپنے انداز کی عجیب وغریب نظم ہے۔ اس قبیل کی کوئی دوسری نظم راقم الحروف کی نظروں سے نہیں گزری۔ یہ نظم نظمِ آزاد ہے۔ شاعر کا خیال ہے کہ کوئی تہذیب فن شاعری کی طرح ہوتی، لباس وغذا، آدابِ خورد ونوش اور شادی بیاہ اور موت اس کی اصناف ہوتیں تو یہ اصناف مختلف ملکوں اور قوموں میں ترقی کی منازل بھی طے کرتیں کیوں کہ شعری حِس کی صورت کی طرح قومیں اپنی تہذیب کی ہر قدر کو بہتر سمجھتی ہیں اور وہ اس سے صرف پیار ہی نہیں بلکہ اس کی حفاظت بھی کرتی ہیں۔ شاعر کے خیال میں اگر ہم ہر ایک تہذیب کو شاعری کی طرح عالمگیر قدروں کا امین سمجھنے لگیں تو اس کی صنفِ شاعری کو بھی قبول عام دینے کی کوشش کرنی پڑے گی۔ دراصل یہاں شاعر ایسے لوگوں کے خلاف دور سے گھیرا بندی کرتا ہے جو اپنی مشرقی تہذیب کے مقابلے میں مغربی تہذیب کو بہتر سمجھتے ہیں۔ اس کی نظروں میں اس خیال سے متاثر شعرا مشرق کی مختصر اصنافِ سخن قطعہ، رباعی اور دوہے وغیرہ کو چھوڑ کر ترائیلے اور ہائیکو جیسی اصنافِ سخن میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔

شاعر کا یہ اچھوتا طنز دیکھیے ؎

لباس اک صنف ہے تہذیب کی
تو پھر اسے ہم کیوں نہ اپنائیں
کھلا سینہ، برہنہ ران، حلقہ ناف کا ظاہر
سرین وانمودہ
یہ سبھی ارکان ہیں
اس صنف تازہ کار وخوش منظر کے

جس کو آج ہم
ملبوس اعلا طبقۂ اشراف سے تعبیر کرتے ہیں
اسی صورت غذا بھی صنف ہے
اک عالمی تہذیب کی
اس کو بھی گر مثلِ صنفِ شاعری دیکھیں
تو آخر کیوں نہ اپنائیں وہ صورت
بانس کی دو قمچیوں سے کھائیں چاول
مینڈکوں کا قورمہ، ابلے ہوئے چوہے
گلہری کا سرا، بندر کا پایہ، قلیہ الّو کا
سجائیں میز پر اور دعوت اک بوفے کی دے ڈالیں
کوئی تو ہوگا جو اس صنف نامانوس سے
محظوظ ہوگا، لطف لے گا
جیسے ہم تم ہائیکو کی طرح بے ہنگام
اپنی مشرقی افتادِ طبع ومعتدل فکر و
خیالات توازن دار و مذہب دوست
سے عاری وخالی مستعار اصناف کو
اپنانے کے پیچھے پڑے ہیں

شاعر کا اندازِ بیان پیچیدہ ہے لیکن نصف نظم کے بعد یہ پیچیدگی ختم ہو جاتی ہے اور اس کا اصل مدّعا آہستہ آہستہ آئنہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ ایک فکری طنزیہ نظم ہے جو ہمیں نشتر ہی نہیں چبھوتی بلکہ تہذیبی تقلید کی اندھی دوڑ میں اچانک ٹھٹھک کر دیر تک اور دور تک سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔

حضرتِ برقؔ کی کچھ اور نظموں میں بھی جزوی طور پر ان کی شستہ اور شایستہ ظرافت کے نمونے موجود ہیں لیکن انھیں طوالت کے خوف سے نظر انداز کیا جاتا ہے۔

مندرجہ بالا سطور میں اس اہم مجموعے کی چند نظموں کی جانب ہی اشارے کیے گئے ہیں۔اصل لطف اسے ملے گا جو شروع سے آخر تک مجموعے کا بغور مطالعہ کرے گا۔ حضرت طلحہ رضوی برقؔ عروض وبیان اورزبان وفن کے ماہر ہیں اس کے ثبوت میں پیشِ نظر مجموعے کی کوئی تخلیق پڑھیے اس میں زبان کی چاشنی ضرور ملے گی۔انھوں نے قرآنی آیات کا استعمال اپنے اشعار میں نہایت ہنرمندی سے کیا ہے۔کہیں کہیں انگریزی الفاظ کواس خوبی سے برتا ہے کہ اکبرالہ آبادی کی یادتازہ ہوجاتی ہے۔جگہ جگہ شعری صنعتوں اور رعایت لفظی کا استعمال بھی اپنا جادو جگاتا ہے۔وہ دلِ گداختہ رکھتے ہیں۔معاشرے کی خرابیوں پران کے دل کی کڑھن دیکھتے ہی بنتی ہے۔وہ حق پرست بھی ہیں اور صداقت پسند بھی۔اسی خوبی نے ان کے لہجے میں بے باکی پیدا کی ہے۔وہ مشرقی تمدن کے نگہہ دار ہیں۔ان کا نظامِ فکر صالح اورفکری انتشار سے پاک ہے۔ان کا شعور زندہ،خیالات بلنداورنظر دوربیں ہے۔بیان کی سطحیت کاان کے یہاں گزرنہیں۔ان ساری خوبیوں نے اس مجموعے کوخاصے کی چیز بنادیا ہے۔

یہاں مجھے اپنی حسرت اورحیرت کا تذکرہ بھی کرنے دیجیے۔مجھے تعجب اس بات پر ہے کہ ایسے قادرالکلام شاعر کے یہاں غزلوں،نظموں اور رباعیوں کا ذخیرہ اتنا کم کیوں ہے؟ وہ چاہیں توان اصناف میں کیا کچھ نہیں کرسکتے۔کاش!وہ اس جانب توجہ دیں۔

ڈاکٹر التفات امجدی نے حضرتِ برق کی ان بکھری نظموں کوڈھونڈ ڈھونڈ کر یکجا کیا اور اسے سلیقہ مندی سے ترتیب دیا۔اردو دنیا کوان کا شکرگزار ہونا چاہیے۔

○○○

ڈاکٹر برقؔ کی شاعری

تاجؔ پیامی

جناب طلحہ رضوی برقؔ اچ ڈی جین کالج آرا میں شعبہ اردو وفارسی کے صدر ہیں۔ انھوں نے اکبردانا پوری پرتھیسس لکھ کر پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے ابھی برقؔ صاحب جواں سال ہیں لیکن حج بھی کرآئے ہیں اورداڑھی بھی رکھ لی ہے۔

برقؔ صاحب عموماً شیروانی اور بڑی مہری کا پیجامہ پہنتے ہیں۔کبھی کبھی وہ بش شرٹ اور پتلون بھی پہنتے ہیں۔پتلون چوڑی مہری کا ہوتا ہے اور نیچے سے مڑا ہوتا ہے۔سرپر ہروقت سیاہ مخمل کی ٹوپی دیکھی جاسکتی ہے۔برقؔ صاحب جس طرح پوشاک کے معاملہ میں روایت پسند ہیں اسی طرح وہ شاعری کے معاملے میں بھی روایت پسند ہیں لیکن کبھی کبھی اس کے انحراف بھی کرجاتے ہیں۔

شاعری میں برقؔ صاحب نے اپنے والدمحترم جناب علاّمہ قتیلؔ داناپوری سے فیض حاصل کیا لیکن برقؔ صاحب اورقتیلؔ صاحب کی شاعری میں کچھ فرق بھی ہے۔علاّمہ قتیلؔ داناپوری کا رنگ شاعری شاہ نصیرؔ اورامیرؔ مینائی سے ملتا ہے میری رائے علامہ قتیلؔ داناپوری کی شاعری کے بارے میں وہی ہے جو جناب تمنا عمادی مرحوم کی ہے:

> ''شمع ایون سخن شاہ محمد قائم زیب سجادۂ چست ومتخلص بہ قتیلؔ ان کے اشعار ہیں خود ان کی مہارت کے گواہ یعنی خورشید کی دنیا میں ہے خورشید دلیل ان کی غزلوں سے نمایاں نہ ہوں شان جمال کہ ہرایک شعر ہے آئینہ اللہ جمیل بندشیں چست زباں صاف،مضامین بلند ایسے اقوال ہیں جن

میں نہ کوئی قال نہ قیل'

یہاں پر محض چند اشعار علامہ قتیل صاحب کا پیش کرتا ہوں تا کہ ان کے کلام کی خوبیاں ظاہر ہو سکیں اور یہ بھی واضح ہو سکے کہ برق صاحب کی شاعری پر ان کا کتنا اثر پڑا اور یہ اس سے کتنی مختلف ہے ۔

کلیاں چٹک چٹک کے زر افشاں ہیں باغ میں
لٹتا ہے صبح و شام خزانہ بہار کا
کھل کھل کے غنچہ غنچہ ہے آئینۂ جمال
گھونگھٹ الٹ گیا ہے عروس بہار کا
موج صبا میں جھوم رہی ہے کلی کلی
ہر شاخ کلی چمن میں ہے جھولا بہار کا

ذرا ان اشعار میں الفاظ کا حسن تکرار ملاحظہ ہو۔ پہلے شعر میں کتنی خوبصورت رعایت لفظی ہے کلیاں زر افشاں ہے یعنی باغ میں بہار کا صبح و شام خزانہ لٹ رہا ہے۔ پہلے مصرع میں دوبارہ ''چٹک چٹک'' آیا ہے اور اسی مناسبت سے دوسرے مصرع میں صبح و شام کا امتزاج کتنا فنکارانہ ہے۔ آخر میں صرف ایک شعر میں علامہ قتیل دانا پوری کا پیش کرنا چاہوں گا جس سے ان کی قادرالکلامی، فن کی بے مثال پختگی اور مضمون آفرینی کا اندازہ ہو سکے گا ۔

بجا مشہور ہے یاد وطن گھن ہے کلیجے کا
فراق خلد میں گندم کا سینہ چاک ہوتا ہے

کم و بیش یہی خوبیاں برق صاحب کے کلام میں بھی پائی جاتی ہیں۔ انھوں نے نہایت خوش اسلوبی سے روایتِ شاعری کو برتا ہے لیکن ان کی شاعری کا آہنگ علامہ قتیل دانا پوری کی شاعری کے لہجہ سے مختلف ہے۔ برق صاحب کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

فصلِ چمن میں زورِ جنوں کچھ نہ پوچھیے
گل رنگِ زخمِ تازہ سے پوشاک ہوگئی

پاؤں کی زنجیر لو آپہنچا پھر موسم گل
دیر نہ ہوا ے ذوق جنوں آباد کریں ویرانے لوگ

یاد آتی ہے درازی شب ظلمت غم
دیکھتا ہوں جو تری زلف سیاہے گاہے

قفس میں زخمِ جگر پھول سے نظر آئے
کہیں قریب سے شاید بہار گذری ہے

برق صاحب کی شاعری کا اصل رنگ یہی ہے جو ان اشعار سے نمایاں ہے لیکن کبھی کبھی انھوں نے انحراف بھی کیا ہے۔ ملاحظہ ہوں چند اشعار ۔

چل کے ویران رہ گزر تنہا
کاٹ دی عمرِ مختصر تنہا

ہر طرف کٹ رہی ہے یوں گویا
اک کھڑی فصل نسل آدم ہے

سر پہ ہے غم کی کڑی دھوپ کہاں ہیں احباب
کاش دو بول سے ہمدردی کے سایہ کرتے

وقت سائے کی طرح بھاگ رہا ہے ہردم
صدیاں گذری ہیں اسی طرح سے پیچھا کرتے

آخر رسم بھی شہرِ وفا کی ختم ہوئی
دہانِ زخم پہ کوئی نہ رکھ سکا مرہم

ان اشعار اور اوپر کے اشعاروں میں لہجہ کا بھی فرق ہے اور تجربے کا بھی۔ نیچے کے اشعار شاعر کے ذاتی تجربات اور مشاہدات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ میں یہاں ایک بات واضح کردینا چاہوں گا کہ روایت سے انحراف سے مراد یہ ہے کہ برق صاحب ہمیشہ اشعار میں چمن، جنون، زنجیر، زلف، قفس جیسے روایتی الفاظ روایتی انداز میں استعمال نہیں کرتے بلکہ ان الفاظ کے سہارے یا بالکل سیدھے سادے الفاظ میں حالاتِ حاضرہ کو بھی پیش کرتے ہیں۔

غزلوں کے اشعار کی طرح آپ کی نظمیں بھی روایت اور روایت سے انحراف کی نمایاں مثالیں ہیں۔ ''ارتعاش'' نظم معرا کی مثال ہے۔ گندکاخ قیصر، شکست طلسم شب'' آزاد نظمیں ہیں۔ آخری نظم کا آخری بند ملاحظہ ہو ؎

کس کو خبر ہے وحشت میں
اک روز اسی کالی کا پاؤں
''شیو'' کے جسم پر پڑجائے گا
شرم و ندامت ہاتھ آئے گی
نکل پڑے گی حد سے زباں
اور طلسم شب ٹوٹے گا''

○○○

پروفیسر طلحہ رضوی برق کا رنگِ تغزل

تاج پیامی

شاعری فنونِ لطیفہ میں سب سے بہترین فن ہے۔ اس میں موسیقی، مصوّری اور پیکر تراشی کی شان بھی نمایاں ہوتی ہے۔ شاعری سے رقص وسرود بھی حاصل ہوتا ہے۔ اسے سن کر انسان وجد میں آجاتا ہے اور سر دھننے لگتا ہے۔ بقول میر تقی میر ؎

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں نہ ایسی سنیے گا
پڑھتے کسی کو سنیے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا

''سر دھنیے گا'' میر نے شاعری کے بارے میں ہی یہ بات کہی ہے۔

شاعری تہذیب کی علامت ہے۔ خوشی کا موقع ہو یا غم کا یہ جذبات کو قبضۂ اختیار میں رکھتی ہے۔ شاعری مرصّع سازی کا کام کرتی ہے۔ اس میں ہر لفظ نگینہ کی طرح جڑا ہوتا ہے۔ شاعری کا اثر دیرپا ہوتا ہے۔ شکست وخوردہ فوج فتح سے ہم کنار ہوجاتی ہے۔ مؤثر ہونا شاعری کی خاص خوبی ہے۔ یہ انقلاب پیدا کردیتی ہے۔ سوئی ہوئی قوم کو جگادیتی ہے اور خاص خوبی یہ ہے کہ یہ دلوں کو جوڑتی ہے۔

اردو شاعری خاص کر غزل میں زیادہ تر محبت ہی کی بات کی جاتی ہے اور محبت ایک بڑی چیز ہے۔ اگر بغور دیکھا جائے تو کائنات کا نظام محبت ہی کی کشش سے وابستہ اور قائم ہے۔ اردو شاعری پر ''گل وبلبل'' تک محدود رکھنے کا الزام ہے لیکن یہ الزام ہے تو بجا ہے کیونکہ اس سے محبت کا رشتہ قائم ہے۔ خاص کر غزل کا تعلق محبت ہی سے استوار ہے۔

طلحہ رضوی برق کی غزل میں الفاظ نگینہ کی طرح جڑے ہیں ان کی شاعری مرصع سازی کا

بہترین نمونہ ہے۔ان کا بیشتر کلام جذبۂ محبت سے لبریز ہے۔غزل اختصار کے فن (Micw An) کی بہترین مثال ہے۔ بڑے بڑے ناقدین امرسن، کالرج، ایلیٹ بھی اختصار پر زور دیتے ہیں۔ کیس کا کہنا ہے شاعری......ہوں تب چمکتی ہے۔ادھر یہ ریسرچ (Research) ہوا ہے کہ غزل کے اشعار ذہن کو سرور اور دل کو سکون بخشتے ہیں۔تجربہ بھی یہی کہتا ہے کہ طویل نظم سے ذہن اکتا جاتا ہے اور ایک شعر سے جذب وفکر کی تسکین ہو جاتی ہے۔شعر سن کر واہ واہ کی داد بلند ہوتی ہے۔غزل کا ایک شعر دریا کو کوزہ میں بند کرنے کا نام ہے۔''یہ وہ کوزہ ہے کہ دریا کی ہے وسعت اس میں''۔

اگر یہ کہا جائے کہ طلحہ رضوی برق محبت کے شاعر ہیں تو غلط نہیں۔آیئے ان کے ان اشعار سے لطف اندوز ہوں جن میں محبت اور محبت کے متعلق کیفیات کا اظہار ہوا ہے ؎

کبھی تو شمس کی صورت کبھی قمر کی طرح
لٹائے جلوۂ حسن اس کے سیم و زر کی طرح

شمس اور قمر کی مناسبت سے سیم وزر خوب ہے۔

عشق کیوں رسوا ہو اپنا سرِ راہے گاہے
آپ اسی طرح جو مل جایئے گاہے گاہے
آرزو ہے کہ ترے کوچے سے ہم بھی گذریں
پیرہن چاک بہ ایں حال بگاہے گاہے
زندگی ختم ہوئی بس اسی حسرت میں کہ وہ
مجھ کو پاس اپنے بلائے مجھے چاہے گاہے
کٹ گئی عمر یہی ایک تمنا کرتے
سامنے بیٹھ کہ ہم آپ کو دیکھا کرتے

برق کا معشوق برق جمال ہے مگر ؎

برق صاحب نے نہ دیکھا تجھے اے برق جمال
شہر میں جاکے ترے حسن کا چرچا کرتے

معشوق کی ادائیں بھی ستم انگیز ہوتی ہیں ؎

سامنے سب کے بلایا مگر اک بات نہ کی
اور کیا اس سے زیادہ مجھے رسوا کرتے

شاعر اپنے محبوب پر طنز بھی کرتا ہے ؎

ہیں دل میں نہاں کتنے خورشید نما چہرے
مغرور نہ ہو اتنا سورج کی کرن والو
ظلم و ستم کے بعد بھی ہے برق ان کا دل بے چین
میرے بھی کچھ داؤں لیے ہیں تم کو کیا معلوم
اے برق مرے سینے میں ابھی قندیل محبت روشن ہے
ہر چند بتانِ شوخ نظر غارت گرے ایماں بھول گئے

اردو شاعری خاص کر غزل کے اشعار میں بڑی تہہ داری ہوتی ہے۔شاعر اس پردۂ زنگاری میں یعنی داخلی کیفیت کے ساتھ خارجی عوامل کو بھی پیش کر دیتا ہے۔شاعر کا محبوب کوئی بھی ہوسکتا۔برق کے لیے عشقیہ کلام سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ وہ اپنے محبوب سے بے انتہا محبت کرتے ہیں۔لیکن وہ بے اعتنائی سے کام لیتا ہے۔ظلم وستم سے بھی گریز نہیں کرتا۔

برق کے کلام کا دوسرا روشن پہلو غم والم ہے۔غم اور زندگی لازم وملزوم ہیں۔غم پر بڑے بڑے مفکرّوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔لیکن غالب کا یہ شعر سب پر بھاری ہے ؎

''قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں''

غم کو لوگ عموماً دو حصوں میں بانٹتے ہیں۔غمِ جاناں اور غمِ دوراں۔لیکن میرا خیال ہے کہ اگر یہ دونوں غم نہ بھی ہوں تو انسان غم سے فطری طور پر ہم کنار ہوتا ہے۔یہ غم انسان کو آدم سے ورثہ میں ملا ہے۔اب برق کے یہاں غم والم کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

موت جینے کی سزا ہے تو یہ ارشاد بجا
زیست کس جرم کی پاداش ہے کیا کہیے

یہ شعر بہت خوبصورت ہے اس میں سوال بھی ہے جواب بھی اور پھر سوال۔ پوچھا موت؟ جواب جینے کی سزا لیکن زندگی کس جرم کی پاداش ہے اس کا جواب نہیں اور نہ آج تک کوئی دے سکا ۔

درد کی لذّت متاعِ زیست ہے
زخمِ دل بیگانۂ مرہم رہا

خود اذیتی طبقات کا ایک مسئلہ ہے۔ اقبال کہتے ہیں ۔

علاجِ درد میں بھی درد کی لذّت پہ مرتا ہوں
جو تھے چھالوں میں کانٹے نوکِ سوزن سے نکالے ہیں

برق اور اقبال دونوں کے یہاں ''لذّت'' اور درد کلیدی الفاظ ہیں۔ اقبال کے یہاں نوک سوزن سے چھالے میں سے کانٹے نکالنے کی لذّت اقبال کا قصہ ہے لیکن برق نے ''درد کی لذّت کو متاعِ زیست کہہ کر اسے دوام بخش دیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ زخمِ دل بیگانۂ مرہم رہا۔

حیات کاٹنے یا حیات کرنے کی اذیت کو شاعر نے جس شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے وہ بہت دردناک ہے ۔

عجب فسردہ دلی سے حیات کاٹی ہے
قریب بیٹھ کے میت کے رات کاٹی ہے

اس شعر کی فسردہ دلی کو صرف محسوس کیا جاسکتا ہے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ یوں بھی شعر کو مدرسے لے جانے سے منع کیا گیا ہے۔ یہ پوری غزل حزن وملال اور درد وغم کا اعلان ہے۔

غزل کے بارے میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے یہ شکار خوردہ ہرنی کی دردناک آواز ہے ۔

اشک جب قطرۂ خوں ہو تو غزل ہوتی ہے
ضبط غم حد سے فزوں ہو تو غزل ہوتی ہے

مثال میں اور بھی اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں۔ محبت اور غم سے الگ بھی کئی خوبصورت

اشعار برق نے کہے ہیں ۔

طوفان کی سازشوں میں جو کل تک شریک تھا
کشتی کا میری آج وہی ناخدا ہوا

یہ ہے ہندستان کی جمہوری سیاست کے علمبرداروں کا حال۔

آج لوگ آسمان پر اڑ رہے ہیں۔ شاعر کہتا ہے ۔

سوا ہے ان سے مقام اپنا میں برق رشکِ ملک ہوں خود میری
مری نظر میں عروج نوع بشر کی حد آسماں نہیں ہے

طلحہ رضوی برق جس خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں وہاں تصوف عام بات ہے۔ برق کے والد بزرگوار علامہ قتیل دانا پوری خود ہی سجادہ نشین تھے اور صوفی شاعر بھی تھے۔ برق اگر یہ کہتے ہیں تو بجا کہتے ہیں ۔

ہے خیرہ چشم عقل و دل جدھر ہے اور جہاں تک ہے
یہ کس کے حسن کا جلوہ زمیں سے آسماں تک ہے

فکر وفن کے بارے میں بھی طلحہ رضوی برق کے خیالات کو جان لینا ضروری ہے۔

معیار سخن پرکھو آرائشِ فن دیکھو
گاؤ یہ غزل میری اے پاک دین والو

ہے برق کی غزل ہنر و فن کی آبرو
پیمانہ ہائے فکر و نظر لے لے کے دیکھیے

مری غزل ہے مری فکر وفن کا تاج حسیں
سجادیا ہے اک اک شعر میں نگینوں کو

شاعری بقول آتش مرصّع سازی ہے۔ برق کا کلام بھی مرصع سازی کا نمونہ ہے اور اس میں الفاظ نگینوں کی طرح جڑے ہیں ع

''سجا دیا ہے اک اک شعر میں نگینوں کو''

''شایگاں'' طلحہ رضوی برق کے مجموعہ میں اردو شاعری خاص کر غزل کی اعلا روایت موجود ہے۔ ان کے کلام میں جابجا تلمیح، رعایت لفظی اور استعارے پائے جاتے ہیں۔ آخر میں ان کا وہ قطعہ پیش کرنا چاہوں گا جس میں یہ بات کہی گئی ہے کہ فعل کے بعد ''کر'' یا ''کے'' لکھنا چاہیے۔ مثلاً کھا کے یا کھا کر۔ کھا کر کے لکھنا غلط ہے۔

قطعہ

واہ فکر سخن پہ میں جو چلا — طبع موزوں کو رہنما کرتے
شاہد فہم نے یہ آ کے کہا — مسکرا کر ستم روا کرکے
رکھّو فن کی نزاکتوں پہ نگاہ — ''گا کے'' لکھا کرو نہ ''گا کرکے''
فعل پر حرف ''کے'' لکھو یا ''کر'' — دو میں صرف ایک ہی جدا کرکے
کرکے میں ایک حرف زاید ہے — اس کو سمجھوگے تجزیا کرکے
آنا جانا کی طرح کرنا بھی — دیکھو مصدر ہے چشم وا کرکے
''نا'' کو سمجھو علامتِ مصدر — خود کو آگاہ قاعدا کرکے
کرنا اسم صفت پہ لاتے ہیں — جزو ترکیب برملا کرکے
''آکے'' جب ہے صحیح یا ''آکر'' — کیسے ہوگا درست آکر کے
الغرض بات تھی یہ نکتے کی — رکھ دیا جس کو مسئلہ کرکے

برقؔ اپنی غزل سناؤ اب
پاؤ گے سونا کیمیا کرکے

شائستگی اور تہذیب برق کے کلام کی وہ خوبیاں ہیں جو کم شعرا کے یہاں پائی جاتی ہیں جس طرح ایک متقی گناہوں سے بچتا ہے۔ اسی طرح برق ترقی پسند تحریک فقرہ بازی اور جدیدیت کی تنہائی اور بے چہرگی کی خارزار جھاڑیوں سے صاف بچ گئے اور اپنے کلام کو ان سے محفوظ رکھا۔

○○○

پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ کی غزل گوئی

ڈاکٹر کرامت علی کرامت

اگر ہم یہ تسلیم کرلیں کہ دلی اور لکھنؤ کے بعد عظیم آباد بھی اردو شاعری کا ایک اہم دبستان تھا، جس کی بنیاد شادؔ عظیم آبادی نے ڈالی تھی اور جس کی روایت کو موجودہ صدی میں جمیلؔ مظہری، اخترؔ قادری اور اجتبیٰ رضوی جیسے شعراء نے آگے بڑھایا تو مجھے یہ کہنے میں تأمل نہ ہوگا کہ پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ اسی سلسلے کی آخری کڑی ہیں۔ آخری کڑی اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اب نہ وہ اردو کے مراکز رہے نہ وہ اردو کے اساتذہ۔ برقؔ صاحب کے دیگر معاصرین جدیدیت کی طرف مائل ہیں، جس کا ظاہر ہے دبستانِ عظیم آباد سے کوئی رشتہ نہیں۔ اس لیے موصوف اپنے ہم عصروں میں واحد شاعر نظر آتے ہیں جو عظیم آباد کی عظیم روایت کو اب بھی سینے سے چمٹائے ہوئے ادبی منازل طے کررہے ہیں۔ ان کے کلام میں وہی پاکیزگی وطہارت، وارداتِ قلبی کی وہی پرخلوص عکاسی نیز حیات وکائنات کے رشتوں کو سمجھنے کی وہی سنجیدہ کوشش پائی جاتی ہے جو دبستانِ عظیم آباد کا خاصہ ہے۔

طلحہ رضوی برقؔ کی شاعری میں جو چیز مجھے سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ ان کی حزنیہ لَے ہے۔ یہ مخصوص لَے زندگی کے تمام درد وکرب واضطراب کو ایک مرکز پر سمیٹ لاتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ضرور چوٹ کھائی ہے لیکن ان کی شاعری میں اس چوٹ کا کہیں براہِ راست ذکر نہیں ملتا۔ اس کا سبب

غالباً یہ ہے کہ وہ ''رمز و ایما'' کی مدد سے ''حدیثِ خلوتیاں'' بیان کرنے کا طریقہ جانتے ہیں۔حزنیہ لَے پر مبنی ان کے چند ایسے اشعار درج ذیل کر رہا ہوں جو رفتہ رفتہ ہمارے دل کی گہرائیوں میں تو اترتے چلے جاتے ہیں لیکن ہمیں اس کا اندازہ نہیں ہوتا کہ شاعر کو کسی قسم کا غم نصیب ہے۔یعنی یہ غمِ روزگار ہے یا غمِ جاناں،غمِ ذات ہے یا غمِ دیگراں (یا پھر ان سب کا حسین و جمیل امتزاج) بس غم ہی غم سمندر ہے جو ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آتا ہے۔
ملاحظہ ہو ؎

موت جینے کی سزا ہے تو یہ ارشاد بجا — زیست کس جرم کی پاداش ہے کیا کہیے گا
لگا کے درد کے پیوند اوڑھتے رہیے — بنی ہے زندگی آج اک عذاب کی چادر
پھر کوئی آبلہ پا جانبِ صحرا نہ گیا — نخلِ شادابِ جنوں سوکھ گیا میرے بعد
تشنہ کامی پر مری خودنم ہوئی ساقی کی آنکھ — دیر تک روتا رہا ایک ایک پیمانہ مجھے

غرض کہ میں کہاں تک ایسے اشعار کا نمونہ پیش کروں؟ میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح حافظ کے فارسی کلام سے فال نکالی جاتی ہے،اسی طرح برقؔ کا شعری مجموعہ ''شایگاں'' کا کوئی بھی ورق کھول کر آپ آنکھ بند کر کے کسی بھی شعر پر انگلی رکھ دیجیے تو اس شعر سے صحیفۂ غم کی تفسیر نکل آئے گی۔البتہ اس سے قبل آنسوؤں کے زم زم میں وضو کرنا شرط ہے۔

فطرت کے ساتھ شاعری کا ازلی اور ابدی رشتہ ہے،ہو بہو اسی طرح جس طرح موسیقی کے ساتھ شاعری کا چولی دامن کا رشتہ ہے۔جدید شاعری کے دور میں یہ دونوں طرح کے رشتے مجروح ہوئے ہیں۔اب نہ کوئی جدید شاعر ''گل کا کتنا ثبات ہے'' پوچھتا ہے،نہ اس کے جواب میں ''کلی تبسم کرتی ہے''۔ہماری تصنع زدہ شہری زندگی کا یہ المیہ ہے کہ ہم علی الصباح پرندوں کی مترنم آوازوں سے بیدار نہیں ہوتے یا افقِ خاور سے ابھرتے ہوئے سورج سے ہماری شناسائی نہیں ہوتی،بلکہ ہم اخبار کے ہاکر کو خوب جانتے ہیں جو روزانہ صبح آ کر ہمیں نیند سے جگاتا ہے۔اس المیہ کے باوجود ہمارے ملک کی بیشتر آبادی دیہی علاقوں میں رہتی ہے اور اس آبادی کا فطرت سے تعلق اب بھی برقرار ہے۔دیہات پس ماندہ یا ترقی پذیر ملکوں میں نہیں

ہیں بلکہ ترقی یافتہ ملکوں میں بھی موجود ہیں۔کیا ان دیہی علاقوں میں بسنے والے کروڑوں انسانوں کی زندگی سے شاعری کا کوئی رشتہ نہیں؟ جدید شعراء ان سادہ لوح انسانوں سے جس قدر بھی رشتہ منقطع کر لیں،لیکن کم از کم ان لوگوں کی خاطر ہی فطرت سے شاعری کا رشتہ ہر دور میں قائم رہے گا۔

فطرت کی بات چلی ہے تو میں اتنا عرض کر دوں کہ زندگی کی طرح موت بھی ایک فطری شے ہے۔موت کا اذیت ناک تصور زمانۂ قدیم سے لے کر اب تک انسانوں کے سینے میں کانٹے کی طرح چبھتا رہا ہے۔لیکن اس بابت ہمارے کلاسیکل اور جدید شاعروں کے رویے میں تھوڑا سا فرق ہے۔ایک دفعہ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن مجھے اپنے سفرِ روس کا ایک واقعہ بیان کر رہے تھے (جس سے اس مسئلہ پر شاید کچھ روشنی پڑ سکے) وہ بتا رہے تھے کہ کمیونزم کی نظریاتی عصبیت کے باوجود روس میں جدید شاعری (چوری چھپے) پنپ رہی ہے۔وہاں کے ایک جدید شاعر نے شکیل الرحمٰن صاحب سے پوچھا کہ ''جدید حسیت کیا ہے؟'' اس سوال کا جواب ایک چھوٹے سے جملے میں دیجیے۔پھر اس شاعر نے خود ہی بتایا کہ ''It is the fear of Death''۔بات تو بظاہر بہت سچی معلوم ہوتی ہے اور دل کو لگتی بھی ہے۔لیکن سوال یہ ہے کہ موت کا ڈر کس دور کے انسان کو نہیں تھا؟ یہ ڈر تھا،ہے اور رہے گا۔فرق صرف اتنا ہے کہ کلاسیکل شاعری کے دور میں یہ ڈر انفرادی سطح پر ہے۔اس لیے جدید حسیت کو ''اجتماعی موت کے ڈر'' سے وابستہ کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔موت ایک ٹھوس اور ناقابلِ تردید حقیقت ہونے کے باوصف ہر دور میں انسان موت سے صرفِ نظر کرتا رہا ہے۔وہ اپنے دوست،احباب،عزیز و اقارب کی ابدی جدائی کو جدائی تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔مرنے کے بعد اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے کبھی وہ علم و ہنر کے میدان میں نقوش جاوداں چھوڑنے کی کوشش کرتا ہے،تو کبھی فنونِ لطیفہ کے میدان میں (حالانکہ اسے اس کا احساس ہے کہ یہ نقوش بھی نقوشِ جاوداں نہیں ہیں)۔جب انسان میں موت سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ نہیں رہتا تو وہ دل کو سمجھانے کی خاطر فلسفہ طرازی پر اتر آتا ہے۔کبھی وہ موت کو ماندگی کا وقفہ تصور کرتے ہوئے کچھ دیر تک دم لے کر آگے چلنے کی آرزو رکھتا ہے تو کبھی

کہتا ہے کہ ع

لوگ مرتے ہیں مگر ہرگز فنا ہوتے نہیں

کبھی وہ فلسفۂ تناسخ کا سہارا لیتا ہے تو کبھی موت کو محض نقلِ مکانی تصور کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جس طرح دنیا کی رنگینیوں میں کھوکر بچہ کبھی رحمِ مادر میں جانا نہیں چاہے گا اسی طرح اسے عاقبت کی دل فریبیوں کا اندازہ ہوجائے تو پھر اس دنیا میں لوٹ آنا پسند نہیں کرے گا۔ کہنے کی غرض یہ ہے کہ عہدِ حاضر میں بھی موت وہی ہے اور موت سے متعلق انسان کا ردِ عمل بھی وہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ دورِ حاضر میں انفرادی اور اجتماعی موت کے نئے نئے طریقے نکل آئے ہیں۔ طلحہ رضوی کے یہاں موت کا جو تصور ملتا ہے، وہ فلسفیانہ تصور ہے۔ موصوف فطری عناصر کو شاعرانہ علامت کی حیثیت سے قبول کرتے ہیں اور ان کی مدد سے زندگی کی بے ثباتی کی تصویر کھینچ دیتے ہیں۔ اس اعتبار سے ان کا رویہ میر کے رویے سے قریب تر ہے۔ اس کے باوجود میں کہوں گا کہ چونکہ ہماری صدی میں موت سے متعلق انسان کے جبلی ردِ عمل میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں آیا۔ اس لیے دورِ جدید میں بھی ان کے اس قسم کے اشعار کی ندرت و قیمت کم نہیں ہوتی ۔

بہار میں کوئی غنچہ جو کھل کے پھول ہوا — کچھ اور عاقبت اندیش دل ملول ہوا

ستارے جھانکتے ہیں شام کی فصیلوں سے — نہ جانے آخرِ شب ان کا حال کیا ہوگا

آیا خیالِ جامۂ ہستی کہ دفعتاً — غنچہ ہنسا، گلوں کی قبا چاک ہوگئی

سر اٹھایا تھا مگر ٹھہرے نہ بیش از یک نفس — جرمِ خود بینی پہ گویا بلبلے شرمندہ ہیں

فصلِ گل تازگی زخموں سے مرے لیتی تھی — خشک ہوہوکے گرے برگِ حنا میر بعد

سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس قسم کے اشعار میں جس طرح وارداتِ قلبی کا انعکاس ہوا ہے اور درد وغم کا عنصر جس طرح ایک مرکز پر سمٹ آیا ہے وہ ان اشعار کو دوامی قدروں کا حامل بناتا ہے۔

فطری عناصر کے توسط سے زندگی کی بے ثباتی کی عکاسی شیکسپئر اور کالی داس سے

لے کر میر، غالب اور اقبال تک ہر بڑے شاعر میں پائی جاتی ہے۔ طلحہ رضوی برق کے مندرجۂ بالا اشعار کو اسی عظیم روایت کا ایک تسلسل سمجھتا ہوں۔ ان کے یہاں فطرت کے ساتھ لگاؤ محض استعارہ کی حد تک ہے۔ وہ اپنی ذات کے اندر اس طرح فطرت کی انگڑائیاں محسوس کرنے لگتے ہیں کہ انھیں نہالِ درد کی شاخوں میں پھول کھلا ہوا محسوس ہوتا ہے اور خیالِ یار بھی انھیں فصلِ گل جیسا لگتا ہے۔ جب ان کے دل میں زخموں کے گلاب کھلنے لگتے ہیں تو ان کی پلکوں پر نہ جانے کتنے ستارے جگمگانے لگتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے ۔

نہالِ درد کی شاخوں پہ پھول کھلنے لگا — خیالِ یار بھی فصلِ گلاب ہے گویا

دل عجب شاخ ہے اے برق نہالِ غم کی — پھول ہر فصل میں کھلتے رہے لالوں کی طرح

اب بھی شاداب ہیں دل میں تری یادوں کے گلاب — لذتِ درد نے ان زخموں کو بھرنے نہ دیا

برق خوں رونے پہ بھی کم نہ ہوئی تیرہ شبی — کون سا نجمِ سحر دیدۂ تر نے نہ دیا

طلحہ رضوی برق کی حزنیہ لے کے بعد جو چیز مجھے سب سے زیادہ پسند ہے، وہ ہے ان کی شاعری میں فلسفیانہ اور متصوفانہ رنگ وآہنگ کا امتزاج جس سے شاعر کا مفکرانہ لب ولہجہ واضح ہوتا ہے۔ برق خود خانقاہی آدمی ہیں۔ ان کی شاعری کا متصوفانہ آہنگ غالباً تصوف سے ان کی اسی عملی وابستگی کا نتیجہ ہے۔ ان کے مفکرانہ لب ولہجہ کی چند مثالیں درجِ ذیل کررہا ہوں ۔

کیا ہے، کہاں سے ہے اور کیا ہوگا بالآخر اس کا وجود
مل کے سمندر سے وہ کہے گا بولا اک قطرہ پانی

یقین شیشۂ دل میں اتار لایا اسے
گماں رہ گیا صدیوں کا فاصلہ بن کے

قطرہ مجھے آمادۂ طوفاں نظر آیا
ذرہ ہے کہ خورشیدِ درخشاں نظر آیا

مری حکایتِ ہستی مرا یہ قصۂ شوق
ہے ماجرائے جنوں داستانِ حدث و قدم

دراصل حدوث وقدم کا مسئلہ اسلامی تصوف کا ایک ایسا بنیادی مسئلہ ہے جو''دویت واد'' یعنی شکتی اور پورش کی ثنویت کی یکسرنفی کرتا ہے۔موخرالذکر شعر میں شاعر نے اسی نظریاتی اختلاف کوفنی گرفت میں لانے کی کوشش کی ہے۔

مجھے اس بات پرخوشی ہے کہ برقؔ جدید شاعر نہیں ہیں، بلکہ روایت سے وابستگی کی وجہ سے جدید شاعروں کی بھیڑ سے ہٹ کر وہ اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔پھر بھی اس عہد میں سانس لینے والا ایک باشعور اور حساس شاعر کہاں تک عصری حسیت سے نظر بچا کے گزر سکے گا؟ طلحہ رضوی کے ذیل کے اشعار سے بہتر طریقے پر جدید حسیت کا اظہار اور کیا ہوسکتا ہے؟ ؎

چل کے ویران رہگزر تنہا
کاٹ دی عمرِ مختصر تنہا
بھولی یادوں کے سائبان تلے
تارے گنتا ہوں رات بھر تنہا
صاحبِ نظر بھی ہونا عجب سانحہ ہوا
جو نقش آیا سامنے دیکھا مٹا ہوا
ہر طرف کٹ رہی ہے یوں گویا
اک کھڑی فصل نسل آدم ہے

جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے طلحہ رضوی برقؔ کی شخصیت دو حصوں میں بٹی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ایک کا تعلق فصیح اور عام فہم زبان سے ہے اور دوسرے کا تعلق بلیغ اور عربی و فارسی آمیز مشکل زبان سے۔ان کے یہاں اول الذکر اسلوب نسبتاً زیادہ مؤثر اور دلکش ہوتا ہے۔کیونکہ اس میں وہ کاٹ ہوتی ہے جو اس دور کے بہت کم شعرا کو نصیب ہے۔چند مثالیں ملاحظہ

فرمائیے ؎

ہاں خوشی مجھ سے بھی ایک بار ملی تھی شاید
آپ سے ہو جو ملاقات ،دعا کہئے گا
شبِ غم تری یاد کیا لے گئی
اک احساس جینے کا تھا لے گئی
خفا موت سے زندگی سے غمیں
قضا آکے آخر منا لے گئی
جل رہا ہے لہو کا ہر قطرہ
پھر بھی روشن کوئی دیا نہ ہوا
یوں یاد تری دل کو چھوتی ہوئی گزری ہے
جیسے کبھی غربت میں یاد آئے وطن اپنا

ان کی عربی وفارسی آمیز زبان کی مثالیں ملاحظہ فرمائیے جو عبدالعزیز خالدؔ کے اسلوب کی یادتازہ کردیتی ہیں ؎

متاعِ جرأتِ دل وقفِ یک نگاہِ کرم — وجودِ بے سروساماں رہینِ ملکِ عدم
بڑھی جو تشنہ لبی ، ضامنِ حیات ہوا — خدنگ حرملۂ وقت ، ولولہ بن کے
سرِ معانی رہنِ وصال حروف ہے — خورشید کا سیاہیٔ شب میں وقوف ہے
گہنا چکا ہے کب سے مری شخصیت کا چاند — اے دوستو، یہ وقت صلوٰۃ الکسوف ہے
ساقی اس آبگینۂ نازک کی خیر ہو — صہبائے تند وجہِ شکستِ ظروف ہے
صوفیٔ صاف قلب کی نسبت کا پاس ہو — کہنے کو برقؔ آپ کا ملبوسِ صوف ہے

طلحہ رضوی برقؔ کے بعض اشعار ایسے ہیں جن میں چونکا دینے والے عجیب و غریب تشبیہات واستعارات پائے جاتے ہیں جنھیں ان سے قبل غالباً کسی اور نے نہیں باندھا تھا۔مثلاً ؎

ایک توہّم سو اندیشے، عشق میں ناکامی کا سبب
ان کی گلی تک جب بھی پہنچا ، بلّی رستہ کاٹ گئی

ہم اپنے سینے میں رکھتے ہیں حسرت و ارماں
کبوترانِ حرم کی طرح بسائے ہوئے

دل کیا ہے گویا ایک فلسطینِ آرزو
زنداں میں قیدیوں کو ملے کوئی اور کہاں؟

لوحِ جبیں سے مٹ نہ سکا ایک حرف بھی
لکھا ہے لکھنے والے نے کتنا دبا کے ہاتھ

برقؔ کی ایک غزل ہے جس کا آغاز یوں ہوتا ہے ع
''نگاہِ عشق اٹھ گئی ، جدھر جدھر جہاں جہاں''

اس غزل میں ٹکنیک کا یہ نیا تجربہ انجام دیا گیا ہے کہ ہر شعر کے مصرعِ ثانی میں صنعتِ ذوقافتین کے ساتھ ساتھ ہر قافیہ کی دو دو مرتبہ تکرار بھی ہوئی ہے۔مثلاً ؎

(۱)بھٹکتی جائے یہ نظر، کدھر کدھر کہاں کہاں
(۲)مرا وجود ضوفشاں ، سحر سحر اذاں اذاں
(۳)میں بام و در مکاں مکاں، اثر اثر ،زماں زماں
(۴)جگر جگر تپاں تپاں ، نظر نظر دھواں دھواں
(۵)وہ ابرو و مژہ بہم تبر تبر سناں سناں
(۶)فسانۂ حیات بھی خبر خبر گماں گماں

علی ہٰذالقیاس

طلحہ رضوی برقؔ کا یہ شعر پڑھ کر ؎

ہے خیر چشمِ عقل و دل جدھر ہے اور جہاں تک ہے
یہ کس کے حسن کا جلوہ زمیں سے آسماں تک ہے

میرا اپنا ایک بھولا بسرا شعر یاد آ گیا ؎

یہ آنکھیں لا سکیں گی تاب کیسے ان کے جلووں کی
رخِ پرنور کا پرتو زمین سے آسماں تک ہے

دونوں شعر کی مشابہت کو دیکھتے ہوئے کوئی بھی شخص ایک دوسرے کا چربہ یا سرقہ کہہ سکتا ہے۔لیکن سچ پوچھیے تو یہ مشابہت اس لیے ہے کہ سیکڑوں میل کی دوری کے باوجود ایک ہی تان میں ہم دونوں کا دل دھڑکتا ہے۔ یہ روزمرہ زندگی کا عام تجربہ ہے کہ دورانِ گفتگو کبھی کبھی ایک شخص دوسرے شخص کو کہتا ہے ''تم نے یار میری زبان سے یہ بات چھین لی۔ میں تو یہی بات کہنے جا رہا تھا'' میں سمجھتا ہوں کہ شعر کا توارد بھی اکثر اسی نوعیت کا ہوا کرتا ہے جس پر بغیر سوچے سمجھے سرقے کا الزام عاید کرنا عین ناانصافی ہے۔

غزل کے پہلو بہ پہلو برقؔ صاحب کو نظم گوئی پر بھی عبور حاصل ہے۔آج کے دور میں کتنے شاعر ہیں جو اس قسم کی پختگی اور شستگی سے اپنے خیالات کو منظوم کر سکتے ہیں؟ ؎

مستی فقر و جذبِ عشق ، پردہ درِ رخِ حیات
چشمِ حقیقت آشنا، منہمکِ تجلیات
درد جو نقش بن گیا سینۂ واشگاف کا
ضبطِ قلم ہوئی تمام قلب کی تازہ واردات
رازِ درونِ میکدہ ، فاش ہوئے جو سر بسر
خونِ جگر سے ہر غزل تابشِ چہرۂ ثبات

(نظم ''نذرِ اقبالؔ'')

ان کے اس مجموعہ ''شایگاں'' میں دو آزاد نظمیں ''اندیشہ'' اور ''انا اللہ'' بھی شامل ہیں جن کا شمار ان کی کامیاب ترین تخلیقات میں ہوسکتا ہے۔ان نظموں سے یہ بھی بشارت ملتی ہے کہ اگر وہ غزل کے پہلو بہ پہلو نظم گوئی کی طرف خاطر خواہ توجہ مرکوز کریں تو اسی عہد کے اہم نظم نگاروں میں ان کا شمار ہونے لگے گا۔ان کی نظموں کی طرح ان کی رباعیاں بھی بہت عمدہ ہیں اور ان کی

زندگی کے پختہ تجربات کی مظہر۔جیسا کہ انھوں نے خود کہا ہے۔

مضمون دمِ فکر ادق آتا ہے
تخئیل کے ماتھے پہ عرق آتا ہے
خونِ جگر و دل سے مرے شعر میں برقؔ
نورِ سحر و رنگِ شفق آتا ہے

یہ خونِ جگر و دل کا کرشمہ ہے کہ جدید شاعری کی اکتا دینے والی یکسانی کے دور میں ''شایگاں'' جیسا مجموعۂ کلام ادب کے سنجیدہ قارئیں کا محض ذائقہ ہی نہیں بدلے گا بلکہ ان کے ادبی ذوق کی آسودگی کے لیے بھی وافر سامان مہیا کرے گا۔ان شاءاللہ۔

○○○

رباعیاتِ برقؔ

مولانا ڈاکٹر سید عبداللہ عباس ندوی

پروفیسر شاہ طلحہ رضوی برقؔ کو ایک ادیب، صاحبِ قلم اور ناقد ومحقق کی حیثیت سے عرصہ سے جانتا ہوں۔ان کے مضامین موقر علمی مجلّات ورسائل میں دیکھتا رہا ہوں۔ان کے تحقیقی مقالات کا مجموعہ ''نقد سنجش'' ایک علمی ماخذ کا درجہ رکھتا ہے۔فارسی کا ذوق ان کو ورثہ میں ملا ہے، اس پر وہ ماہرانہ دسترس رکھتے ہیں۔فنِ رباعی پر ان کے مقالات، ان کی نکتہ رسی، دقیقہ سنجی اور وسعت معلومات کا آئینہ ہیں۔ان اوصاف دانشوری اور معاصر دانش گاہ کے استاد ومربی ہونے کے ساتھ پروفیسر برقؔ شاہ صاحب بھی ہیں۔صاحب سبحہ وسجادہ اور حامل جبہ ودستار، ذکر خفی اور ضرب جلی دونوں سے آگاہ اور منازل سلوک ومقامات کے آشنا۔ان کی رباعیوں میں اگر ایک طرف قدرت کلام اور قوت تعبیر جلوہ گر ہے،فن کی باریکیاں اور موضوع سخن کے لحاظ سے الفاظ کا انتخاب، حسنِ تلاش نمایاں ہے تو دوسری طرف دعوت واصلاح، فرد ومعاشرہ کی تربیت کا پہلو بھی لفظ لفظ سے آشکارا ہے۔وہ مشرکانہ عقائد پر بجلی بن کر کڑکتے اور برق بن کر گرتے ہیں۔مسلم معاشرہ جن معاصی میں مبتلا ہے،جہل واسراف اور جاہلانہ رسوم کا خوگر ہوگیا ہے ان پر ان کی کڑی نظر ہے۔وہ معصیت کے زخموں اور فاسد مواد کو دیکھ رہے ہیں اور ان پر اپنی رباعیوں سے نشتر لگا رہے ہیں۔فلم، ٹی وی کی پیدا کردہ نحوستوں سے آگاہ کرتے ہیں۔رشوت، بداخلاقی، جنسی بے راہ روی پر متنبہ کرتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں براہ راست کہتے ہیں۔میں نے ان کی رباعیوں کو جہاں

تک پڑھا کوئی بے مقصد نہیں ہے اور نہ شاعری برائے شاعری ہے اور نہ ہی لفظ وانشاء کی نمائش ہے۔

اللہ کے نام سے ابتدا کرتے ہیں، سجدے میں ہے کائنات، مسجود اللہ اور پھر ایک خالص صوفیانہ سرمستی میں انسان کو جھنجھوڑتے ہیں۔

دنیا میں ہے کیا ؟ دکھاؤ الا اللہ
دھوکے میں اس کے نہ آؤ، الا اللہ
پلکوں سے گرادو اسے تم صورتِ اشک
اک ضربِ جلی لگاؤ ، الا اللہ

کتنی سادگی اور روزمرہ کا انداز ہے۔''دنیا میں ہے کیا؟ دکھاؤ الا اللہ'' یہ شعر زبان کا ہے مگر دل میں اترنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔اس طرح سویدائے قلب میں اپنی جگہ بنوانے والا انداز''**یداللہ فوق ایدیھم**''کی تفسیر۔

جس شاہ کو حاصل ہو شہنشاہ کا ہاتھ
کیوں ناز تصرف نہ ہو ذیجاہ کا ہاتھ
مشکل میں کرے گا دستگیری میری
وہ ہاتھ ہے جس پر مرے اللہ کا ہاتھ

اصنافِ سخن میں رباعی بہت نازک صنف ہے۔اس کے وزن اور معنی دونوں میں اچھوتا پن ہوتا ہے۔چار مصرعے چار اکائیاں ہوتی ہیں اور آخری مصرع یعنی چوتھا مصرع پوری رباعی کی جان ہوتا ہے۔اس کو بہت رواں اور پرمغز وپرمعنی ہونا چاہیے۔جناب برقؔ اس منزل سے آسانی سے گزر گئے ہیں اور یہ تمام التزامات اپنی بھرپور رعایتوں کے ساتھ ان کی رباعیوں میں موجود ہیں۔

یہ رقص و سرور ، یہ منظرِ بوس و کنار
ناگفتی نادیدنی کا یوں اظہار

احساسِ حیا و شرم مرنے کے قریب
ٹی وی؟ ہے خدا کی لعنت اللہ کی مار

ایک دوسری رباعی کا آخری مصرعہ ہے

ٹی وی سے سوا میٹھا کوئی زہر نہیں

حضرت اکبرآبادی کا رنگ بھی ایک رباعی میں جھلکتا نظر آتا ہے۔

صد حیف کہ اسلاف کی خوبو نہ رہی
عاصی کے لیے صدائے توبوا نہ رہی
سسٹر نے رٹایا بھی تو ٹوینکل ٹوینکل
الحمد پڑھا دیتی وہ بوبو نہ رہی

قرآن کریم کی آیات کے الفاظ اور کہیں پر مکمل جملے اس طرح ان رباعیوں میں آگئے ہیں کہ اردو کی سلاست قائم رہی اور معنویت میں اضافہ بھی ہوگیا۔پردہ پر ان کی رباعیوں میں سے ایک رباعی سنیے۔

یدنین علیھن کی آیت تو پڑھو
یضربن علی جیوبھن سمجھو
اللہ کی طاعت کا ہے دعویٰ ہی غلط
جب بیٹیوں کو کہہ دیا بے پردہ پھرو

میں ان رباعیوں کو جتنی بار پڑھتا ہوں لطفِ سخن تازہ ہوتا ہے مگر اس کے ساتھ فکر اسلامی (جو مجموعہ اخلاقیات کا دوسرا نام) کی روح بھی نکھرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

عربی کے مشہور ناقد اور علمِ بلاغت کے امام شیخ عبدالقاہر جرجانی علیہ الرحمۃ (متوفی ۱۴۱۷ھ) اپنی شہرہ آفاق تصنیف''اسرارالبلاغۃ''میں لکھتے ہیں:

''الفاظ اپنی جگہ پر اہمیت ضرور رکھتے ہیں مگر وہ سب الفاظ کے خادم ہیں اور معانی مشاہدات، تجربات کے ساتھ ساتھ شعور کی پاکیزگی سے پیدا

ہوتے ہیں''۔

شعور کی پاکیزگی کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اس پر اخلاقیات کا پرتو ہے اور ظاہر کا باطن پر انعکاس ہے۔ یہ دیر میں حاصل ہوتا ہے۔ اس کے لیے ماحول، صحبت اور طبیعت کا اخاذ ہونا ضروری ہے۔ شاہ طلحہ رضوی برقؔ نے بزرگانِ ادب و علم کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ خود ان کے والد ماجد علامہ قتیلؒ درویش خدامست ہونے کے ساتھ چوٹی کے دانشوروں میں تھے۔ فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے۔ اردو ان کے گھر کی باندی تھی۔ نکتہ سنج، زیرک ہونے کے ساتھ درد آشنا طبیعت کے مالک تھے۔ ان کی براہِ راست صحبت و تربیت نے برقؔ کے مس خام کو کندن بنا دیا۔ ان کو نوعمری میں ان کے خالو علامہ تمنا عمادی اور ان کے شاگردوں کی مجلسیں ملیں جہاں ایک طرف قرآن پاک کا درس تھا، حدیثِ نبوی اور اسماء الرجال پر تحقیقات کا سلسلہ تھا، دوسری طرف فن عروض میں امامت (اتھارٹی کا درجہ) کے مقام پر فائز تھے۔ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں کے شعری سرمایوں کو کھنگالے ہوئے تھے۔ برقؔ کی ادبی شخصیت کی تعمیر میں اسی طرح کے عناصر شامل ہیں جنھوں نے ان کے ظاہر کو سنوارا اور باطن کو آراستہ کیا اور فکر و ذوق کو جلا بخشی۔ شعور کی پاکیزگی صرف کتاب خوانی اور ورق گردانی سے حاصل نہیں ہوتی اس کے لیے کتابِ دل کے اوراق کھولنے کی ضرورت ہوتی ہے ؎

از ''کنز'' و ''ہدایہ'' نہ تواں یافت خدا را
سی پارۂ دل خوان کہ کتابی بہ ازیں نیست

مجھے پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ پسند ہیں۔ ان کا کلام بھی وجد آفریں ہے۔ ان کی تحقیقات میں متانت، شرافت اور توازن ہے مگر ایک بات پسند نہیں ہے۔ وہ اپنی کتابوں کے نام بہت نامانوس الفاظ سے ترتیب دیتے ہیں جس کو سمجھنے کے لیے ڈکشنری سے مدد لینا پڑے یا کسی ماہرِ زبان کی طرف رجوع کرنا پڑے۔ ملاحظہ فرمایئے ''نقد سنجش'' ''ارزشِ ادب'' ''شایگاں''۔ اب بتایئے نقد، ادب تو سمجھ لیا سنجش اور ارزش کہاں بولا جاتا ہے۔ طہران و اصفہان کی کسی دانش گاہ میں یہ الفاظ مقبول ہوں تو ہوں، اس ملک (برصغیر) میں تو یہ الفاظ مانوس نہیں ہیں۔ میرا

مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی کتابوں کے نام ''طوطا نامہ، مینا نامہ، قصہ گل بکاؤلی کی طرح رکھیں مگر گلشنِ بے خار، آبِ حیات، گلِ رعنا کی طرح کوئی نام تصنیف کر سکتے تھے۔ کتاب کا نام ایسا ہو جو ''مافی الکتاب'' کی ایک جھلک دکھا دے۔ ایک زبان زد عوام پسند مصرع ہے ع

خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر

مگر ارزش اور سنجش جیسے نام کو ہم عوام کیا سمجھ سکتے ہیں۔ مگر ہم میں وہ ''عوام'' ہیں جو ان کی تحقیقات کو سراہتے، شعروں کی داد دیتے اور ان کی رباعیاں پڑھتے ہیں اور پڑھیں گے اور اس یقین کے ساتھ کہ یہ مجموعۂ شاعری نہیں بلکہ میکدۂ عرفان و محبت کی آواز ہے۔ خدا سے دعا کرتے ہیں کہ یہ آواز اونچی ہوتی رہے، پھیلتی رہے اور کانوں سے نکل کر دلوں کے بند دروازوں پر دستک دیتی رہے۔

(شہاب سخن ص ۱۰)

○○○

پروفیسر برقؔ: بحیثیت رباعی گو

پروفیسر سید وحید اشرف کچھوچھوی

پروفیسر سید طلحہ رضوی برقؔ ہماری نسل کے اردو اور فارسی کے ممتاز دانشوروں میں ہیں۔ اردو و فارسی کا شعری اور ادبی ذوق ان کو ورثہ میں ملا ہے۔ ادبی ماحول اور اساتذہ کی صحبت و تربیت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ روحانی گھرانے کے پروردہ ہونے کے سبب خانقاہیت اور صوفی منشی طبیعت میں رچ بس گئی۔ ماحول، تربیت اور فطری ذوق نے ان کی شخصیت میں وہ نکھار پیدا کر دیا جس میں دل و دماغ، دین و دنیا اور روح و مادّہ کا متوازن امتزاج نظر آتا ہے۔ خانقاہیت کے ساتھ عمل، حرکت اور محنت و مشقت، روحانیت کے ساتھ ادبی اور شعری لطافت اور گوشہ گیری کے ساتھ دیدہ وری، یہ ان کی متوازن شخصیت کے چند پہلو ہیں۔

پروفیسر برقؔ ادب کے استاد، محقق اور انتقادی بصیرت کے حامل دانشور ہیں۔ تعلیم و تدریس کے ساتھ تحقیق میں رہنمائی ان کے پیشہ ورانہ فرائض میں داخل ہے۔ اس کے علاوہ نثر و نظم میں ان کے رشحات قلم ہمارے ادب کا قابلِ قدر سرمایہ ہیں۔

برقؔ کا ایک شعری مجموعہ ''شایگاں'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے جو ان کے پختہ ادبی ذوق اور فکرِ سلیم کی عکاسی کرتا ہے۔ کتاب ''شایگاں'' ہماری موجودہ اردو شاعری میں قابلِ اعتبار مقام رکھتی ہے جو موجودہ دور کے چند ممتاز شعری مجموعوں میں جگہ پانے کی مستحق ہے۔

اپنے فکر و فن کے پختہ شعور کے ساتھ برقؔ نے اب رباعی میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور

بجا طور پر ان کا یہ حق ہے بلکہ کہنا یہ چاہیے کہ اردو رباعی ان کے قلم کی منتظر تھی اور خود یہ رباعیاں ہمارے اس دعوے کی دلیل ہیں۔ میرے لیے یہ باعث مسرت ہے کہ اس مجموعہ میں شمولیت کے لیے مجھے ان رباعیوں پر اظہار خیال کا موقع ملا ہے ورنہ ان کی شخصیت اور شاعری کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔

برقؔ نے ان رباعیوں میں وہی کچھ لکھا ہے جو انھوں نے دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا ہے اور فن کو اسی طرح برتا ہے رباعی جس کی مستحق ہے۔ ان کی رباعیوں میں تاثیر کا یہی راز ہے۔ وہ اپنی مسلمہ اخلاقی قدروں کو اجاگر کرنے میں کسی لیت و لعل سے کام نہیں لیتے۔ نئی تہذیب کی جلوہ گری اور نئی شاعری کا فیشن ان کی حق نگر اور دور بیں نگاہوں کو خیرہ نہیں کر سکتے۔ وہ جسے سچ سمجھتے ہیں اس کے اظہار میں کوئی باک نہیں رکھتے۔ ان کی قدریں پرانی ہیں لیکن ان کی رباعیاں تازگیِ اظہار کے سبب حالیؔ اور اکبرؔ کی رباعیوں سے زیادہ پُر تاثیر اور پُر کشش ہیں۔ زبان و بیان کی چاشنی، لفظوں کا باسلیقہ استعمال، مضمون آفرینی کے ساتھ پُر کیف اظہار اور رباعی کے چوتھے مصرع کی جامعیت تقریباً ان کی سبھی رباعیوں میں پائی جاتی ہیں۔

رباعیوں کے موضوعات میں تصوف، نعت، منقبت، مذہبی اخلاقیات، موجودہ دور کے سماجی بگاڑ اور ان کی اصلاح کا جذبہ اور سسکتی ہوئی انسانیت کے لیے پیغامِ عمل سبھی کچھ موجود ہیں۔ رباعی ابتدا ہی سے صوفیانہ خیالات اور اخلاقی تعلیمات کی حامل رہی ہے۔ برقؔ نے اردو میں یہ رباعیاں لکھ کر اس روایت کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی یہ صحت مند جرأت قابلِ ستایش ہے۔ یہ ان کا حق بھی تھا اور فرض بھی جسے انھوں نے پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔

برقؔ کی رباعیوں میں ایک وصفِ خاص یہ نظر آتا ہے کہ انھوں نے متعدد ایسی رباعیاں لکھی ہیں جن میں قرآنی تعلیمات، آیاتِ قرآنی یا ان کے ٹکڑے اس طرح استعمال کیے ہیں گویا انگوٹھی میں نگینہ جڑ دیا ہے۔ بعض دوسرے اردو رباعی گو کے وہاں بھی یہ کوشش ملے گی لیکن زیادہ تر یہ نظر آتا ہے کہ جب فکر نے ساتھ چھوڑ دیا تو قرآنی آیات اور فلاسفہ کے اقوال کو سامنے رکھ کر رباعی

کے وزن میں نظم کردیا۔اس سے صرف یہ ہوا کہ عروضی اعتبار سے رباعی درست ہوگئی لیکن شعریت تاثیر سے محروم رہی۔ برقؔ کا یہ امتیازی وصف ہے کہ انھوں نے ایسے موقع پر شعریت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ذیل میں چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

قرآن میں ہے''الفتنة اشد من القتل'' اس کو ایک مصرع میں یوں ادا کیا ہے

ع

بڑھ کر ہے کہیں قتل سے فتنہ خیزی

قرآن میں ہے **ادعونی استجب لکم**. اس ٹکڑے نے کس طرح رباعی میں جان ڈال دی ہے ۔

دی اس کو ہدایت ، اسے کم فرمایا
بے اذن نبی نے بھی نہ قم فرمایا
مایوس کوئی کیوں ہو جب اللہ نے خود
ادعونی استجب لکم فرمایا

قرآن میں ہے کہ ماں باپ کو اُف بھی نہ کہو۔اس اسلامی اور اخلاقی تعلیم کو کس سادہ طریقہ سے رباعی کے جامہ میں پیش کیا ہے ۔

آواز اگر دیں تو توقف نہ کرو
نقصان بھی کچھ ہو تو تاسف نہ کرو
جھڑکو نہ انھیں بچھادو بازو جھک کے
ماں باپ کی خدمت میں کبھی اُف نہ کرو

اسلام میں دنیا کو آخرت کی کھیتی کہا گیا ہے۔اس کے لیے صاف اور سادہ مصرع دیکھیے ع

مومن کو ہے آخرت کی کھیتی دنیا

خانقاہوں کے حالِ زار پر کس درد بھرے انداز میں کہتے ہیں ۔

پیغامِ عمل جو کر رہا تھا ارسال
دیکھا نہیں کیا اس نے مرا حال اور قال
افسوس کبھی اس پہ توجہ ہی نہ کی
کیوں روٹھ گیا خانقہوں سے اقبال

نئی تہذیب اور خصوصاً ٹی وی پر کئی رباعیاں ہیں اور سبھی موثر اور حقیقت پر مبنی ہیں۔ ایک ایسی رباعی یہاں نقل کی جاتی ہے ۔

میک اپ سے جو چہرہ تروتازہ نکلا
عریانی و بے شرمی کا غازہ نکلا
ٹی وی نے سکھائی بے حیائی ایسی
تعلیم کا گھر گھر سے جنازہ نکلا

ذیل کی رباعی میں قافیوں کی ندرت اور انگریزی لفظ سے جو اشاریت پیدا کی ہے اس نے ایک معمولی بات کو رباعی کے لباس میں کس قدر موثر اور جاذب توجہ بنادیا ہے ۔

صد حیف کہ اسلاف کی خوبو نہ رہی
عاصی کے لیے صدائے توبو نہ رہی
سسٹر نے رٹایا بھی تو ٹوینکل ٹوینکل
الحمد پڑھا دیتی وہ بوبو نہ رہی

سماج میں مادّیت ہی غالب آتی جارہی ہے اور روحانی قدروں کا احساس جارہا ہے۔ رباعی کے آخری دو مصرعے دیکھیے ۔

دس ڈاکٹر اک چھینک پہ آجاتے ہیں
بیمار ہے روح اس کا نہیں کوئی علاج

تاریکی میں راستہ نظر نہ آنا ایک بدیہی بات ہے۔اس حقیقت سے کس طرح فائدہ اٹھایا ہے ۔

ضد، جہل، حسد، بغض، عداوت، کینہ
دل سینے میں علتوں کا ہے گنجینہ
ہے اُنس عجب نظر کو تاریکی سے
گم کیوں نہ ہو پھر ترقیوں کا زینہ

حسین علیہ السلام حق وصداقت کی علامت کے ساتھ مظلومیت کی بھی علامت ہیں اور شعرانے کثرت سے اس تلمیح سے فائدہ اٹھایا ہے۔ برقؔ نے اس تلمیح سے فائدہ اٹھا کر ایک اچھوتا انداز پیدا کیا ہے ۔

حق کہنے پہ یہ ظلم و ستم یہ بیداد
کثرت کا غرور، فکرِ باطل کا فساد
مظلوم حسین آج بھی ہیں ان میں گھرے
ہے شمر لعین ادھر، ادھر ابن زیاد

ایک اور سماجی حقیقت کا اظہار ۔

چیتک، ٹی وی کلر، فرج، وی سی آر
سونے کی گھڑی، نقد ہو پنچاہ ہزار
ہے شرط یہ نوشاہ کی اور مہر عروس
کہتے ہیں فقط یازدہ صد وہ بھی ادھار

ایسی ہی ایک رباعی دیکھیے ۔

کیا چاہتا ہے زیست کی ماری مرجائے
گھٹ کر یونہی بے نالہ و زاری مرجائے
دو نمبری پیسوں سے یہ سامانِ جہیز
تو شادی میں لے، بہن کنواری مرجائے

غرضیکہ برقؔ نے اپنی رباعیوں سے اصلاح کا کام لیا ہے۔انھیں اس کی پرواہ نہیں کہ

ادب کے بازار میں کون سا سکہ رواں ہے۔ وہ صرف سچائی کا کھرا سکہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی بیشتر رباعیاں صاف وسادہ اور چست وچاق ہیں۔ بیان میں کوئی جھول نہیں ہے نہ بیان بالکل سپاٹ ہے۔ ان میں زبان کا لطف بھی ہے اور بیان کی تاثیر بھی۔ برقؔ رباعی کے مزاج سے پوری طرح واقف ہیں اور اس کو مہارت کے ساتھ برتنا جانتے ہیں۔ ان کی رباعیوں کو کبھی نظر انداز نہ کیا جاسکے گا اور امید ہے یہ رباعی ان کو رباعی کے میدان میں معتبر مقام عطا کریں گی۔

(شہاب سخن ص۵)

○○○

ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ

ایک رباعی نگار کی حیثیت سے

پروفیسر فاروق احمد صدیقی

ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ اردو و فارسی شعر و ادب کی ایک ممتاز و محترم شخصیت کا نام ہے۔ علم، تصوف اور شاعری کی تثلیث سے ان کی شناخت بنتی ہے اور یہ چیزیں ان کو ورثہ میں ملی ہیں۔ ان کے والد گرامی حضرت علامہ سید شاہ محمد قائم رضوی قتیلؔ دانا پوری ملک کے ایک نامور خطیب، شیخ طریقت، صوفی باصفا اور استاد الشعرا کی حیثیت سے مرکز عقیدت و مرجع خلائق رہے ہیں۔ جس فرزند سعید نے ایسے محمود الصفات باپ کے ظل عاطفت میں تعلیم و تربیت حاصل کی ہو اس کی اقبال مندی کا کیا پوچھنا۔ چنانچہ آج ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ ایک بلند پایہ شاعر، ناقد، محقق اور دانش ور کی حیثیت سے ہند و پاک میں جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ دانا پور کی قدیم خانقاہ چشتیہ نظامیہ کے زیب سجادہ بھی ہیں۔ وہ صحیح معنوں میں اپنے والد کے علمی وارث ہیں۔ اردو فارسی دونوں ادب کے وہ محرم اسرار ہیں جس طرح ان کی نثری تحریروں میں شرافت کے موتی جھلملاتے ہیں ان کی شاعری بھی اعلا انسانی قدروں کی امین و علمبردار ہے ان کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ''شایگاں'' جو بہت پہلے منظر عام پر آچکا ہے اس کے مطالعے سے ہمارے دعوا کی تصدیق ہوگی۔ اس وقت صرف ان کی اردو رباعیات زیرِ بحث ہیں۔ ان کی رباعیات کا دلکش مجموعہ ''شہابِ سخن'' کے نام سے کوئی دو سال قبل شائع ہوا ہے اور وہی ابھی میرے زیر مطالعہ ہے۔ یعنی بحیثیت رباعی نگار میں ان کی فتوحات کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔

رباعی ایک ایسی الھڑ دوشیزۂ سخن ہے جو مکمل طور پر آج تک کسی کے قابو میں نہیں

آسکی۔ محمد قلی قطب شاہ سے ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ تک کوئی ایسا شاعر نہیں جس کی شناخت صرف رباعی کی بدولت ہوتی ہو۔ جیسے فارسی میں خیام کی ہوتی ہے۔ ہاں کچھ ایسے استادانِ فن ضرور ہوئے ہیں جنھوں نے اس صنفِ لطیف میں کامیاب تجربے کیے ہیں اور جن کے تصانیف میں رباعیات کا بھی ذخیرہ موجود ہے۔ جیسے انیس، دبیر، امجد حیدرآبادی، حالی، یگانہ چنگیزی، جوش، فراق اور شاہ قتیل رضوی وغیرہم۔

عصرِ حاضر میں ڈاکٹر وحید اشرف کچھوچھوی، ناوک حمزہ پوری، نادم بلخی اور ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ نے پورے طور پر اپنے آپ کو صنف رباعی کے لیے وقف کر رکھا ہے اور ان سب کی رباعیات کے مجموعے چھپ چکے ہیں جو غزل و نظم کی آمیزش سے کلیتاً پاک ہیں۔

ان حضرات میں ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ کا امتیازِ خاص یہ ہے کہ رباعی کے فن پر بھی ان کی عمیق نظر ہے۔ انھوں نے متعدد مضامین و مقالات کے ذریعہ رباعی کی فنی حیثیت سے عالمانہ بحث کی ہے اور اعلا درجے کی رباعیاں بھی کہی ہیں۔ ''شہابِ سخن'' کی تقریظ میں ڈاکٹر سید وحید اشرف کچھوچھوی لکھتے ہیں:

> ''اپنے فکر و فن کے پختہ شعور کے ساتھ برقؔ نے ادب رباعی میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور بجا طور پر ان کا یہ حق ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ اردو رباعی ان کے قلم کی منتظر تھی''

مولانا ڈاکٹر سید عبداللہ عباس ندوی رباعیاتِ برق پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''فن رباعی پر ان (ڈاکٹر برق) کے مقالات، ان کی نکتہ رسی، دقیقہ سنجی اور وسعتِ معلومات کے آئینہ ہیں۔ ان کی رباعیوں میں اگر ایک طرف قدرتِ کلام اور قوتِ تعبیر جلوہ گر ہے فن کی باریکیاں اور موضوعِ سخن کے لحاظ سے الفاظ کا انتخاب، حسنِ تلاش نمایاں ہے تو دوسری طرف دعوت واصلاح، فرد و معاشرہ کی تربیت کا پہلو بھی لفظ لفظ سے آشکارا ہے''

''شہابِ سخن'' میں کل ۱۹۶؍ رباعیات ہیں ان میں سے دو کا موضوع توحیدِ الٰہی

ہے ۱۳/نعتیہ رباعیاں ہیں۔ حضرت علی، خواجہ غریب نواز اور حضرت نظام الدین اولیاء کی شان میں ایک ایک رباعی ہے۔ امام عالی مقام سیدنا حضرت حسین کی منقبت میں ۶/رباعیاں ہیں۔ ۴ رباعیوں میں قربانی کی فضیلت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ۱۴ میں ماہِ صیام کی عظمتوں اور برکتوں کا بیان ہے۔ بقیہ تمام اصلاحی نوعیت کی ہیں۔ حمد، نعت، منقبت اور اسلامی اخلاقیات سے متعلق رباعیات میں ڈاکٹر برق نے اپنے عقیدے اور عقیدت دونوں کی بھرپور ترجمانی کی ہے لیکن یہ محض فکر منظوم کے سپاٹ نمونہ نہیں بلکہ شاعرانہ آب و رنگ سے پوری طرح مزین و مملو ہیں۔ مذہبی شاعری پر ایک عام الزام یہ ہے کہ وہ جمالیاتی حسن سے عاری ہوتی ہیں میرا خیال ہے کہ ''تلوار کاٹتی ہے مگر ہاتھ چاہیئے''۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر برق کی ان رباعیوں کو دیکھیے جو نعتِ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم میں ہیں ۔

آفاق ہوئے صبح کی پو سے روشن　　ذرات ہوئے شمس کی ضو سے روشن
ہاں طاق ازل میں جل رہا تھا جو چراغ　　سینے میں ہے دل اس کی لو سے روشن

بجلی سی کہیں سبک گئی تھی گویا　　رفعت بھی قدم پہ جھک گئی تھی گویا
بستر تھا گرم ہل رہی تھی زنجیر　　کونین کی سانس رک گئی تھی گویا

اس طرح امام حسین کی منقبت میں حسبِ ذیل فنی اعتبار سے کتنی زوردار اور مایہ دار ہے۔ ملاحظہ ہو ۔

مانو کہ نہ مانو یہی حق ہے سن لو　　کس کس کا کلیجہ نہیں شق ہے سن لو
کربل کا یہ سخت امتحان اور حسین　　جبریل کے ماتھے پہ عرق ہے سن لو

الغرض ڈاکٹر برق کی مذہبی رباعیات ہوں یا اصلاحی رنگ و مزاج کی حامل۔ ہر جگہ بلند اور فنِ لطیف کی حسین آمیزش ملتی ہے۔ اور فکر کے قامت پر فن کی قبا بالکل چست نظر آتی ہے اور بعض جگہ تو ''آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے'' کا تماشہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ رمضان سے متعلق ایک رباعی ملاحظہ ہو جس میں شاعر کے دل کا اضطراب، روحانی کرب

اور شدتِ احساس ہمیں جھنجھوڑتا ہے۔ وہ سادات کرام جن کے گھر سے اسلام کا نور پھیلا آج ان کے اخلاف کا کیا حال ہے۔ ڈاکٹر برق کے مشاہدے کی روشنی میں دیدۂ حیرت سے پڑھیے ۔

لوگ آتے کہ کچھ دین کی باتیں لے لیں　　عبرت کا سبق بھی ہم اب ان ہی سے لیں
شیطان نہ کیوں قید میں ٹھٹھا مارے　　سادات جو روزہ رکھ کے ہولی کھیلیں

آخری مصرعہ کس قدر زہرہ گداز اور کرب ناک ہے اہلِ نظر اندازہ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح درجہ ذیل رباعی بھی ایک اہم مسئلہ کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتی ہے ۔

ہے دل سے دعا یہ شکر احسان کے بعد　　پابند نماز ہوں وہ رمضان کے بعد
جو سورۂ تراویح نہیں پڑھتے ہیں　　چھے سات شبوں میں ختمِ قرآن کے بعد

آج واقعی ہر چھوٹے بڑے شہر میں یہی ہو رہا ہے کہ پانچ چھے شب میں تراویح میں ختم قرآن کر لیا جاتا ہے اور اس کے بعد لوگ سمجھتے ہیں کہ چھٹی ہو گئی۔ حالانکہ پورے رمضان میں نماز تراویح موکدہ ہے اس میں قرآن کا پڑھنا تو محض مستحب ہے۔

ڈاکٹر برق نے اسلامی معاشرہ کی ایک بڑی کوتاہی کی طرف اشارے کیے ہیں اور بڑے پرخلوص انداز میں جس کی توثیق رباعی کے پہلے اور دوسرے مصرعے سے ہوتی ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ۔

شعرِ اکبر میں کوئی کشف و کرامات نہیں
دل پہ گزری ہوئی ہے اور کوئی بات نہیں

(اکبر کی جگہ تھوڑی دیر کے لیے طلحہ کو پڑھ لیجیے)

ڈاکٹر برق کے اس حوصلہ کی داد دیجیے کہ وہ خود خانقاہی ہیں عرس پاک کے قائل اور اس پر عامل بھی ہیں۔ اس کے باوجود اعراس میں ہونے والی بے اعتدالیوں اور غیر شرعی حرکتوں پر کڑی نظر رکھتے ہیں اور ان کا سختی سے محاسبہ کرتے ہیں یہ شریعتِ مطہرہ سے ان کی بے پایاں عشق ہی ہے جس نے ان سے یہ رباعیاں کہلوائی ہیں ۔

ارواح بزرگوں کو نہ یوں شرماؤ   ہے پاک چڑھاوا کہ نجس، سوچ کے کھاؤ
درگاہوں پہ یہ کافر و مشرک کا ہجوم   قبروں پہ مگر سجدے تو نہ کراؤ

یہ سجدہ ، طواف، کافروں کے رسوم   قبروں پہ زنان غیرمسلم کا ہجوم
کس طرح چڑھاوے پہ ہے دیدہ گاڑے   بیٹھا سرہانے جو وہ اک صورت بوم

تیسرے مصرعے میں ''دیدہ گاڑے'' کی ترکیب کتنی پرمعنی، بلیغ اور مبنی برحقیقت ہے محتاج وضاحت نہیں۔

آج ہر شخص دولت جمع کرنے اور تعیش پسندانہ زندگی بسر کرنے کی دھن میں لگا ہوا ہے۔ راتوں رات لاکھ پتی اور کروڑ پتی بن جانے کی ترکیب اور تدبیریں ڈھونڈتا رہتا ہے۔قطعِ نظر اس سے کہ وہ آمدنی حلال و جائز بھی ہے یا نہیں۔ڈاکٹر برق ان دنیا پرستوں پر یوں برقِ خاطف گراتے ہیں ؎

نادان مری بات کو کیوں کر بوجھے   ساون کا ہو اندھا تو ہری ہی سوجھے
دنیا پہ جھپٹ رہے ہیں اس طرح سے لوگ   مردار پہ جیسے چیل کوّا لوجھے

غافل کبھی اللہ سے انسان نہ ہو   دشوار سفر ہو اتنا سامان نہ ہو
دے رزقِ حلال سے وہ تسکین یارب   دنیا کی طمع سے دل پریشان نہ ہو

فتنہ پردازی اور جنگ وجدال بھی ہمارے معاشرہ کا ایک سنگین مسئلہ ہے۔قرآن پاک نے فتنہ پردازی کو قتل سے بھی زیادہ شدید اور ہولناک قرار دیا ہے۔چنانچہ برقؔ صاحب فرماتے ہیں۔

اشعار بھی رکھتے نہیں اتنی تیزی   نیشاپوری ہوں کہ ہوں تبریزی
نقصان کی شدت کا جہاں تک ہے خیال   بڑھ کر ہے کہیں قتل سے فتنہ خیزی

اسی طرح غیبت کی مذمت کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

غیبت میں وہ غیبت کہ بس اللہ کی پناہ   اور ملیے تو پھر سامنے اخاہ! اخاہ
کہتے ہیں منافقت اسی کو لیے برقؔ   لاحول ولاقوۃ الا باللہ

پیرایہ بیان کتنا صاف اور دلنشیں ہے۔اخاہ اخاہ کے الفاظ اور لاحول ولاقوۃ...... کے ٹکڑے کو بڑی چابکدستی اور فن کاری کے ساتھ پرویا گیا ہے۔اس رباعی کے آئینہ میں ہر وہ شخص جو منافقانہ کردار کا مالک ہے اپنی عریاں تصویر دیکھ سکتا ہے۔

جناب برق نے اپنی ایک رباعی میں بڑے پتے کی بات کہی ہے۔وہ یہ کہ قتل وزنا گرچہ دونوں گناہ کبائر سے ہیں لیکن دونوں میں ایک بنیادی فرق ہے وہ یہ کہ قتل کی سزا قتل ہے مگر مقتول کے وارث اگر خوں بہا لینے پر راضی ہوجائیں تو شریعت میں اس کی اجازت ہے لیکن زنا کاری ایسا سنگین جرم ہے جس کی سزا ہر حال میں سنگ ساری ہے جس کے ساتھ یہ فعل شنیع ہوا اس کے یا اس کے وارثین کے معاف کردینے سے بھی یہ گناہ معاف نہیں ہوگا۔اس کے باوجود ہمارے خدا ناترس معاشرہ میں زنا کاری کا ارتکاب عام ہے اور بعض حلقوں میں تو اس کو داخل فیشن سمجھ لیا گیا ہے یعنی اس کی قباحت وشناعت کا احساس بھی جاتا رہا ہے۔معاذ اللہ......اعتقاداً نہ سہی عملاً تو یہی ہورہا ہے ؎

کیا سوچ کے محلوں کی بنا کرتا ہے   یہ وقت تو ہرشے کو فنا کرتا ہے
ہے قتل کی حد میں خوں بہا کی رخصت   گردن زدنی ہے جو زنا کرتا ہے

فعلِ زنا کی طرح تصویر کشی بھی ہمارے معاشرے میں عام ہے۔خاص طور پر شادی کی تقریبات اور ادبی نشستوں اور جلسوں کے مواقع پر تو اس کو لازمی سمجھ لیا گیا ہے اور نئی نسلوں میں تو اس کی وبا اور بھی عام ہے۔برقؔ صاحب نے اس کی حرمت کی طرف ہماری توجہ مبذول کراکے اپنی دینی اور اخلاقی ذمے داری یوں پوری کی ہے ؎

رحمت کے فرشتے نہیں آتے ہیں وہاں   تصویر ہو جاندار کی یا کتا جہاں
حرص و طمع سگ کی جو خود ہو تصویر   اب آپ ہی بتلایئے وہ جائے کہاں

تہذیب جدید نے ٹی وی کو تو ہر گھر کے لیے ضروری قرار دے دیا ہے۔بظاہر تفریح کا یہ

بہت آسان وسیلہ ہے لیکن اس کے مضر اثرات کتنے قیامت خیز ہیں اس پر بھی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔پورا معاشرہ عریانی وفحاشی کی لپیٹ میں ہے۔نئی نسل بالکل برباد ہورہی ہے۔ایک حساس اور دردمند شاعر کا یہ اضطراب ملاحظہ ہو ؎

یہ رقص و سرور یہ منظر بوس و کنار   ناگفتنی نا دیدنی کا یوں اظہار
احساسِ حیا شرم سے مرنے کے قریب   ٹی وی ہے خدا کی لعنت اللہ کی مار

ڈاکٹر برق کے احساسات نے چوتھے مصرع میں جو شدت اختیار کرلی ہے وہ عین تقاضائے فطرت ہے کسی بھی رباعی کا چوتھا مصرع اس کی روح اور جان ہوتا ہے اسی لیے موصوف نے اسے زوردار بنا کر پیش کیا ہے کہ شاید ہماری بے حسی کی برف پگھلے۔

اسی طرح آج بچوں کی تعلیم کے نام پر جو سوداگری ہورہی ہے۔انگریزی ذریعہ تعلیم کے اسکول حشرات الارض کی طرح پھیل گئے ہیں جہاں مسلمان بچوں کا دینی استحصال ہورہا ہے اس پر بھی آپ کی نگاہ ہے۔اپنے محسوسات چند انگریزی الفاظ کی مدد سے انھوں نے بڑے خوبصورت اور دل کش پیرائے میں پیش کیا ہے۔ملاحظہ ہو ؎

صد حیف کہ اسلاف کی خوبو نہ رہی   عاصی کے لیے صدائے ''توبوا'' نہ رہی
سسٹر نے رٹایا بھی تو ٹیونکل ٹیونکل   الحمد پڑھا دیتی وہ بوبو نہ رہی

اس رباعی میں قوافی کا انتخاب بھی خوب ہے اور ان کی فنکارانہ پیش کش خوب تر ہے۔اسے بار بار پڑھیے تو اک نیا لطف آئے گا۔

ہمارے معاشرہ کی ایک بڑی لعنت تلک اور جہیز کی فرمائش ہے جس نے تقریباً تمام گھر اور گھرانوں کو جہنم زار بنا دیا ہے۔ناکتخدا لڑکیاں خودکشی کرنے پر خود کو مجبور پارہی ہیں لیکن ہمارے نوجوانوں کو اپنی سماجی ذمے داری اور آخرت کی جواب دہی کی کوئی فکر نہیں۔ڈاکٹر برقؔ نے اس صورتِ حال کے تناظر میں ان کے فکر وعمل کے تضادات کو یوں آشکار کیا ہے ؎

چیتک، ٹی وی، فرج، وی سی آر   سونے کی چین نقد پنجاہ ہزار
ہے شرط یہ نوشاہ کی اور مہرعروس   کہتے ہیں فقط یازدہ صد ، وہ بھی ادھار

کیا چاہتا ہے زیست کی ماری مرجائے   گھٹ کر یونہی بے نالہ و زاری مرجائے
دونمبری پیسوں کے یہ سامانِ جہیز   تو شادی میں لے بہن کنواری مرجائے

قرآن پاک کا ارشاد ہے ''تم دوسروں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود کو بھول جاتے ہو''

پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ کی قابلِ احترام شخصیت کی عظمت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایک مضبوط خانقاہی نظام سے وابستہ ہونے کے باوجود وہ موجودہ خانقاہوں کی کوتاہیوں پر نظر رکھتے ہیں اور ان پر برقِ غضب گرانے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں ؎

پیغام عمل کو کررہا تھا ارسال   دیکھا نہیں کیا اس نے مرا حال اور قال
افسوس کبھی اس پہ توجہ ہی نہ کی   کیوں روٹھ گیا خانقاہوں سے اقبال

اسی طرح اہلِ خانقاہ کی خلوت وجلوت کی زندگی کے تضادات پر وہ یوں اظہارِ تاسف کرتے ہیں ؎

رشوت کی رقم لے کے پئے نذر حلال   عرفان کا دعوا ہے ارے واہ ! کمال
سونے میں گئی فجر مریدوں میں عشاء   محفل میں ذرا دیکھیے وہ حال و قال

جب اہلِ مدرسہ وخانقاہ کے یہاں اس قدر منکرات ومنہیات کا دور دورہ ہے تو اہلِ سیاست جن کی ضمیر فروشی ، دینی بیزاری اور مادّیت پرستی مسلمات سے ہیں جو کر گزریں کم ہے۔
آج بات بات پر غیر مسلم سیاسی رہنماؤں کو مسیحا کا لقب دینے کی روایت چل پڑی ہے جو حد درجہ حقیقت سے پرے اور شرمناک ہے۔ڈاکٹر برقؔ نے اپنی ایک رباعی میں سماج کی اس کورانہ ذہنیت پر خوب کاری ضرب لگائی ہے اور بڑے موثر پیرایے میں اپنی بات کہی ہے ملاحظہ ہو ؎

کب،کون،کہاں،کس کے لیے،کیا کہہ دے   ظالم کو غریبوں کا مسیحا کہہ دے
نگری ہے سیاست کی یہ اے اہلِ نظر   شاباش! اندھیرے کو اجالا کہہ دے

ڈاکٹر برق کی خوبی یہ ہے کہ وہ اصلاحِ معاشرہ کرتے وقت شدتِ جذبات سے مغلوب ہوکر کبھی کف دردہن نہیں ہوتے۔بڑے لطیف پیرائے میں اپنی بات کہہ جاتے ہیں۔اس طرح طنز کی زہرناکی اپنا کام بھی کرجاتی ہے اور وہ عریاں و بے لباس بھی نہیں ہوتی۔مصرع

اول میں آسان ترین لفظوں کا انتخاب اوران کی حسنِ ترتیب قابلِ داد ہے۔

اب آخر میں زندگی کی حقیقت و ماہیت سے متعلق ان کا فلسفیانہ اندازِ نظر دیکھیے ۔

یہاں فلسفہ نے کس طرح شعریت کا روپ دھارا ہے اور پتھر پانی بن گیا ہے۔ملاحظہ ہو۔

اشکوں کی روانی ہے کہ دریا دریا | آہوں کے بگولے ہیں کہ صحرا صحرا
ہے اپنی نگاہوں میں مآلِ ہستی | اک بلبلہ پانی کا ہے سہما سہما

رشتہ سامری روح و بدن کا ٹوٹا | یا سلسلہ سورج سے کرن کا ٹوٹا
اک حرفِ نفی اور مسیحا کی زباں | شیشہ دل بیمار کا چنکا ٹوٹا

اس دوسری رباعی میں خاص طور پر شاعر کا تخلیقی شعور تموج پر ہے فکروفن آپس میں ایک دوسرے سے گلے مل رہے ہیں۔ بلکہ ''من تو شدم تو من شدی'' کا نظارہ پیش کررہے ہیں۔آخری مصرعہ تو اور بھی غضب کا ہے۔شعری لطافت کی ایسی اچھوتی اور دل چھوتی مثالیں مشکل سے دوسروں کے یہاں مل پائیں گی۔ بلاشبہ ڈاکٹر برق رباعی کے ایک بے مثل فن کار ہیں۔ان کے کارناموں کی بدولت صنفِ رباعی کے وزن ووقار میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔

اردو رباعی نگاروں کی تاریخ میں ان کا مقام امتیاز ہمیشہ باقی رہے گا۔ بہار کی اردو شاعری اپنے اس جوہر قابل پر جتنا فخر کرے کم ہے۔

○○○

سید طلحہ رضوی برقؔ کی رباعیات

علیم صبا نویدی

پروفیسر سید طلحہ رضوی برقؔ کا شمار دانشوروں میں ہوتا ہے۔آپ نہ صرف شاعر ہیں بلکہ پایہ کے نقاد اور مبصر بھی ہیں۔آپ کی سرپرستی میں طلبا تحقیق میں ہمیشہ منہمک رہتے ہیں ۔آپ خانقاہیت اور روحانیت میں بھی اپنے آپ کو ہمیشہ مست اور مگن رکھتے ہیں۔اس حیثیت سے آپ کی شخصیت گوناگوں ہے۔

پروفیسر سید طلحہ رضوی برقؔ نے شاعری کی تقریباً تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے مگر آپ نے صنفِ رباعی کو بالخصوص بڑے پیمانے پر برتا ہے۔رباعی کی صنف پر آپ کی نظر بڑی گہری ہے اور اس فن کو آپ نے بعینہ نبھایا ہے۔آپ کی رباعیات میں جو شاعری ہوئی ہے وہ یقیناً مقصدی ہے۔آپ نے انسانی مسائل کے ساتھ ساتھ معاشرہ میں سرایت کردہ بداعمالیوں کو اجاگر کر کے ان کی اصلاح کی طرف دھیان دیا ہے۔آپ کی رباعیوں میں تقریباً تمام موضوعات ملتے ہیں۔جیسے حمد،نعت،منقبت،مذہبی اخلاقیات،صوفیانہ خیالات اور اخلاقی تعلیمات وغیرہ۔

اردو کی رباعی گو یوں میں یقیناً برق صاحب کا نام گرامی برتریت کے ساتھ لیا جانا چاہیے آپ کی رباعیاں نصابی درس میں شامل کی جائیں تو یقیناً طلبا کی اخلاقی تعلیم بہتر طور پر ہوسکتی ہے۔اس مجموعے میں خواص کے لیے بھی دعوتِ فکر ہے اور عوام کے لیے بھی۔جگہ جگہ پر اسلامی تعلیمات کی چاشنی ملتی ہے۔حمدیہ،نعتیہ اور مذہبی خیالات والی رباعیات وغیرہ میں برق صاحب نے رباعی کے فارم کو اور مزاج کو ٹھیس نہیں پہنچایا۔آپ کی یہ رباعیات یقیناً دل اور وجدان پر اثر

انگیز ہوتی ہیں۔

سجدے میں ہے کائنات مسجود اللہ — شاہد ہے ، شہود بھی ہے ، مشہود اللہ
اس ربط بہر حال کی بھی لاج رہے — میں عبد ہوں اور تو ہے معبود اللہ

گاؤں گا انھیںؐ کا رکھے جب تک اللہ — اللہ ہے اللہ ہے بے شک اللہ
اللہ ری وہ ذات کہ خود جس کے لیے — فرمائے رفعنا لک ذکرک اللہ

نعتیہ رباعیات میں آپ نے اپنے عشق ومحبت محمدی کا والہانہ اظہار کیا ہے۔ یہ رباعیاں حقائق کی روشنی میں ہی ہوئی ہیں۔ ان میں جذبات کی بے جا آمیزش نہیں ہے۔ چند رباعیاں ملاحظہ فرمائیے۔

پتھر کو زباں، شجر کو رفتار دیا — اے صاحبِ مزمّل ، طٰہٰ ، یٰسین
ڈوبے ہوئے سورج کو نکالا تونے — آدمؑ تھے جن بین الماء والطین

عربی کلمات کو رباعیات میں نگینوں کی طرح جڑ دینا برق صاحب ہی کا حصہ ہے۔ خالص نعت پر مبنی یہ رباعیاں یقیناً آپ کے منہ سے ''واہ واہ'' کے تحسینی کلمات نکال کر رہیں گی۔

اللہ کے محبوب کی تعریف کرو — ایک ایک ادا کی جی سے توصیف کرو
دشمن پہ نبی کے رب نے لعنت بھیجی — اس پر بھی کبھی عمل کی تکلیف کرو

ہم ہیں عملاً دین سے اس طرح جدا — اللہ کی رحمت نے بھی منہ موڑلیا
ہیں غرق گنہ، آپ کی امت تو ہیں — اے خاصۂ خاصان رسل کیجیے دعا

منقبتی رباعیات بھی پورے احترام واکرام کی شان کی حامل ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

میں عشق میں پھرتا رہا ہر چار طرف — لمحات بھی آتے رہے سب تیغ بکف
جب بھی کسی مشکل میں پھنسا دل میرا — فریاد بر آورد کہ یا شاہِ نجف

طوفان بلا ہے اور کشتی خواجہ — یا خواجۂ خواجگان چشتی خواجہ
ہیں نازِ جہاں قطب فریدؒ اور نظامؒ — بس ان کا وسیلہ ہے بہشتی خواجہ

''حسینیت'' کے موضوع کی رباعیات بڑی مؤثر رباعیاں ہیں۔ ان کے چند ایک نمونے ملاحظہ فرمائیے۔

کم ہنسنے بہت رونے کی جب بات ہوئی — ہاں خون کی نینوا میں برسات ہوئی
قربانی حسینؓ کی ہے وہ ذبحِ عظیم — ہر سال کی اس غم سے شروعات ہوئی

حق کہنے پہ یہ ظلم ستم یہ بیداد — کثرت کا غرور فکرِ باطل کا فساد
مظلوم حسینؓ آج بھی ہیں ان میں گھرے — ہے شمرِ لعین اِدھر ، اُدھر ابن زیاد

شبیر ہمیں درسِ وفا دے کے گئے — دعوے کی دلیل برملا دے کے گئے
کہتے رہے حق بلا سے سر کٹ جائے — واللہ یہی حکمِ خدا دے کے گئے

اخلاقیات اور دیگر موضوعات والی چند ایک رباعیاں ملاحظہ فرمائیے۔

آپس کا نفاق ہے کلیجے کا گھاؤ — خطراتِ زمانہ سے تحفظ نہ بچاؤ
اے حکم ولاتفرقوا سے غافل — ہے وقت تم اب بھی متحد ہوجاؤ

نادان مری بات کو کیوں کر بوجھے — ساون کا ہو اندھا تو ہری ہی سوجھے
دنیا پہ جھپٹ رہے ہیں اس طرح سے لوگ — مردار پہ جیسے چیل کوّا لوجھے

مسنون تجارت دے تو شرماتا ہے — نکلی نہ اگر لاٹری غم کھاتا ہے
محنت سے کما رزقِ حلال و طیب — کیوں مفت کے لالچ میں مرا جاتا ہے

غیبت میں ہے غیبت کہ بس اللہ کی پناہ　　اور ملیے تو پھر سامنے اہّاہ! اہّاہ!
کہتے ہیں منافقت اسی کو اے برق　　لا حول ولا قوۃ الا باللہ

غرض برق صاحب نے رباعی کو مقصدی شاعری کے لیے جس طرح برتا ہے وہ یقیناً قابلِ داد ہے۔یقیناً 'شہاب الدین' برق صاحب کی رباعیات شہاب سخن ہی ہیں۔

(جہان اردو رباعی ص۱۸۵)

○○○

ڈاکٹر طلحہ رضوی برق کی رباعی:
ایک انتخاب

ڈاکٹر سلمہ کبریٰ

پروفیسر طلحہ رضوی برق کا شمار عظیم اور بہترین دانشوروں میں ہوتا ہے۔ادب اور تصوف سے ان کا رشتہ بڑا گہرا ہے۔انھوں نے شاعری کی تقریباً تمام اصناف پر طبع آزمائی کی ہے لیکن رباعی کی جانب خصوصی طور پر توجہ دی ہے۔ان کے کلام میں جاذبیت و دل کشی کے علاوہ حیات و ماحول کو نئے نئے زاویے سے دیکھنے کا رجحان بھی ملتا ہے۔ان کی شاعری میں تہذیب اور اخلاق کی جڑیں کافی دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔تصوف و رجائیت کے عناصر بھی پھلتے پھولتے ہیں۔افکار، جذبات و احساسات کو جمالیاتی انداز میں پیش کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔

''شہابِ سخن'' ان کی رباعیوں کا مجموعہ ہے۔اس مجموعے میں ان کی ۱۹۲؍ رباعیاں شامل ہیں۔انھوں نے حمد، نعت، منقبت، اخلاق اور تصوف وغیرہ عنوانات کے تحت رباعیاں کہی ہیں۔یہ رباعیاں دعوتِ فکر دیتی ہیں۔عام ہو یا خاص، ان کی رباعیوں کو پڑھنے کے بعد غور و فکر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ان کی رباعیاں دل اور وجدان پر اثر انداز ہوتی ہیں۔فکر و خیال اور زبان و بیان کی رعنائیاں عروج پر ہیں۔حقائقِ ہستی اور حقائقِ حیات کی روشنی بھی ان کی رباعیوں کی اضافی خصوصیات ہیں۔

انتخابِ رباعیات

مضمون دمِ فکر ادق آتا ہے
تخئیل کے ماتھے پہ عرق آتا ہے
خونِ جگر و دل سے مرے شعر میں برقؔ
نورِ سحر و رنگِ شفق آتا ہے

اے مست مئے ساغر بلورِ حیات
ہے قلقل غم کے ساتھ کافورِ حیات
ہم خواب میں جینے کا الزام لیے
کیا دیدۂ کابوس میں ہو نورِ حیات

بے تاب ہے دل جھول رہا ہو جیسے
عنوان کوئی بھول رہا ہو جیسے
کس یاد کی ہے ذہن میں خوشبو پھیلی
شاخوں میں کسم پھول رہا ہو جیسے

راس اپنے اگر دل کی لگن آجائے
آغوش میں خود روحِ چمن آجائے
منزل گہہِ مقصد جو ہو تدبیر نما
تقدیر کے ماتھے پہ شکن آجائے

سجدے میں ہے کائنات مسجود اللہ
شاہد ہے ، مشہود ہے، مشہود اللہ
اس ربط بہرحال کی بھی لاج رہے
میں عبد ہوں اور تو ہے معبود اللہ

اشکوں کی روانی ہے کہ دریا دریا
آہوں کے بگولے ہیں کہ صحرا صحرا
ہے اپنی نگاہوں میں مآلِ ہستی
ایک بلبلہ پانی کا ہے سہا سہا

رشتۂ سامری روح و بدن کا ٹوٹا
یا سلسلہ سورج سے کرن کا ٹوٹا
اک حرفِ نفی اور مسیحا کی زبان
شیشۂ دل بیمار کا چٹکا ٹوٹا

فکر اپنی جو انداز بدل جاتی ہے
الفاظ کے پیمانے میں ڈھل جاتی ہے
دیکھو تو ذرا گرمئ احساسِ وفا
لو دیتی ہوئی شمع پگھل جاتی ہے

خورشید نظر آئے گا پو پھٹ تو لے
کہرا ہے قیامت کا ذرا چھٹ تو لے
وقت آ کے دبے پاؤں نکل جائے نہ برقؔ
آواز پہ دے کان کچھ آہٹ تو لے

اللہ کے محبوب کی تعریف کرو
ایک ایک ادا کی جی سے توصیف کرو
دشمن پہ نبی کے رب نے لعنت بھیجی
اس پر بھی کبھی عمل کی تکلیف کرو

○○○

طلحہ رضوی برقؔ اور ان کی تاریخ گوئی

ناوکؔ حمزہ پوری

الحمدللہ وحدہ رب العلمین والصلوۃ والسلام علی نبی الرحمۃ للعالیمن والہ وصحبہ اجمعین.

پیشِ نگاہ ہے برادرِ گرامی گوہر پروفیسر ڈاکٹر سید شاہ طلحہ رضوی برقؔ، سجادہ نشیں آستانہ عالیہ چشتیہ نظامیہ داناپور (پٹنہ) کی تصنیفِ لطیف ''چہل قطعۂ تاریخ'' کا مسودہ۔ ترتیب کا فریضہ انجام دیا ہے نورِ نظر ڈاکٹر سلمان رضوی صاحب سلمہ نے۔ ابھی پچھلے دنوں عزیز موصوف کی گراں بہا تصنیف ''فارسی غزل اور حافظؔ'' نظر نواز ہوئی تھی۔ آنکھیں روشن اور دل شاد ہوا تھا۔ دل کی گہرائیوں سے دعائیں دی تھیں۔ خوشی اس زاویے سے بھی زیادہ ہوئی تھی کہ آج جب اردو ہی پر براوقت آن پڑا ہے فارسی شعر و ادب پر قابلِ رشک نظر رکھنے والے نوجوان ماشاء اللہ خلاء کو پر کرنے کو کمر بستہ ہیں۔ میراثِ پدر کی حفاظت اور امانت داری کے لیے ''بازوے پدر'' ناگزیر ہے اور عزیزم سلمان سلمہ کو مولا تعالیٰ نے اس دولت بے بہا سے نوازا ہے۔ لیکن جی چاہا تھا کہ زمامِ توجہ بہارؔ کی طرف موڑ دینے کو کہوں کہ بے شمار حافظؔ و سعدیؔ منتظر توجہ ہیں اور پھر عزیز موصوف کو تو زیادہ دوڑ دھوپ کی ضرورت بھی نہیں۔ گھر ہی میں جدامجد حضرت علامہ سید شاہ محمد قایم رضوی چشتی نظامی قتیلؔ داناپوری علیہ الرحمہ اور پدر بزرگوار پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ کی نگارشات صدر شک حافظؔ و جامیؔ کا بڑا ذخیرہ ہے۔ ان پر کام کی ضرورت ہے۔ ''از دل خیزد بر دل ریزد'' مثل مشہور ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ کسی نے میرے دل کی یہ بات عزیز موصوف تک پہنچادی۔ چنانچہ آں عزیز کا

مرتّبہ یہ مسودہ دیکھ کر مجھے بے انتہا مسرت ہوئی ہے۔ میں ان کے حق میں ''اللھم زد فزد'' کی دعا کرتا ہوں۔

عام طور پر ہوتا یہ آیا ہے کہ بیشتر لوگ اپنے اسلاف، اپنے خاندان کے لوگوں پر، ان کے کارناموں پر فخر کرتے ہیں۔ کم تر ایسا ہوتا ہے کسی شخص پر، ان کی گارگزاریوں پر، اس کے علم و فضل پر خود اس کا خاندان ہی نہیں، اس کا معاشرہ، اس کا ملک فخر کرنے لگے۔ فی زماننابرادر محترم حضرت طلحہ رضوی برقؔ کی شخصیت ایسی ہی جامع کمالات ہے جس پر نہ صرف یہ کہ ان کے اہلِ خاندان بلکہ پوری علمی وادبی دنیا بجاطور پر فخر کرتی ہے۔

طلحہ بھائی بلحاظ سنہ وسال اس خاکسار سے پانچ چھے سال چھوٹے ہیں لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے نا کہ ''بزرگی بہ علم ست نہ بہ سال''۔ صورتِ حال ایسی ہی ہے علم و فضل کے لحاظ سے یہ خاکسار بزرگوں کی طرح ان کا احترام کرتا ہے۔

ہمارے مابین برادرانہ ومشفقانہ روابط کی عمر اب کوئی چالیس برس سے زیادہ ہونے کو آئی۔ اس مدت میں خواہ معاملہ دینی ہو خواہ علمی وادبی ہو میری نگاہ میں ان سی معتبر اور قابلِ اعتماد کوئی دوسری شخصیت نہیں ٹھہری۔ چنانچہ شاذ و نادر جب کبھی کوئی معاملہ الجھن پیدا کرتا ہے تو یہ خاکسار راست انھیں سے مشورہ کر کے مطمئن ہو لیتا ہے۔

حضرت طلحہ کی ذات کئی جہتوں سے فضل وکمال اور علوم و عرفان کا سرچشمہ ہونے کی وجہ سے لایق ستایش ہے۔ آپ نے قریباً بیالیس برسوں تک کالج اور یونیورسٹی کے طلبا کے اذہان کو علم وادب کے نور سے ایک فرض شناس استاد کی حیثیت سے منور کیا ہے۔

اپنے والد ماجد حضرت علامہ قتیلؔ داناپوری علیہ الرحمہ کے بعد ۱۹۸۵ء سے بحیثیت سجادہ نشیں آستانہ چشتیہ نظامیہ داناپور، رشد وہدایتِ خلق خدا کے فرایض کمالِ بے لوثی سے انجام دے رہے ہیں۔

فنِ شعر وادب کے نامور استاد کی حیثیت سے نہ صرف اپنے شاگردوں بلکہ میرے جیسے بے شمار تشنگان علم وفن کو سیراب فرما رہے ہیں۔

تخلیقی سطح پر نثر و نظم کے ہر دو شعبوں میں آپ کو کمال حاصل ہے۔ باوقار اور بڑا پیارا نثری انداز آپ کا مجھے بطورِ خاص پسند ہے۔ تحقیقی و تنقیدی مضامین آپ کے بڑے قابلِ اعتماد، عادلانہ، معتدل اور بے لاگ ہوتے ہیں۔ مشرقی علوم سے بدرجہ اتم بہرہ ور ہونے کی وجہ سے دوسرے ناقدین کی طرح مغرب کی کاسہ لیسی سے آپ نے ہمیشہ دامن بچایا ہے۔ اردو کی نعتیہ شاعری پر اسی عنوان سے ۱۹۷۴ء میں آپ کی شائع شدہ کتاب ''اردو کی نعتیہ شاعری'' اس موضوع پر اردو میں اوّلین کتاب قرار دی گئی ہے اور بے شمار حضرات نے اس سے کسبِ فیض کیا ہے۔

آپ کے تنقیدی مضامین کے مجموعے غور و فکر، نقد بخشش اور ارزشِ ادب بیاباں کی شب تاریک میں قندیلِ رہبانی کا درجہ رکھتی ہے۔

''شایگاں'' آپ کی منظومات و غزلیات اور ''شہابِ سخن'' آپ کی رباعیات کے قابلِ قدر خزانے ہیں جنھیں قبولِ عام کا اعزاز حاصل ہے۔

میں نے پہلے بھی اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ شاعری جس کی ماں موزونی طبع ہے ایک خدا داد نعمت ہے۔ لہٰذا کسی کو یہ نعمت نہ تو صرف اپنی کد و کاوش سے حاصل ہو سکتی ہے نہ کوئی دوسرا خواہ خود استادِ باکمال بھی ہو کسی کو شاعر بنا سکتا ہے۔ استاد کی حیثیت چراغِ محض کی ہے یہ ہر فرد کی اپنی ذاتی استعداد پر منحصر ہے کہ اس چراغ کی روشنی میں کتنا فاصلہ طے کر سکتا ہے۔ حضرت برقؔ اس جہت سے بھی بڑے خوش بخت ثابت ہوئے کہ ان کے گھر میں یہ چراغ ہی نہیں بلکہ آفتاب علوم و فنون حضرت قتیلؔ داناپوری علیہ الرحمہ کا سایۂ عاطفت آپ کو میسر آیا۔

دین و دنیا کی سعادتیں بٹورنے سے لے کر شعر و ادب کے رموز و نکات کے حصول میں حضرت برقؔ نے اپنے والد گرامی کی ذات والا صفات سے بھرپور استفادہ کیا اور کمال سعادت مندی سے فنِ تاریخ گوئی کے باب میں بھی ''کہ برمن ہم رسیدہ است ایں توریت شعری'' کہہ کے اس امر کا اعتراف کیا ہے۔ کہنا نہ ہوگا کہ حضرت قتیلؔ داناپوری رحمۃ اللہ علیہ فن تاریخ گوئی میں بھی یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔

تاریخ کی حفاظت کے لیے ازمنۂ قدیم سے انسان نے جو طریقے اختیار کیے

ہیں انھیں میں سے تاریخ گوئی کا فن بھی علم بدیع کی ایک بے مثال صنعت ہے۔ یہ وہ فن لطیف ہے جس میں متکلم کسی فقرے، جملے، مصرعے یا شعر میں مستعمل حروف کے مقررہ اعداد سے بحساب جمل سال ہجری یا عیسوی برآمد کرتا ہے۔ دیگر بیشتر اصناف نظم و نثر کی طرح صنعت تاریخ گوئی بھی عربی سے فارسی اور فارسی سے اردو میں منتقل ہوئی۔ یہ ایک دلچسپ داستان تو ہے لیکن اتنی طویل ہے جس کا متحمل کسی کتابچے کا مقدمہ نہیں ہو سکتا۔

ابتداءً بیشتر مشاہیر خصوصاً معتبر استاد شعرا تاریخ گوئی سے بھی شغف رکھتے تھے لیکن اس فن میں کمال بہت کم حضرات نے حاصل کیا۔ کہنے کو تو حضرت غالبؔ کے سے نامور نے بھی چند تاریخیں کہیں لیکن برملا اس فن میں اپنے عجز کا بھی اقرار کیا ہے۔

پھر جیسے جیسے سہل پسندی فروغ پاتی گئی، کلاسیکی ادب سے ناواقفیت بڑھتی گئی۔ مشقت طلب علوم و فنون کی طرح کم علمی بلکہ بے علمی کے اس زمانے میں تاریخ گوئی کا فن بھی زوال آمادہ ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہمارے کم علم اور کوتاہ نظر ناقدین اس کی افادیت پر بھی شبہ کا اظہار کرنے لگے ہیں۔ حالانکہ یہی وہ فن لطیف و شریف ہے جس نے محققین و ناقدین کی بعض تاریخوں کے تعین میں بڑی مدد کی ہے۔ نہ صرف یہ کہ سنہ و سال کے تعین میں بلکہ متعلقہ حضرات کی سیرت نگاری میں بھی تاریخ سے بڑی مدد ملتی رہی ہے۔ تاریخ نگار مادۂ تاریخیہ سے نہ صرف یہ کہ واقعات کا سال برآمد کرتے ہیں بلکہ خوشی کے موقعوں پر اظہار مسرت بھی کرتے ہیں اور غمی کے موقعوں پر اپنے دلی جذبات و احساسات کی ترجمانی بھی کرتے ہیں جن سے متعلقہ حضرات کے علمی و عملی رتبے کا اندازہ ہو جاتا ہے اور یہ کم بڑی بات نہیں۔

جائے شکر و سپاس ہے کہ علم و ادب، زبان و بیان کے اس دور انحطاط پذیر میں بھی ہمارے درمیان جلیل القدر علمی و ادبی خانوادے کے سلسلۃ الذہب کی درخشاں کڑی پروفیسر ڈاکٹر سید شاہ طلحہ رضوی برقؔ موجود ہیں جو اس فن لطیف کو بھی سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ آپ نے کیا اردو اور کیا فارسی ہر دو زبان میں بے شمار تاریخیں رقم کی ہیں اور مجھے کہنے دیجیے کہ فی البدیہہ، برجستہ اور حسبِ حال تاریخ گوئی میں میری نظر میں موصوف کا ہمسر کوئی دوسرا نہیں۔

سرِ دست میرے سامنے حضرت برقؔ کا تصنیف کردہ ''چہل قطعۂ تاریخ'' کا مسودہ ہے۔اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی تو یہ ہے کہ یہ فارسی زبان میں ہے اور حضرت حالیؔ کے اس قول کو جھٹلاتی ہے کہ فارسی گوئی ہندستان میں خسروؔ سے شروع ہوئی اور غالبؔ پر ختم ہوگئی۔خدا کا شکر ہے آج بھی ہمارے درمیان حضرت برقؔ سا فاضلِ اجل اور عالمِ بے بدل سخنور موجود ہے جو صرف سبک ہندی میں نہیں بلکہ جدید لب ولہجہ میں شستہ وشائستہ زبان میں اس طرح شعر گوئی پر قادر ہے جو اہلِ زبان کو بھی شرما دے۔

نام اکثر تعارفِ محض کے لیے ہوتے ہیں لیکن بعض ناموں کی پہلو دار معنویت بھی دامن کش دل ہوتی ہے۔چنانچہ ''چہل قطۂ تاریخ'' میں ''چہل'' پر میری نظر ٹکی۔طلحہ بھائی نے تو بے شمار قطعات تاریخ کہے ہیں پھر یہ ''چہل'' ہی کیوں۔دل نے جواب دیا ''چہل'' کئی جہت سے بڑا مبارک ومسعود اور تاریخی عدد ہے۔خصوصاً تزکیہ نفس کے لیے درود ووظائف نیز مجاہدۂ و ریاضت کے سلسلے میں یہ عدد بڑا اہم تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔اس عدد کی سعادت کا یہ حال ہے کہ عام الفیل کے چالیسویں دن حضور پرنورؐ کی ولادت ہوئی اور پھر چالیس برس کی عمر میں آپؐ نبوت سے سرفراز ہوئے۔حضرت موسیٰؑ ہوں یا حضرت عیسیٰؑ ان کی شریعتوں میں بھی یہ عدد بڑا اہم مقام رکھتا ہے۔پھر یہ چہل ابدال کی اصطلاح بھی معروف ہے۔یہ وہ نفوس زکیہ ہیں جنھیں اللہ تعالی نے انتظام عالم کی دیکھ بھال پر معمور کیا ہوا ہے۔پھر یہ کہ چہل کاف کے نام سے صوفیا کے حلقے میں ایک مشہور دعا بھی ہے جس میں چالیس کاف آئے ہیں۔پھر ذکر خواہ چہ چراغ کا ہو یا چہل ستون کا یا پھر چہلم کا سب اپنی اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں۔اور ان تمام حقائق کی روشنی میں ''چہل قطعۂ تاریخ'' کی معنویت خود بخود ظاہر ہوجاتی ہے اور صاحبِ کتاب کی ذہانت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

یہ کتاب چالیس سجادہ نشینوں اور مشائخ کی تاریخِ ارتحال پر مشتمل ہے۔ظاہر ہے کہ یہ انتخاب ایک بار پھر یہ ظاہر کرتا ہے کہ مرتب کی نگاہ میں یہ مشائخ اپنے زہد واتقا، علم وعمل اور فیوض وبرکات کی وجہ سے مرجح ٹھہرے ہوں گے۔یہ کتاب اس لحاظ سے قابلِ قدر ہے کہ متعلقہ حضرات کی نہ صرف یہ کہ تاریخ ارتحال محفوظ ہوگئی بلکہ ان کی سیرت پر بھی بڑی حد تک مواد محققین

کو فراہم ہوجائیں گے۔

حضرت برقؔ کی تاریخ گوئی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی برجستگی میں بے مثال ہوتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حسبِ حال ہوتی ہے۔بعض حضرات ایسے عمومی فقرے، جملے یا مصرعے سے تاریخ برآمد کر کے خوش ہولیتے ہیں جو اس سنہ وسال میں ہر وفات پانے والے پر منطبق کیے جاسکتے ہیں۔برقؔ صاحب اس عمومیت سے دامن کش رہے ہیں اور آپ نے تاریخ ایسے الفاظ، فقرے یا مصرعے سے برآمد کی ہے جو صرف اسی شخص کے لیے مخصوص ہوتی ہے جس کے لیے وہ کہی گئی ہے۔مثلاً حضرت شاہ امام الدین اشرفی کی تاریخ ارتحال:

''بخت زیب شدالحاج سید شاہ امام الدین'' (۱۳۷۸ھ)

یا پھر ''بلبل خلدِ بریں شاہ محمد ایوب'' (۱۳۸۷ھ) سے حضرت سید شاہ محمد ایوب ابدالی کی تاریخ کہی۔

یا پھر ''شاہ والا شان قطب الدین احمد جنتی'' (۱۴۱۷ھ) سے سید شاہ قطب الدین احمد چشتی کی تاریخ رحلت برآمد کی۔

بعض تاریخوں میں شعر کے دونوں مصرعوں سے الگ الگ ہجری وعیسوی دونوں سال برآمد کیے ہیں۔مثلاً حضرت سید شاہ مختار اشرف کچھوچھوی کا سال ارتحال ہے ؎

آہ سرکار کلاں ممدوح خلق (۱۴۱۷ھ)
سیدی مختار اشرف نیک باز (۱۹۹۶)

برقؔ صاحب نے بعض تاریخوں میں فن تاریخ گوئی میں مروجہ تعمیہ وتخرجہ کی سہولت سے بھی کام لیا ہے۔تعمیہ یہ ہے کہ مادّۂ تاریخیہ میں کچھ عدد کم رہ گئے ہوں تو اتنے عدد کا کوئی لفظ دوسرے مصرعے میں اس طرح لاکر سال مطلوبہ برآمد کرلیں لیکن اس خوبی کے ساتھ کہ پیوند کاری نہ معلوم ہو اور تخرجہ یہ ہے کہ مادّۂ تاریخ میں کچھ عدد بڑھ جائیں تو دوسرے مصرعے میں مطلوبہ عدد کا لفظ لاکر اس کے اخراج سے سال مطلوبہ برآمد کرلیں۔ایک مثال صنعت تعمیہ کی دیکھیے۔مولانا سید شاہ رضوان اللہ قادری مجیبی پھلواری کا سال ارتحال یوں برآمد کیا ہے

گفت فوراً ہاتف غیبی بہ تاکید ''صحیح'' ۱۱۶

شد بجنت آں گل زیبائے گلزار مجیب (۱۳۰۸+۱۱۶=۱۴۲۴ھ)

حضرت سید شاہ محمد قایم اصفوی قتیلؔ دانا پوری علیہ الرحمہ کی تاریخ ارتحال بہ صنعتِ صوری اس طرح کہی کہ دن، تاریخ، مہینہ اور سال سب بیان کردیا

شنبہَ روزِ ہشتمِ ذیقعدہ
چار صد برہزار و پنج ببیں
داشت قایم بہ دل چو حبِ رسولؐ
''صاحب ایمان شد بخلد بریں''

(۱۴۰۵ھ)

کہنا نہ ہوگا کہ پیش نظر کتابچہ صرف تاریخ وفیات پر مشتمل ہے وہ بھی صرف منتخب روزگار مشائخ کے سانحہ ارتحال پر مبنی ہے۔حضرت برقؔ نے بہت تاریخیں کہی ہیں اور فن تاریخ گوئی کی بیشتر صنعتوں کا استادانہ استعمال کیا ہے۔

جہاں تک موجودہ مجموعے کا تعلق ہے ایک طرح کی رثائی فضا ازاول تا آخر قایم ہے اور یہ بھی افادیت سے خالی نہیں کہ یہ شخصی مرثیے کی روایت کو آگے بڑھاتی ہے۔مثلاً ؎

بروزِ عید آہ ایں اطلاعِ دل شکن آمد
کہ آں پیرِ طریقت ، مردِ حق آگاہ و پر تمکیں
محبّ الاولیا سید امام الدین روشن دل
کہ نورش بر سپہرِ معرفت رشکِ مہ و پرویں
خرامید۔ ندسوی جنت الفردوس ازیں دنیا
ہزاراں چشم ترگشتہ و صدہا قلب اندہ گیں

اسی طرح بیشتر پیران طریقت وسجادہ نشینان خانقاہ کی سیرت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔اور بعض تاریخی حقایق بھی روشن ہوتے ہیں۔مثلاً سید شاہ حامد حسین عظیم آبادی کے شاعرانہ

رتبے کا علم ہوتا ہے بلکہ داغؔ واحسنؔ سے ان کی شاگردی کی بھی نشان دہی ہوجاتی ہے ؎

شیخِ طریقت سید حامد حسین حامدؔ
نکتہ رس و سخن در سحرالبیان شاعر
شاگرد داغ و احسنؔ رمز آشنائے ہرفن
آں نازش ادیباں، من جملۂ مفاخر

مثالوں کی بھرمار سے اس پیش لفظ کا طول بڑھانا مقصد نہیں۔صرف نمونتہً اشارہ کردیتا ہوں تاکہ ناقدین ومحققین نیز دیگر شایقین اس زاویے سے بھی اس سے استفادہ کرسکیں۔

جائے شکر ہے کہ ہزار خرابی صحت کے باوجود یہ مختصر سا مقدمہ حضرت برقؔ کی دعاؤں کی برکت سے لکھ سکا کہ انھیں اپنے محسنین میں شمار کرتا ہوں۔سچ یہ ہے کہ قحط الرجال کے اس زمانے میں ان کا سا عابد وزاہد، متقی و پرہیز گار، بے ریا، منکسر المزاج، شگفتہ رو اور خوش طبع، عالم وفاضل میرے احباب میں دوسرا کوئی نہیں۔اللہ انھیں صحت وسلامتی کے ساتھ تادیر زندہ رکھے۔آمین۔

آخر میں ایک بار پھر عزیز گرامی قدر ڈاکٹر سلمان رضوی کو ان قطعات کی یکجائی و ترتیب اور انھیں زیور طبع سے آراستہ کرنے کے لیے دلی مبارکباد دیتا ہوں۔فجزاہ اللہ خیرالجزاء۔

○○○

طلحہ رضوی برقؔ اور تاریخ گوئی کا فن

پروفیسر عبدالقادر جعفری

پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ کو میں گزشتہ تیس سالوں سے جانتا ہوں۔ موصوف پہلے ایچ ڈی جین کالج، آرا اور پھر ویر کنور سنگھ یونیورسٹی، آرا کے شعبہ اردو و فارسی میں اپنے شاگردوں کے علمی ذوق اور ان کے تخلیقی جوہر کو جلا بخشتے رہے اور خود استغناء اور عالمانہ بے نیازی کے ساتھ ادبی و تحقیقی کاموں میں منہمک رہے اور بحمد للہ اس میں اضافہ ہی ہوتا رہا ہے۔ وہ ایک ادیب، انشاء پرداز، نقاد اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ان کی نظم و نثر دونوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی ادبی دلچسپیوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان کی نگاہِ دور رس اور تجربہ عمیق ہے۔ تحقیق و تنقید اور تلاش و جستجو کے رموز سے باخبر ہیں۔ شعریات کی پرکھ کی صلاحیت بھی قدرت نے بہت اچھی عطا کی ہے۔ اسی لیے اپنی شاعرانہ بصیرت سے اردو و فارسی شاعری کے خزانہ میں قیمتی اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ وہ اردو و فارسی کے خاموش خدمت گذاروں میں سے ہیں اور نہایت خلوص کے ساتھ اردو و فارسی کی خدمت میں مصروف ہیں۔ ان کی شخصیت کا خمیر سادگی خلوص اور صداقت سے تیار ہوا ہے۔ ڈاکٹر برقؔ بڑے ضبط و نظم کے آدمی ہیں۔ زندگی کے معمولات میں مستعد، شریعت پر کاربند اور ادبی و شعری سرمایے کو محفوظ رکھنے میں اپنی مثال آپ ہیں۔ ان کے اشعار میں خیالات کا تنوع، نظر کی وسعت اور زبان میں شخصیت کی سادگی اور طہارت کا عکس نمایاں رہتا ہے۔ الفاظ کے مزاج سے انھیں خاص دلچسپی ہے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کسی شاعر کو تمام اصنافِ

سخن پر یکساں قدرت ہو۔ ڈاکٹر برقؔ مستثنیات میں سے ہیں ان کا قلم ہر صنفِ سخن میں یکساں چلتا ہے۔

انسانی جذبات واحساسات کے اظہار کے لیے جو مختلف اصناف سخن رائج ہیں ان میں تاریخ گوئی کو اہم مقام حاصل ہے۔ فارسی میں تاریخ گوئی کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ اسلام کی آمد کے بعد سامانی دور کے شعرا کے یہاں تاریخ گوئی ملتی ہے۔ قدیم ترین تاریخ ابوشکور بلخی کی ملتی ہے اور اسی طرح کسائؔی مروزی نے بھی اپنی تاریخِ پیدائش نظم کی ہے۔ فردوسؔی اور نظامؔی نے بھی اپنے شاہکاروں کی تاریخ لکھی ہے۔ فردوسؔی کو اس میں افضلیت حاصل ہے لیکن اس وقت تک صرف صوری تاریخیں کہی جاتی رہیں۔ مختلف دور کے شعرا نے اس صنف کی ترقی میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی اور انھوں نے اپنے زورِ تخیل سے اسے قصیدہ اور غزل کا ہم پلہ بنانے کی کوشش کی اور اس ارتقائی سفر میں ہزاروں جدت طرازیاں کیں اور نئی نئی صنعتوں کا استعمال کیا۔

معنوی تاریخ گوئی کا رواج ایران میں ایلخانی دور سے کچھ قبل شروع ہو گیا تھا لیکن اصل ترقی ایلخانی اور تیموری عہد میں ہوئی۔ اس عہد کے تذکروں میں بہت خوبصورت تاریخیں ملتی ہیں۔

ہندستان میں فارسی تاریخ گوئی کی روایت آٹھویں صدی ہجری سے پائی جاتی ہے۔ مغلیہ دور میں دوسرے اصنافِ شعر کے ساتھ تاریخ گوئی میں بھی مرصع کاری اور جدت طرازی ہونے لگی۔ سیدھی سادی اور بے ساختہ تاریخوں کے ساتھ ایسی تاریخیں بھی کہی جانے لگیں جن میں طرح طرح کی صنعتیں پائی جاتی ہیں۔ اور کچھ شعرا نے تو ایسے قصیدے لکھے جن کے ہر مصرع سے تاریخ نکلتی ہے۔ نامناسب نہ ہوگا اگر تاریخ گوئی کے سلسلے میں کی گئی تشریحات کو یہاں بیان کر دیا جائے:

> ''بقول صاحب ''فرہنگ دہخدا''، ''سخنوران کلمہ تاریخ را بر لفظی اطلاق کنند کہ حروف مکتوبی آن بہ حساب جمل آن روز را نشان می دہد۔ تاریخ نزد بلفا عبارت اسے از آن کہ جہت حدوث واقعہ لفظی یا مصراعی کہ بہ حسب

حروف مکتوبہ از روی حساب جمل موافق تاریخ سال ہجری ازآن باشد تاریخ آن قرار دہندواحسن آن است کہ کلمہ تاریخ مناسب باشد‘‘۔

ڈاکٹرمنصوررستگارفسائی کے مطابق:

’’مادّۂ تاریخ شعری را می گویند کہ شاعر درشرح وقائع وحوداث مہم و موضوعات وپیش آمد ہای جالب توجہ وقابل ضبط مانندولادت،مصاہرت، مرگ اشخصاص بزرگ وجلوس سلاطین و وزراء و امراء برمسند سلطنت و وزارت وامارت وبنای کا خہای باشکوہ ومساجد وپلہا وکاروانسراہا واماکن خیریہ وتالیف کتب وتدوین دواوین ودیگرموضوعات ساختہ وتاریخ ونوع آن رانیزاہم ازصریح یابہ صورت حساب جمل در پایان مقال ذکرکردہ است‘‘۔

متذکرہ بالا مثالوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تاریخ گوئی کا مقصد کسی واقعہ کے وجود میں آنے کی تاریخ نکالنا ہے اس کی کئی قسمیں ہوتی ہیں یہاں تفصیل درکارنہیں۔ تاریخ گوئی ایک دشوارفن ہے جواحساساتِ قلب کے اظہار کا ایک ذریعہ بنتا ہے۔اس میں شعری تفکر کے ساتھ زبان و بیان پر قدرت اورحساب میں مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔آج کل ہمارے شعراجدیدیت کے نام پرعروض وقوافی سے دوراورسہل پسندی کی طرف مائل نظرآتے ہیں۔لہٰذا اس فن سے دوری لازمی ہے لیکن اس کے باوجود ایسے شعرا موجود ہیں جو تاریخ گوئی میں یدِطولیٰ رکھتے ہیں ان میں پروفیسرولی الحق انصاری کا نام سرِفہرست ہے۔

پیشِ نظرمجموعہ ’’چہل قطعہ تاریخ‘‘ اس بات کا شاہد ہے کہ ڈاکٹر برقؔ کوبھی اس فن میں دسترس ہے۔اس مجموعہ میں برقؔ صاحب نے ایسے بزرگان کی تاریخِ وفات کوقلم بندکرکے شعری جامہ پہنایا ہے جن کا تعلق نہ صرف ایک خانقاہ سے تھا بلکہ وہ ایک عہد تھے ایک تہذیب تھے۔اس مجموعہ میں ان بزرگوں کی تاریخِ وفات نکالی گئی ہے جن سے ڈاکٹر برقؔ کا قلبی تعلق تھا یا نظریاتی اتفاق لیکن اشعار میں کسی قسم کی جانبداری کا احساس نہیں ہوتا ان میں مبالغہ آرائی نہیں بلکہ یہ شدید

احساساتِ قلبی پرمبنی ہیں اوران میں ان حضرات کے حقیقی کردار کے خدوخال کونمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے اوروہ اس حقیقت کی آئینہ دار ہیں جوڈاکٹر برقؔ نے محسوس کیا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی وہ سنجیدگی اورمتانت کی آئینہ دار ہیں اور مبالغہ آرائی اور تصنّع سے مبرّ ا۔موصوف کی تاریخ گوئی تجزیاتی اورمدلل ہے اس لیے اس میں ابہام کی گنجایش نہیں۔ان میں شعری محاسن بھی موجود ہیں۔ڈاکٹر برقؔ نے اس نکتہ کی طرف خصوصی توجہ دی ہے کہ تاریخ گوئی زبردست ذہنی کاوش کی طلبگار ہے۔اس کارشتہ شاعری میں زیادہ مستحکم اورقوی ہوتا ہے۔ الفاظ کے معانی ومفہوم استعارات وکنایات اوردوسرے صنائع اس کے حسن کو ہمیشہ برقراررکھتے ہیں۔پیشِ نظرانتخاب سے ان کے انتخاب تاریخ گوئی میں بھی دیدہ وری جھلکتی ہے۔ان کی تاریخ گوئی کا تعلق جذبات، احساسات اورتاثیرقلبی سے ہے اوراس کارنگ روپ اورمزاج انھیں عناصر سے مرکب ہے۔ان کے اشعارکی سادگی اورستدلالیت ان کے محققانہ ذہن کی غماز ہے۔اصل میں مشاہدات، تجزیات، سانحات اورمحسوسات نے انھیں فن تاریخ گوئی کا ماہر بنادیا ہے۔ جہاں کہیں بھی انھوں نے تاریخ کہی ہے اپنی ژرف بینی اورفن شاعری سے استادانہ واقفیت کا ثبوت دیا ہے۔ یہاں تک کہ ایک ہی شعرمیں ہجری اورعیسوی دونوں تاریخیں نکالی ہیں۔

فارسی کے جس پرآشوب دورمیں ہم رہ رہے ہیں اس سے محبت رکھنے والے اشخاص خال خال ہی ملتے ہیں اس لحاظ سے ڈاکٹر برقؔ کی شخصیت اوران کا مجموعۂ قطعات تاریخ ہرلحاظ سے ممتازاورمنفرد ہے۔ یہ مجموعہ متوازن ومتناسب بھی ہے اورفکری تطہیر کا نمونہ بھی۔

المختصرتاریخ گوئی کے سلسلہ میں یہ مجموعہ ایک اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے اورامید قوی ہے کہ اہلِ ذوق حضرات نہ صرف اس سے لطف اندوز ہوں گے بلکہ اس کی تہہ میں پوشیدہ معنیٰ کی طرف بھی متوجہ ہوں گے۔ اللہ پاک مصنِّف اورمصنَّف دونوں کو مصروفیت و مقبولیت عطافرمائے۔آمین۔

OOO

طلحہ رضوی برقؔ: تاریخ گوئی کے آئینے میں

ڈاکٹر سید شاہ بلال رضوی انجم

روند گانِ طریقت بہ نیم جو نہ خرند
قبای اطلس آنکس کہ از ہنر عاریست

حضرت والد ماجد پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ مدظلہ کو درس وتدریس کے فرائض منصبی سے سبکدوش ہوئے دس سال ہو چکے۔ ان کی علمی فتوحات اور ادبی کارناموں کو دیکھتے ہوئے وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی، دہلی نے انھیں شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی میں ویزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے بحال کرلیا ہے۔ فی الوقت وہ شعبہ ان کی خدمات لایقہ واستعداد فایقہ سے مستفید ہورہا ہے۔

مجھے انتہائی مسرت ہے کہ ''مصابیح التواریخ'' مصنفہ علامہ قتیلؔ داناپوری قدس سرہٗ کے بعد برادر بجاں برابر سید محمد جنید رضوی سلمہ حضرت ابی وشیخی پروفیسر سید شاہ طلحہ رضوی برقؔ مدظلہ کے فرموداہ قطعات تاریخ کو بھی انتخاب وترتیب کی منزل سے گذار کر ''مناصب التواریخ'' کے نام سے شایع کررہے ہیں۔ یہ ایک نہایت مبارک وخوش آیند کام ہے۔

تاریخ گوئی کا فن بہت قدیم ہے۔ ''فاضل اجل شاعر بے بدل منشی حسین علی صاحب فرحتؔ دہلوی'' نے آج سے تقریباً سوا سو سال قبل اس فن سے متعلق ایک کتاب بنام ''ام التواریخ'' لکھی جس سے ۱۲۸۹ھ کی تاریخ نکلتی ہے۔ موصوف رقم طراز ہیں:

''تاریخ کے معنیٰ لغات کی کتابوں میں عرصہ، زمانہ اور علم واقعات

وحادثات کے ہیں اور اصطلاح میں کسی وقت کے ظاہر کرنے کو لکھا ہے۔ چنانچہ مورخوں نے اس سے انسانی مخلوقات کو بڑے بڑے فائدے دیے ہیں، بالخصوص تاریخ گویوں اور شعرا نے اس میں ایک نئی بات پیدا کرکے ملک کو فائدہ پہنچایا ہے یعنی جب انھوں نے دیکھا کہ مورخ واقعاتِ زمانہ لکھ کر مخلوق کو آگاہی دیتے ہیں اس لیے ہم بھی ایسا قاعدہ ایجاد کریں جس سے واقعات اور سنہ کا پتہ لگے یعنی لفظ وجملہ اور مصرعہ واقعات کو ظاہر کریں۔ انھوں نے یہ خیال کرکے فن تاریخ گوئی ایجاد کیا جس میں کسی امرِ عظیم اور واقعۂ قدیم وحال کا الفاظ وجملہ اور مصرع کے ذریعے اصلی حالات یاد دلائے، یعنی الفاظ کے اعداد سے سنہ نکالے......
اور برابر کوشش ہوتی رہی کہ تاریخ میں واقعات کے حالات صریح الفاظ میں ہوں اور تاریخ ٹھیک نکلے'' (ص۱۰)

یقینی طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ تاریخ گوئی کا موجد کون ہے اور اس فن کا آغاز کب ہوا۔ کتابوں کی ورق گردانی سے کچھ ہاتھ نہیں لگتا، بس اتنا کہ عہد عالمگیری میں شخصے محمد جعفر رومی نے فصلی سنہ میں تاریخ کہنی شروع کی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ دیگر سنین مثلاً عیسوی، شمسی، ہجری، سمبت، مہدوی وغیرہ میں بھی تاریخیں کہی جانے لگیں۔

تاریخ گو شعرا نے اس مفید عام اور خیرِ کلام فن اور صنف کے لیے کچھ ضروری قواعد مقرر کر رکھے ہیں۔ علم العروض کی طرح ان قواعد میں بھی عرصہ دراز پر کبھی کبھی مگر بہت کم ترمیم و تحریف بھی ملتی ہے۔ تاریخ کے لیے جو لفظ کلمہ یا مصرع لکھا جاتا ہے یعنی جس کے الفاظ کے اعداد جوڑ کر سنہ برآمد کرتے ہیں اسے مادّہ تاریخ کہا جاتا ہے۔ عام طور پر اسے ملہم غیب، ہاتف وسروش ہی کی طرف سے الہام تصور کیا جاتا ہے۔ تاریخ گو اسے اپنا کمال نہیں قرار دیتا بلکہ تائید غیبی خیال کرتا ہے۔

قواعد تاریخ گوئی کے ضمن میں اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ تاریخ میں حروف مکتوبی کا

لحاظ وشمار ہو حروف ملفوظی کا نہیں۔ یعنی جو حروف کتابت میں آتے ہیں اور لکھے جاتے ہیں ان کے ہی اعداد شمار ہوں اور جو لفظ تلفظ میں آتے ہیں اور محض بولے جاتے ہیں مگر لکھے نہیں جاتے ان کے عدد نہیں لیے جائیں۔ چنانچہ بعض تاریخ گویوں نے اس امر میں غلطیاں کی ہیں لیکن دور حاضر کے تاریخ گوان الزاموں سے بری ہیں کیونکہ یہ فن اپنے ارتقائی مراحل میں بڑی احتیاط کا حامل ہو چکا ہے۔ چند مثالوں سے اس کی صراحت ہوگی۔ مثلاً لفظ ''آمنوا'' میں واو کے بعد جو الف کتابت میں آیا ہے وہ تلفظ میں نہیں ہے تاہم اس الف کا عدد شمار ہوگا اسی طرح واقتلو ہم میں واو کے بعد الف مکتوبی ہے ملفوظی نہیں۔ اس کا بھی عدد لیا جائے گا۔

''عمروؔ'' میں آخری واو اگرچہ تلفظ میں نہیں آتی مگر لکھی جاتی ہے لہٰذا اس کا عدد لیں گے۔ ''سمٰوات'' میں میم پر کھڑا زبر بطور الف تلفظ میں آتا ہے مگر چونکہ کتابت میں نہیں آتا لہٰذا اسے شمار نہ کریں گے۔ اسی طرح الف مقصورہ مثلاً عیسیٰ، موسیٰ، کبریٰ میں الف کا تلفظ ہے کتابت میں نہیں اس لیے اس کا عدد نہ لیں گے۔ الف ممدودہ یعنی جس الف پر مد (~) ہو اسے دو الف شمار کرنا قاعدہ تاریخ کے خلاف ہے۔ مثلاً آم کا عدد ۴۱ ہی لیں گے ۴۲ نہیں۔

بعض شعرا نے الف ممدودہ کے دو عدد لینا درست جانا ہے، ان کی رائے ہے کہ عربی میں الف ممدودہ اا دو الف ملا کر بھی لکھتے ہیں اور تقطیع میں بھی ''آ'' بروزن فا شمار ہوتا ہے، لیکن جس نے بھی الف ممدودہ کے ۲/عدد لیے ہیں محض ضرورت تاریخ کے لیے اور یہ عجز فن ہے اور ایک طرح کا فنی عیب۔

تائے مدوّرہ: اس کا عدد مکتوبی ہائے ہوز کا لینا درست ہے۔ تائے قرشت کا عدد لینا غلط ہوگا جیسے ''زبدۃ الفقراء'' کی تائے مدوّرہ وغیرہ۔

کہتے ہیں کہ حروف ابجد حضرت ادریس پیغمبر علیہ السلام کے ترتیب دیے ہوئے ہیں۔ انھوں نے اس ابجد کو ترتیب دیا اور آٹھ کلمے بنائے۔ اس ابجد میں عربی کے تمام حروف آگئے ہیں۔ ان حرفوں کے اعداد بھی مقرر کیے گئے ہیں جنھیں حساب جمل کہتے ہیں۔ حساب ابجد میں ہیں:

ابجد،	ہوز،	حطی،	کلمن،	سعفص،	قرشت،
۴۳۲۱	۷۶۵	۱۰۹۸	۵۰۴۰۳۰۲۰	۹۰۸۰۷۰۶۰	۴۰۰۳۰۰۲۰۰۱۰۰
ثخذ	ضظغ				
۷۰۰۶۰۰۵۰۰	۱۰۰۰۹۰۰۸۰۰				

عربی زبان کی تاریخ گوئی میں اٹھائیس حروف تہجی مستعمل ہیں لیکن فارسی میں آکر پ، چ، ژ، گ، فارسی حروف اور شامل ہو گئے۔ اردو میں حروف تہجی کی تعداد ۵۲ ہیں۔ ج، چ، چھ، کا عدد ایک ہی ہے یعنی ۳ا۱ اس طرح ب، پ، پھ، اور ڑ وغیرہ کو قیاس کیا جائے۔

مادّہ قسم الہام سے ہے اور تاریخ اقسامِ بلاغت سے، یہی وجہ ہے کہ مادّہ کو مقولہ ہاتف یا آوازِ سروش کہتے ہیں، فن تاریخ گوئی کے قواعد اساتذۂ فن نے مقرر کر دیے ہیں۔ مثلاً الف مقصورہ کے دس عدد لیتے ہیں جیسے عیسیٰ، موسیٰ، اعلیٰ، ادنیٰ وغیرہ ہیں۔ الف ممدودہ میں اگرچہ دو الف ہیں مگر مد حساب کی مد سے خارج ہے۔ بعض کے نزدیک چونکہ عربی میں الف ممدودہ دو الف ملا کر بھی لکھتے ہیں لہٰذا مد کا عدد بھی لیتے ہیں اسی طرح ہمزہ بھی اہلِ فن کے نزدیک مختلف فیہ ہے کوئی شمار ہی نہیں کرتے کوئی ۱۰ اعدد لیتے ہیں مثلاً جائز، جایز اور عجائب: عجایب وغیرہ۔

اس فن میں اساتذہ نے ایک سے ایک صنعت استعمال کی ہے۔ تعمیہ تخرجہ اور زبر و بینات سے کام لیا ہے۔ شعرا نے تعمیہ تخرجہ کے چند اشارے مقرر کیے ہیں مثلاً سر ہر لفظ کے لیے ابتدا، اول، لب، دست، چشم، رخ، دہان، دنداں، زبان، بینی، روئے، پیش، شاخ وغیرہ۔

حروف دوم کو دوم، اوسط، میان، کمر، ضمیر، دل، قلب جگر، شکم کہتے ہیں۔

حروف سوم کو سوم، انجام، پس، پائے، اصل، پایان، انتہا، حد وغیرہ کہتے ہیں۔ کسی نے حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کی تاریخ ان کے نام مبارک سے کیا خوب نکالی ہے ؎

سر جدا شد از حسین و گشت تاریخ آشکار
ہم زحرف بے نقط ہم از حروف نقط دار

یعنی ۶۰ھ ''ح'' س ی ن ین ۶۰ +۱۰ ۵۰

اکثر شعرانے اپنی ذہانت وفطانت، طباعی وملکہ خداداد کا جو ہر اس فن میں خوب خوب دکھایا ہے۔حکیم مومن خاں مومن نے مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی کی کیا خوب تاریخ نکالی ہے۔

انتخاب نسخۂ دین مولوی عبدالعزیز
بے عدیل و بے نظیر و بے مثال و بے مثل
جانبِ ملکِ عدم تشریف فرما کیوں ہوئے
آ گیا تھا کیا کہیں مردوں کے ایماں میں خلل
مجلس درد افرین تعزیت میں مَیں بھی تھا
جب پڑھی تاریخ مومنؔ نے یہ آکر بے بدل
دست بیداد اجل سے بے سروپا ہوگئے
فقر و دیں، فضل و ہنر ، لطف و کرم، علم وعمل

۱۲۳۹ھ

یعنی ق + ی + ض + ن + ط + ر + ل + م

۱۰۰+۱۰+۸۰۰+۵۰+۹+۲۰۰+۳۰+۴۰=۱۲۳۹

اس طرح تاریخ گوئی میں بھی فنکاری کی بے شمار مثالیں ہیں۔ ایک سے ایک دلچسپ۔منشی طوطا رام شایاںؔ لکھنوی کے مرنے پر کسی شاعر نے یوں تاریخ نکالی تھی۔

گربۂ مرگ نے جو دھر دابا
کچھ نہ نکلا سوائے ''ٹے ٹے ٹیں''

۱۲۸۰ھ

شہسرام میں شیر شاہ کے مقبرہ کے گرد تالاب ہے جو تالاب شیر شاہ کے نام سے مشہور ہے۔۱۳۰۰ھ میں اس تالاب کی صفائی ہوئی تھی اس سے کیچڑ کادو جسے پانکا بھی کہتے ہیں نکال دیا گیا تھا اور دریائے سون کا صاف اور تازہ پانی نہر کے ذریعہ لاکر اس میں گرایا گیا تھا۔

دریائے سون کو غالب نے ''سوہن'' اور آبِ سوہن ہی لکھا ہے۔شہسرام کے ایک شاعر نے اس واقعہ کی تاریخ کیا خوب نکالی ہے، ملاحظہ ہو۔

تالابِ شیر شاہ سے پانکا نکال کے
آبِ سوہن ملایئے تاریخ ابل پڑے

تالاب شیر شاہ=۱۲۵۰- پانکا= ۷۴=۱۱۷۶ھ + آب سوہن = ۱۲۴=۱۳۰۰ھ۔

پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ مدظلہ نے یہ فن ورثہ میں پایا ہے اور اپنی طبع وقاد سے جلا دی ہے۔آپ کو اردو فارسی دونوں زبانوں میں تاریخ گوئی کا ملکہ ہے۔ان کے ''چہل قطعہ تاریخ'' پر تقریظ لکھتے ہوئے فاضل اجل علامہ ناوکؔ حمزہ پوری یوں رقمطراز ہیں :

''عام طور پر ہوتا یہ آیا ہے کہ بیشتر لوگ اپنے اسلاف، اپنے خاندان کے لوگوں پر، ان کے کارناموں پر فخر کرتے ہیں۔کم تر ایسا ہوتا ہے کسی شخص پر، ان کی گارگزاریوں پر، اس کے علم وفضل پر خود اس کا خاندان ہی نہیں، اس کا معاشرہ، اس کا ملک فخر کرنے لگے۔فی زمانا برادر محترم حضرت طلحہ رضوی برقؔ کی شخصیت ایسی ہی جامع کمالات ہے جس پر نہ صرف یہ کہ ان کے اہلِ خاندان بلکہ پوری علمی وادبی دنیا بجا طور پر فخر کرتی ہے''۔

''......جائے شکر وسپاس ہے کہ علم وادب ، زبان وبیان کے اس دور انحطاط پذیر میں بھی ہمارے درمیان جلیل القدر علمی وادبی خانوادے کے سلسلۃ الذہب کی درخشاں کڑی پروفیسر ڈاکٹر سید شاہ طلحہ رضوی برقؔ موجود ہیں جو اس فنِ لطیف کو بھی سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔آپ نے کیا اردو اور کیا فارسی ہر دو زبان میں بے شمار تاریخیں رقم کی ہیں اور مجھے کہنے دیجیے کہ فی البدیہہ، برجستہ اور حسبِ حال تاریخ گوئی میں میری نظر میں موصوف کا ہمسر کوئی دوسرا نہیں''

''......حضرت برقؔ کی تاریخ گوئی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی

برجستگی میں بے مثال ہوتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حسبِ حال ہوتی ہے۔ بعض حضرات ایسے عمومی فقرے، جملے یا مصرعے سے تاریخ برآمد کر کے خوش ہو لیتے ہیں جو اس سنہ و سال میں ہر وفات پانے والے پر منطبق کیے جا سکتے ہیں۔ برقؔ صاحب اس عمومیت سے دامن کش رہے ہیں اور آپ نے تاریخ ایسے الفاظ، فقرے یا مصرعے سے برآمد کی ہے جو صرف اسی شخص کے لیے مخصوص ہوتی ہے جس کے لیے وہ کہی گئی ہے۔

مثلاً حضرت شاہ امام الدین اشرفی کی تاریخ ارتحال:

''بخت زیب شد الحاج سید شاہ امام الدین''(۱۳۷۸ھ)

یا پھر ''بلبل خلد بریں شاہ محمد ایوب''(۱۳۸۷ھ) سے حضرت سید شاہ محمد ایوب ابدالی کی تاریخ کہی۔

یا پھر ''شاہ والا شان قطب الدین احمد جنتی''(۱۴۱۷ھ) سے سید شاہ قطب الدین احمد چشتی کی تاریخ رحلت برآمد کی۔

بعض تاریخوں میں شعر کے دونوں مصرعوں سے الگ الگ ہجری و عیسوی دونوں سال برآمد کیے ہیں۔ مثلاً حضرت سید شاہ مختار اشرف کچھوچھوی کا سال ارتحال ہے ؎

آہ سرکار کلاں ممدوح خلق (۱۴۱۷ھ)
سیدی مختار اشرف نیک باز (۱۹۹۶)

پروفیسر ڈاکٹر عبدالقادر جعفری صدر شعبۂ فارسی و عربی الٰہ آباد یونیورسٹی حضرت برقؔ کی تاریخ گوئی پر یوں اظہار خیال فرماتے ہیں:

''ڈاکٹر برقؔ کو اس فن میں دسترس ہے...... موصوف کی تاریخ گوئی تجزیاتی اور مدلل ہے۔ اس لیے اس میں ابہام کی گنجائش نہیں۔ ان میں شعری محاسن بھی موجود ہیں۔ ڈاکٹر برقؔ نے اس نکتہ کی طرف خصوصی توجہ دی

ہے کہ تاریخ گوئی زبردست ذہنی کاوش کی طلبگار ہے۔ الفاظ کے معانی و مفہوم، استعارات و کنایات اور دوسرے صنایع اس کے حسن کو ہمیشہ برقرار رکھتے ہیں...... جہاں کہیں بھی انھوں نے تاریخ کہی ہے اپنی ژرف بینی اور فن شاعری سے استادانہ واقفیت کا ثبوت دیا ہے۔ یہاں تک کہ ایک ہی شعر میں ہجری و عیسوی دونوں تاریخیں نکالی ہیں''۔

یقیناً ڈاکٹر جنید رضوی نے ''مناصب التواریخ'' کو ترتیب دے کر ایک بڑا کام کیا ہے۔ امید ہے کہ دوست اربابِ نظر کے حلقے میں اسے مقبولیت حاصل ہوگی۔

○○○

پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ کی سہرا نگاری

(مکتوبی تبصرہ)

پروفیسر سید وحید اشرف کچھوچھوی

آپ کی کتاب سہروں کا مجموعہ مجھے بہت پہلے مل چکی تھی۔ مجھے فوراً باہر جانا پڑا۔ یہ خط بھی بحالتِ سفر لکھ رہا ہوں۔ اس سے پہلے سہروں کی نظم کا کوئی مجموعہ میرے علم میں نہیں آیا۔ سہرے میں نے خود بھی بہت لکھے تھے۔ لیکن محفوظ کرنے کا کوئی خیال نہیں آیا۔ ابھی حال ہی میں ایک صاحب نے فرمایش کی تھی۔ کچھ اشعار برجستہ لکھ کر دے دیے۔ صرف مطلع یاد ہے وہ یہ ہے۔

عزیزو سنت نبوی کی دیکھو کیا بہار آئی
رئیس روح بن کر شایستہ سنوار آئی
دولھا دولھن

سہروں کا مجموعہ چھپوانے کا جو کام آپ نے کیا ہے، اس سے محسوس ہوتا ہے کہ اس کی روایت بہت پہلے سے ہونی چاہیے تھی۔ سہرا لکھنا اور پڑھنا ہماری مہذب روایت کا جزو ہے اور اس کا رواج ان خاندانوں میں پایا جاتا ہے جن میں علم وادب کا ذوق توارث کے ساتھ چلا آرہا ہے۔ گویا سہرا تہذیب، شایستگی، ادبی ذوق اور علم وادب سے ''خاندانی وابستگی'' کی علامت ہے۔ اگر چہ یہ روایت اب بھی زندہ ہے لیکن آپ سے پہلے سہروں کا مجموعہ چھپوانے کا خیال کسی کو نہ آیا تھا۔ کبھی کبھی شاعر نے کوئی سہرا لکھا اور نمونہ کے طور پر اپنے شعری مجموعہ میں دو ایک سہرے کی نظم کو شامل کرلیا۔ ایک صنف شاعری کی حیثیت سے اسے کسی نے نہیں برتا۔

سہروں میں دولھا اور دولھن کے اعزّ واقربا اور خاص دوست واحباب کے نام بھی شعر میں موزوں کیے جاتے ہیں۔ ان ناموں کا معنوی مناسبت سے استعمال شاعر کی فکرِ لطیف کو ظاہر کرتی ہیں اور وہ جب سہرا پڑھتا ہے تو اس کی ذہانت اور شعور کو داد سامعین دیتے ہیں۔ اس موقع پر داد وتحسین کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ شاعر کو انعامات سے نوازا جاتا ہے اور شاعر خواہ صاحب ثروت ہی کیوں نہ ہو اس انعام کو قبول کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے کیونکہ یہ انعام اس کے شعر کی داد ہے اور شاعر کو تو داد وتحسین ہی چاہیے۔

سہرا پڑھنے کا وقت عقدِ نکاح کے فوراً بعد ہوتا ہے۔ عام طور سے لوگ کام ودہن کو داد دینے کے لیے بے تاب ہوتے ہیں لیکن یہ وقت اربابِ ذوق کے لیے کچھ زیادہ دلچسپ ہوتا ہے۔ ایک طرف لذتِ کام ودہن کا تقاضا دوسری طرف لذتِ شعروسخن کی کشش اور پھر تبریک، خوش آمدید، مرحبا کی لگاتار کی بارش ایک بزم ناز کا سامان مہیا کرتی ہے اور اس میں سہرا خوانی کی خوش آوازی اور اس کی شرر باری گویا ماہ کے گرد ستاروں کا شرر بار جھرمٹ بن کر وہ پر کیف منظر پیش کرتی ہے جس کی یاد برسوں تک قائم رہتی ہے۔ اس کی چاشنی کو مہذب اور باذوق ارباب ہی محسوس کرسکتے ہیں۔

پروفیسر طلحہ رضوی برق کو شعروسخن اور علم وادب کا ذوق ورثہ میں ملا ہے۔ انھوں نے بیشتر اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور قادرالکلامی کے جوہر دکھائے ہیں۔ کتاب کے آخر میں ان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف کی فہرست اور مطبوعہ کتابوں پر اہلِ نظر کی رائیں ان کے بلند اور شستہ علمی وادبی ذوق کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔

سہروں کا مجموعہ ''سہرے ہی سہرے'' کو ان کی بیٹی ڈاکٹر قدسیہ فاطمہ ضیاء نے مرتب کر کے ادبی کام کا آغاز کیا ہے۔ امید ہے کہ دنیائے شعر اور سہر...... یہ روایت کی ایک بنیاد بن جائے اور آئندہ اس طرح کے شعری مجموعہ بھی شائع ہوتے رہیں اور یہ تہذیبی روایت شعروادب کا ایک جزو بن جائے۔ کتاب ''سہرے ہی سہرے'' ہماری ایک تہذیبی روایت کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔

○○○

غور وفکر، تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر ظفر کمالی

پروفیسر سید شاہ طلحہ رضوی برق کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کا شمار اردو کے اکابر ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ان کی علمی فتوحات کا دائرہ بے حد وسیع ہے۔ وہ فارسی اور اردو، دونوں زبانوں پر یکساں درک رکھتے ہیں۔ ان کے تحقیقی وتنقیدی مضامین کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے بڑی تعداد میں تقریظیں لکھیں۔ ان کے چھوٹے بڑے تبصروں کی تعداد بھی کم نہیں۔ تصوف اور مذہبیات پر گہری نظر ہونا ان کے لیے فطری بات ہے۔ ترجمے کے فن میں بھی وہ طاق ہیں۔ عصرِ حاضر میں بہار کی حد تک اردو اور فارسی تاریخ گوئی میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ حمد و نعت، غزل، رباعی اور سہرا نویسی میں ان کی قابلِ قدر خدمات ہیں۔ کسی بھی موضوع کے کنہہ تک پہنچ جانا ان کا وتیرۂ خاص ہے۔ وہ وسیع المطالعہ بھی ہیں اور وسیع النظر بھی۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود یہ بات بھی سچ ہے کہ مبداءِ فیض سے انھیں جتنی اور جیسی علم کی دولت عطا ہوئی اس سے انھوں نے بہت کم کام لیا۔ وہ صاحبِ سجّادہ بھی ہیں۔ مسندِ ارشاد حاصل ہونے کی وجہ سے انھیں رشد و ہدایت کا فریضہ بھی انجام دینا پڑتا ہے۔ مذہبی مجالس اور مریدین ومتوسلین کے پیہم اصرار پر آئے دن کا سفر اس پر مستزاد ہے۔ شاید اسی مصروفیت نے انھیں اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ ادب کی جانب اپنے حوصلے کے مطابق بھرپور توجہ دے سکیں، لیکن اس کے باوجود انھوں نے معیار و مقدار کے حساب سے جو کچھ لکھا وہ ان کے علمی وقار کے اظہار کے لیے کافی ہے۔ ذیل کی سطور میں ان کی کتاب ''غور وفکر'' کا جائزہ مقصود ہے۔

''غور وفکر'' طلحہ رضوی برق کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ ہے جو ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔ اس میں سولہ مضامین اور چار تبصرے ہیں۔ مجموعے کا پہلا مضمون ''تقدیرِ غزل'' ہے۔ غزل کی حمایت اور مدافعت میں جتنے مضامین لکھے گئے ہیں ان میں یہ مضمون خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ طلحہ صاحب نے بہت تفصیل سے غزل کی اہمیت، اس کی خصوصیت اور اس کے حسن و جمال پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ غزل کی شگفتگی وشادابی، نرمی ونزاکت، رنگینی ودلکشی اور فطری لطافت کو اس کے فروغ کا سبب قرار دیتے ہیں۔ غزل کی ایمائیت اور رمزیت کو انھوں نے غزل کا جوہر کہا ہے۔ اس کے مزاج کی پاکیزگی، اس کی نفاست اور شرمیلی کیفیت میں غزل کا حسن پنہاں ہوتا ہے۔ وہ اس کی خوبیوں کا بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''غزل کی سب سے بڑی خوبی اس کا مخصوص اسلوب وآہنگ اور زبان ہے۔ کوثر وتسنیم سے دھلی ہوئی صاف وشفاف اور شیریں۔ غزل کا داخلی سیمابی اضطراب شاعر کے جذباتی ہیجان اور تخیل کی ناآسودگی سے عبارت ہے اور اس کا خارجی سکون شائستگی وتہذیبِ نفس کی علامت ہے۔ غزل کے اچھے اشعار کہنا پارے کو چٹکی سے پکڑنا ہے۔ غزل توازن اور اعتدال کی متقاضی ہے۔ اس پر قابو پانا گویا تھرتھراتے ہوئے پارے کو جما دینے کا عمل ہے...... غزل ہماری زندگی کا ایک حصّہ ہے۔ وہ ہمارے ساتھ چلتی پھرتی اٹھتی بیٹھتی ہے۔ ہمارے دکھ درد، عیش وعشرت، خوف وہراس اور خلوت وجلوت کی شریک ہے۔ غزل ہمارے رچے ہوئے مشرقی کلچر کی نمایندہ ہے''۔

یہ پورا اقتباس نقاد کی گہری اور معنی خیز سوچ کی عکاسی کرتا ہے۔ ''غزل کے اچھے اشعار کہنا پارے کو چٹکی میں پکڑنے کا عمل ہے'' اس بلیغ جملے میں ایک جہانِ معنی سمٹ آیا ہے۔ جسے غزل کے فن کا سچّا عرفان نصیب نہ ہو وہ ایسا جملہ لکھ ہی نہیں سکتا۔ غزل ہماری زندگی سے جس قدر قریب ہے، کوئی دوسری صنف اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ طلحہ رضوی برق نے اس بات پر اپنے دکھ کا

اظہار کیا ہے کہ کچھ پڑھے لکھے حضرات غزل کی مخالفت کیوں کرتے ہیں۔اس ضمن میں انھوں نے مولوی وحید الدین سلیم،عظمت اللہ خاں،کلیم الدین احمد اور جوشؔ ملیح آبادی کا نام لیا ہے۔ انھوں نے غزل کی مخالفت میں جوشؔ کے چار طنزیہ اشعار درج کرنے کے بعد ایک ایسا جملہ لکھا ہے جس سے اتفاق کرنا ممکن نہیں۔وہ لکھتے ہیں:

''(جوشؔ)اپنے زورِکلام اور قدرتِ بیان سے خواہ جو فائدہ اٹھائیں مگر سنجیدہ حالات میں کسی علمی وفکری موضوع پر ان سے سنجیدہ اور صائب رائے کی توقع بے سود ہے''۔

غزل کے تعلق سے جوشؔ کے خیالات سے کوئی بھی اختلاف کرسکتا ہے لیکن ان کے تعلق سے یہ کہنا کہ وہ کسی علمی وفکری موضوع پر سنجیدہ وصائب رائے دے ہی نہیں سکتے،ان کی تمام تر ذہنی صلاحیت اور ادبی شعور پر ہی سوالیہ نشان لگا دیتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس سے متفق ہونا ممکن نہیں۔طلحہ رضوی برقؔ غزل پر کیے گئے اعتراضات کی اتنی اہمیت تو ضرور تسلیم کرتے ہیں کہ اس نے سوچنے کا ایک نیا زاویہ فراہم کیا لیکن وہ ان معترضین کے علمی مرتبے کو تسلیم کرنے کے باوجود یہ کہتے ہیں کہ یہ حضرات مشرقی تہذیب وتمدن کے تعلق سے احساسِ کمتری کا شکار ہیں۔مغربی علم کی گرویدگی ان کی نفسیاتی کمزوری کی علامت ہے۔دراصل معاملہ ایسا ہے نہیں۔ہر دانش ور اور ہر نقاد کی سوچ کا زاویہ مختلف ہوتا ہے۔وہ اپنے نقطۂ نظر سے ادب کو دیکھتا اور سمجھتا ہے۔غزلوں کے تعلق سے جتنے اعتراضات کیے گئے ہیں انھیں یکسر مسترد نہیں کیا جاسکتا۔جذباتی ہوئے بغیر اگر غور وفکر سے کام لیا جائے تو معترضین کی باتیں بھی قابلِ غور نظر آتی ہیں۔کلیم الدین احمد نے غزل پر سخت نکتہ چینی کی لیکن وہ بھی یہ تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکے کہ غزل اردو کی سب سے مقبول صنفِ سخن ہے اور مستقبل میں بھی اس کی یہ مقبولیت برقرار رہے گی۔

غزل کا شعر کہنے کے لیے شاعر کو کن دشوار منازل سے گزرنا پڑتا ہے،غزل انسانی جذبات سے کتنی ہم آہنگ ہے،حالات کی ناسازی سے یہ کیسے متاثر ہوتی ہے،اس میں برانگیختہ جذبات کی مہذب ترجمانی کس طرح ہوتی ہے اور یہ کیسے شعورِ کائنات کو شعورِ ذات سے ہم آہنگ

کرتی ہے،طلحہ صاحب نے بڑے موثر پیرایے میں اس کی ترجمانی کی ہے۔انھوں نے یہ اہم نکتہ بھی پیش کیا ہے کہ غزل شعور اور لاشعور کے بین بین چلتی ہے اور اس کا سلسلہ لاشعور کے ظلمات تک پہنچ جاتا ہے اور یہ شاعر کو ممکنات کے دائرے میں ہی رکھتی ہے۔انھوں نے کلاسیکی شعرا کے مختلف اشعار کے ذریعے غزل کے مخصوص مزاج وآہنگ کو سمجھانے کی کامیاب کوشش بھی کی ہے۔ غزل کے مخصوص پیرایۂ بیان اور مخصوص ترکیبوں کی مثالیں پیش کرتے ہوئے طلحہ صاحب نے بتایا ہے کہ مفاہیم کی وسعت اور کثرتِ الفاظ نے انھیں مستقل علامت کی شکل دے دی ہے اور انھیں سے تغزل کی شان برقرار ہے۔انھوں نے اس لطیف صنفِ سخن کے مصائب کے کڑے دن کا تذکرہ کرتے ہوئے جوشِ بیان میں یہ بھی کہہ دیا ہے کہ غزل کو ختم کرنے کی شعوری کوششیں بھی ہوئیں۔عظمت اللہ خاں نے یہ ضرور کہا تھا کہ غزل کی گردن بلاتکلف مروڑ دینی چاہیے لیکن یہ محض ان کی خام خیالی تھی۔چند لوگوں کے اعتراضات کو اسے ختم کرنے کی شعوری کوشش سمجھنا درست نہیں ہے۔

طلحہ رضوی برقؔ نے غزل کی خصوصیات سے تفصیلی بحث کرتے ہوئے اس کے مختلف موڑ اور نئے ادوار پر بھی نظر ڈالی ہے۔تقسیمِ ہند کے بعد غزل کی بدلتی صورتِ حال،ترقی پسند اور جدید شاعری کے لب ولہجے،جدید انسان کی سوچ کے میکانکی انداز اور اس کے بدلتے انداز سے غزل کی ہم آہنگی،آزاد غزل کا تجربہ اور جدیدیت کے اثر سے داخلی طور پر غزل کی بے سمتی، سب کچھ ان کی نگاہوں میں ہے جس سے ان کی نظر کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔غزل کا فن اور اس کی خصوصیات بیان کرنے میں انھوں نے بڑی جگر کاوی کی ہے اور مختلف زاویوں سے اس کے داخلی اور خارجی محاسن کو بیان کیا ہے۔بعض جگہوں پر قدرے جذباتیت بھی موجود ہے لیکن بالعموم ان کا طرزِ بیان استدلالی ہے۔اس کا شمار ان کے نمائندہ مضامین میں ہونا چاہیے۔

''آزاد شاعری'' کے عنوان سے اس مجموعے میں جو مضمون شامل ہے وہ تنقیدی کم تعارفی زیادہ ہے۔طلحہ صاحب قدیم روایات واقدار کے حامل شخص ہیں لیکن یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ انھوں نے آزاد شاعری کے تجربے پر ناک بھوں نہیں چڑھائی بلکہ اس صنف کا خوش دلی کے

ساتھ استقبال کیا ہے۔ انھوں نے مقالے کی ابتدا میں اردو میں ہیئت کے لحاظ سے تجربے نہیں ہونے کی جو وجہ بیان کی ہے وہ بالکل درست ہے۔ انگریزی اصناف کے اثر سے اردو میں نظمِ معریٰ اور آزاد نظم لکھنے کا رواج ہوا۔ مقالہ نگار نے دونوں کے فرق کو بڑی سادگی کے ساتھ بیان کردیا ہے۔ قدیم ماحول کے پروردہ جن اصحاب نے آزاد نظم کو شاعری کے دائرے سے خارج کرنے کی کوشش کی، مقالہ نگار ان کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے:

> ’’اردو شاعری کی صنف مستزاد کو ہی لے لیجیے، کیا ہمارے بزرگ شعرا مصرعوں پر الگ سے ایک دو رکن کا اضافہ کر سکتے تھے اور آج ہم کسی مصرع میں ایک دو رکن کی تخفیف کا حق بھی نہیں رکھتے...... کیا انشا اور مصحفی بحرِ طویل کا نام دے کر ایک ایک مصرع پر پچاس پچاس اور سو سو رکن تراش سکتے تھے اور موجودہ ترقی یافتہ عہدِ زبان و بیان میں ہم ایسا کوئی نیا قدم نہیں اٹھا سکتے‘‘؟

تقریباً ساٹھ برس قبل لکھے گئے اس مضمون میں خانقاہی ماحول کی پروردہ شخصیات کے ذریعے آزاد شاعری کی ہیئت کی یہ وکالت نہایت قابلِ تعریف ہے۔ مقالہ نگار نے آزاد شاعری کے نمائندہ شعرا ن۔م راشد، تصدق حسین خالد، میراجی، عبدالمجید بھٹی کو کوششوں کو سراہتے ہوئے ایک درجن سے زائد ایسے شعرا کا بھی تذکرہ کیا ہے جو بعد میں اس کی جانب متوجہ ہوئے۔ آزاد شاعروں میں سے کچھ شعرا کیسے شاعری کی بنیادی ضرورتوں کو ہی بھول بیٹھے اور اس صنف میں کس طرح ابہام، اشاریت اور تخئیلیت کی آمیزش ہوئی، خیالات کی اہمیت اور اشعار کی مقصدیت کو نظر انداز کرتے ہوئے کیسے محض بے معنیٰ تصور پیدا کرنے کی کوشش کی گئی اور اپنی انفرادیت کو اجاگر کرنے کے چکر میں منفی تصورات، لاشعوری کیفیات اور مبہم خیالات کو ہی سب کچھ سمجھ لیا گیا، مقالہ نگار نے بڑی باریک بینی سے ان تمام پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ بعض آزاد نظم لکھنے والوں کی عروضی غلطیوں کی جانب بھی اشارے کیے گئے ہیں۔

مقالہ نگار نے اس جدید صنفِ سخن کو خیالات کے جدید ذریعۂ اظہار بن کر زندہ رہنے کے جن

روشن امکانات کا تذکرہ کیا تھا وہ جدید تر شعری منظر نامے میں ایک روشن حقیقت بن کر سامنے آچکا ہے۔

’’نئی شاعری۔ ایک تاثر‘‘ دراصل جدیدیت کی تحریک سے متاثر شعرا کے فکری نظام پر بڑا واضح اور محتاط ردِ عمل ہے۔ طلحہ صاحب نے اس مضمون میں یہ اعتراف کیا ہے کہ:

> ’’مجھے نئی (جدید) شاعری سے کوئی اللہ واسطے کا بیر نہیں۔ میرا نظریہ صالح روایات کی روشنی میں تجربات کا ہے۔ میں ادب میں صحت مند اختراع و اضافہ کا قائل ہوں اور ان فن کاروں کا دل سے معترف و معتقد ہوں جو اردو شاعری کا دامن وسیع کر رہے ہیں‘‘۔

مقالہ نگار کو نئی شاعری میں فن کارانہ حسن کے ساتھ سنجیدہ فن پارے بھی نظر آتے ہیں جس کے پیشِ نظر وہ نئی شاعری سے مایوس نہیں لیکن جدید شاعروں کا بڑا طبقہ اپنی ادبی روایت ہی سے دامن کش نظر آتا ہے۔ وہ روایت جو ادب کے لیے بنیاد کا پتھر ہے ان سے انحراف کرنا اور ارتقا کے نام پر مقالہ نگار کے لفظوں میں نچلی اور پچھلی سیڑھیوں کو توڑتے ہوئے اوپر کی سیڑھیاں تعمیر کرنا کوئی مستحسن فعل نہیں۔ اسی لیے اس نے نئی شاعری کی بنیادی کمزوریوں پر بڑے سلیقے سے روشنی ڈالی ہے۔ اصول و قواعد میں اصلاح کے نام پر محاورے اور قواعد سے روگردانی، زبان کے مخصوص لب و لہجے کو خاطر میں نہیں لانے کی روش، مانگے کے اجالے سے اپنے دامن کو بھرنے کی کوشش اور اقدارِ زندگی سے یکسر چشم پوشی جیسی بے راہ روی سے وہ بھی متفق نہیں۔ طلحہ صاحب کا جدید شاعروں پر یہ بڑا الزام ہے کہ ان کی شاعری کا بڑا حصہ فراری ذہنیت کی پیداوار ہے۔ ان کے مطابق:

> ’’کل کا شاعر تسکینِ انا کے لیے اپنے غم والم اور آفات و مصائب پر نازاں تھا۔ نیا شاعر اپنی رگوں میں اب وجد کے خون کو بھی ’تنگِ وجود‘ سمجھتا ہے بلکہ اس کا منکر ہے۔ اب سوچیے اسے آبائی حوصلہ، عزم و استقلال اور زندگی کرنے کی خو کہاں سے آئے؟ نیا شاعر جدّت کی ترنگ میں ماسوا

سے الگ ہونا چاہتا ہے۔ اس کی فکر اسے گمراہ کرتی ہے۔ قدیم شاعر
عرفانِ ذات کو عرفانِ کائنات سمجھتا تھا۔ نیا شاعر عرفانِ ذات کی ہی
پیچیدگیوں میں گم ہے''

مقالہ نگار کی جدید شاعری پر بھرپور نگاہ ہے۔ اس نے اپنی باتیں بڑی ذمّے داری کے ساتھ پیش کی ہیں۔ بیسویں صدی کی چھٹی اور ساتویں بالخصوص چھٹی دہائی میں جدیدیت نے فیشن کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس میں سنجیدگی کم اور بے راہ روی زیادہ تھی۔ اس کا کوئی واضح مقصد بھی نہیں تھا۔ الفاظ کا غلط اور بے محل استعمال کھلے طور پر کیا جا رہا تھا، مقالہ نگار نے ان تمام کمزوریوں پر انگشت نمائی کی ہے۔ قدامت سے رشتہ توڑنا، روایت سے بغاوت کا چکر اور ہر طرح کی بندشوں سے آزادی جدید شاعری کے دامن پر داغ کی حیثیت رکھتی ہے۔ مقالہ نگار نے نئی شاعری کے مشاہیر کی غزلوں کے اشعار پیش کرتے ہوئے بڑا سخت تبصرہ کیا ہے اور اردو غزل کی تاریخ میں اسے آبروریزی سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا الزام ہے کہ جدید شعرا الفاظ کی بازی گری میں اس طرح منہمک رہتے ہیں کہ انھیں سوچنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ وہ دوسروں کے اسلوب و انداز کی اندھی تقلید کرتے ہیں۔ چند مخصوص الفاظ اور چند نئی تراکیب کو ہی الٹ پھیر کر پیش کیا جاتا ہے۔ یکسانیت اتنی عام ہے کہ کسی کی انفرادیت اجاگر نہیں ہوتی۔ مقالہ نگار طنزیہ لہجے میں کہتا ہے:

''اس انداز کا نیا شاعر ایک نئی مخلوق ہے۔ کہیں اپنی صلیب آپ اٹھائے، کہیں دوپہر کو سورج کا پتہ پوچھتا، کہیں اپنے سایے سے گریزاں، کہیں ہڈیوں کی سرنگوں میں مومی شمع لیے، گپھائیں اسے عزیز، بند کمرے اسے پسند، تنہائیاں اسے مرغوب، یادوں کے پتّے، یادوں کے سمندر، یادوں کے سائبان، یادوں کا ریگستان، یادوں کا بیابان، یادوں کا گلدان، یادوں کا حسین چاند حتّٰی کہ یادوں کے ٹیلی ویژن تک نئی شاعری میں بکھرے پڑے ہیں''

اس سے انکار ممکن نہیں کہ ترقی پسندی کے بعد جدیدیت اردو ادب کی توانا تحریک تھی لیکن اس کی ابتدا میں خوبیاں کم اور خامیاں زیادہ تھیں۔ آگے چل کر انھوں نے خود کو سنبھالا۔ جدید شعرا کے یہاں فکری اعتدال کی بڑی کمی تھی۔ طلحہ رضوی برقؔ نے بڑی ہنرمندی کے ساتھ ان خرابیوں کو اجاگر کرتے ہوئے جدید شعرا کو آئینہ دکھایا ہے۔

''تین نئی نظمیں۔ تجزیاتی مطالعہ'' میں طلحہ صاحب نے تین آزاد نظموں وزیر آغا کی ''یاترا''، شہاب جعفری کی ''معاہدہ'' اور بلراج کومل کی ''جواب'' کا قدرے مختصر لیکن بہترین تجزیہ کیا ہے۔ یہ جائزے کھلے دل و دماغ سے کیے گئے ہیں۔ ذہن کی تازہ کاری اور باریک بینی کی جھلک ہر جگہ دکھائی دیتی ہے۔ نظموں کے مرکزی خیال، مصرعوں کی ساخت، ان کی ترتیب و تعمیر، تجربے کا اضطراب، شاعری کے بنیادی مطالب، علامتوں کی تہہ داری اور لہجے کی معصومیت، یہ تمام چیزیں نگاہ میں رکھی گئی ہیں۔ ان تجزیوں سے ظاہر ہے کہ مقالہ نگار کو موضوع کی تہہ میں اترنے کا ہنر معلوم ہے۔ علامتوں کی ردا چاک کر کے حقیقتوں کی عکاسی میں وہ پوری طرح کامیاب ہے۔

''اردو کی رومانی شاعری اور جوش و فراق'' کے عنوان سے جو مضمون ہے اس کا نصف اول اپنے موضوع سے انصاف نہیں کرتا۔ عنوان کا تقاضا تھا کہ جوشؔ و فراقؔ سے پہلے اردو کی رومانی شاعری پر اجمالی طور سے ہی سہی، بھرپور روشنی ڈالی جاتی لیکن مقالہ نگار نے اس سے بے نیازی برتی ہے۔ جوش و فراق کی رومانی شاعری پر اور زیادہ تفصیل سے بات ہونی چاہیے تھی لیکن یہاں بھی اجمال سے ہی کام لیا گیا ہے لیکن اس اختصار میں بہت سے اہم نکات سامنے آ گئے ہیں۔ اصل رومانیت کے معاملے میں مقالہ نگار نے جوش کو اقبال سے آگے کی چیز بتایا ہے۔ جوش کی رومانیت کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے وہ کہتا ہے:

''جوش لذت پرست ہیں مگر ان کی محبت بیمار نہیں، صحّت مندانہ ہے اور
اس میں ایک وقار، طنطنہ اور کشش ہے۔ جوش نے عشق کو ہمیشہ بہار کے
پس منظر میں دیکھا ہے۔ شراب و شاہد اور پیار و محبت جوش کی عشقیہ شاعری

کے عناصرِ اربعہ ہیں۔ان کا حد سے بڑھا ہوا احساسِ جمال،نسائی حسن اور
حسنِ فطرت میں ہم آہنگی پیدا کرتا ہے''

جوشؔ اور فراقؔ کا موازنہ کرتے ہوئے طلحہ صاحب نے ایک بڑے پتے کی بات یہ کہی ہے کہ تصوراتِ وصال کا وہ گیلا پن جو فراق کے یہاں قدم قدم پر ملتا ہے، جوش کے یہاں نہیں ہے لیکن وہ یہ ضرور تسلیم کرتے ہیں کہ دونوں کے یہاں گوشت اور پوست کی پکار آسمانوں تک پہنچتی ہے اور محبت کے شعلے بہت تیز لپکتے ہیں۔ انسانی جسم کی لہک اور نسائی حسن کی عریاں جمال افروزیاں دونوں کے یہاں ہیں۔

فراق کی رومانیت سے بحث کرتے ہوئے یہ دکھایا گیا ہے کہ ان کے یہاں کیسے غمِ محبت کی چنگاریاں روشن ہیں اور ان کا تخیل جسم و جان کی تشنگی بجھانے کے لیے کس طرح نئے چشموں کی تلاش کرتا ہے۔فراق حسن وعشق کی نفسیاتی گرہیں کھولتے ہیں وہ جس لمسی تصور سے لذّت کشید کرتے ہیں اس میں بقول مقالہ نگار تقدس وطہارت کا شائبہ کم ہے۔مقالہ نگار نے جوش وفراق کی رومانی شاعری کے بنیادی پہلو تو تلاش کر لیے ہیں لیکن اس بیان میں وسعت کی بہت گنجایشیں تھیں۔دونوں کے پورے شعری سرمایے پر نظر ڈال کر اظہار کے نئے زاویے روشن کیے جا سکتے تھے لیکن موجودہ صورت میں مقالہ ایک خاص سطح سے آگے نہیں بڑھ سکا ہے اور قاری کی تشنگی باقی رہ جاتی ہے۔

''اختر اورینوی کا احساسِ جمال'' اس مجموعے کا ایک اہم مضمون ہے۔ابتدا میں حسن و جمال کی تعریف بڑے دلکش انداز میں کی گئی ہے۔ بعد ازاں اختر صاحب کی شخصیت اور ان کی تحریروں میں حسن و جمال کی تجلیوں کی تلاش کی گئی ہے۔بعض مفکرین نے حسن کی جو تعریف کی ہے مثلاً حسن کسی شے کی موزونیت اور اس کے تناسب وآہنگ میں مضمر ہے یا یہ عقل کی نہ سلجھنے والی گتھی ہے، کسی کے یہاں حسن قوّتِ حیات اور کسی کے یہاں قوّتِ خودی ہے لیکن طلحہ صاحب کا کہنا ہے کہ حسن و جمال کا دارومدار نہ تناسب پر اور نہ ہم آہنگی پر بلکہ حسن کے نور پر ہے۔انھوں نے قرآن وحدیث کی مدد سے حسن کا سرچشمہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور بڑے منطقی انداز میں

اسے نظر افروزی وسرور انگیزی کی منزّہ و نامصوّر شے سے تعبیر کیا ہے۔ وہ اسے ذہنی سرور، طمانیتِ قلب کا سرچشمہ، مقصدِ حیات اور اس کی کامیابی وکامرانی کی آخری منزل قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

''یہی حسن جب مجاز کے پردے میں تجلّیاں بکھیرتا ہے اور کوئی صورت اختیار کرتا ہے تو ہم اسے فنی تخلیق سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کے ہنر کو فن سے۔جب حسن (اور) فن میں چولی دامن کا ساتھ ہوا تو حسن کی لطافت و پاکیزگی یقینی طور پر فن میں منتقل ہوئی، تو یہ فن صرف فن نہ رہا بلکہ فنِ لطیف ہو گیا۔ اب ہر وہ فن جس میں لطافت آ گئی فنونِ لطیفہ میں شمار ہوگا''۔

حسن و جمال کی یہ تشریح عالمانہ ہے۔اس سے طلحہ صاحب کے حسنِ مذاق کا اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ان کا احساسِ جمال آئینے کی طرح روشن ہے۔انھوں نے اس کی وضاحت جس سلجھے ہوئے انداز میں کی ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔

فنونِ لطیفہ کی جو پانچ شکلیں ہیں یعنی مصوّری، تعمیر، موسیقی، رقص اور شعر وادب، ان پانچوں میں شعر وادب کو سب سے اہم مقام حاصل ہے۔ مقالہ نگار نے جہاں اختر اورینوی کی شخصیت، ان کے لباس، وضع قطع، رہن سہن، ہنسی مذاق اور رفتار وگفتار میں نفاست وشایستگی کی تلاش کی ہے وہیں اختر صاحب کے مختلف اقوال کو پیش کرتے ہوئے ان کے جمالیاتی شعور کو اجاگر کیا ہے۔حسن و جمال کی اداشناسی، حسن کی صوری، کیفی اور معنوی خوبیاں ہمیشہ اختر صاحب کے احاطۂ نگاہ میں رہتی ہیں۔اس کی تجلیاں ان کے افسانوں، ناول اور تنقید میں دیکھی جا سکتی ہیں۔اختر صاحب کے یہاں احساسِ جمال کی عکاسی کرتے ہوئے طلحہ صاحب نے ایک بڑے پتے کی جو بات کہی ہے وہ انھیں کے لفظوں میں سنیے:

''احساسِ جمال کے ساتھ ذوقِ حسن پیدا کرنا فن کار کے لیے از بس ضروری ہے ورنہ نرا احساسِ جمال ہمیں جو کچھ دے گا وہ فطرت کی

نقالی ہوگی فطرت کا بدل نہیں اور فن فطرت کی نقالی ہرگز نہیں، اس کا
نعم البدل ہے''

طلحہ صاحب اخترؔ صاحب کے جمالیاتی احساس کا تذکرہ کرتے ہوئے صاف صاف لفظوں میں یہ کہتے ہیں کہ وہ اس کے بغیر تخلیقِ فن کر ہی نہیں سکتے۔انھوں نے تقریباً سوا سو الفاظ وتراکیب پر مشتمل اخترؔ صاحب کا ایک ایسا اقتباس پیش کیا ہے جس کی مدد سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حسن و جمال کی رعنائیوں اور نیرنگیوں کا ادراک وہ کہاں کہاں سے اور کیسے کرتے ہیں۔طلحہ صاحب کا یہ کہنا بالکل برحق ہے کہ حسن و جمال کا اتنا وسیع، وقیع، عمیق اور اتنا رچا ہوا احساس وشعور بہت کم فن کاروں کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔

''مراثیِ انیس میں قدرِ مراتب'' آٹھ صفحے کا مضمون ہے۔اس کے ابتدائی تین صفحات تمہیدی ہیں۔اگر یہ حصہ نہ ہوتا اور بات براہِ راست انیس سے ہی شروع کی جاتی تو چنداں مضائقہ نہ تھا۔انیس کے مرثیوں کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

''میر انیس نفسیاتِ انسانی کے بڑے ماہر اور فطرت شناس تھے۔ان کی نگاہ بڑی ہی جزرس تھی۔حقائق پر نگاہ رکھتے ہوئے انھوں نے واقعاتِ کربلا کو ہندوستانی رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی اور یہی مرثیے میں ان کامیابی کی کلید ہے''۔

یہ بات سچ ہے کہ انیس نفسیاتِ انسانی کے ماہر اور فطرت شناس تھے۔اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ جزئیات پر ان کی گہری نگاہ تھی لیکن واقعاتِ کربلا کو ہندوستانی رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کو مرثیے میں ان کا کامیابی کی کلید کہنا درست نہیں ہے۔جس چیز کو طلحہ صاحب انیس کا حسن سمجھتے ہیں دراصل وہی ان کی بڑی کمزوری ہے۔واقعات جس سرزمین سے تعلق رکھتے ہوں اس کی عکاسی اسی پس منظر میں ہونی چاہیے تبھی ان میں حقیقت کا رنگ ابھر سکتا ہے۔انیس کے مرثیوں میں جہاں جہاں لکھنوی انداز نمایاں ہوگیا وہ سرسری نگاہ میں تو بھلا معلوم ہوتا ہے لیکن ذرا غور وفکر سے کام لیا جائے تو اس کی بے اعتباری سامنے آجاتی ہے۔کلیم الدین احمد نے

اس وجہ سے بھی ''میر انیس، ایک مطالعہ'' میں ان پر سخت اعتراضات کیے ہیں۔اس پورے مضمون میں تنقیدی حصہ برائے نام ہے لیکن جو کچھ ہے اسی میں اس موضوع کی روح سمٹ آئی ہے۔یہ سطریں دیکھیے:

''انیس نے فطرتِ انسانی کا بہت قریب سے مطالعہ کیا تھا۔ماؤں کی دل کی دھڑکنیں بہت نزدیک سے سنی تھیں۔بچوں کی ذہنی کیفیات کو ان کے ذہن کے نہاں خانوں میں اترتے دیکھا تھا۔گویا مراثیِ انیس معاشرتی زندگی کا بھی حسین مرقع ہیں۔ماں بیٹے کی باتیں، بھائی بہن کی گفتگو، بچوں کی شوخی، بوڑھوں کی متانت، جوانوں کا جوش واضطرابِ جہاد، آقا کی شفقتیں، خادموں کے آداب، لونڈیوں کی گفتگو، غرض ساری باتیں ان کے یہاں ازروئے صفات اور مقتضائے کردار پر منحصر ہیں............مراثیِ انیس ایک روشن تہذیب کا آئینہ ہیں۔اخلاق و آداب کے بہترین اسباق، اخوت و مساوات، ہمدردی و نیک دلی، شفقت ومحبت، خوشی وغم، صبر وضبط، عزتِ نفس و پاسِ حق جیسے اعلا اقدار کا مخزن، اس نقطۂ نظر سے کسی ادب کی کوئی صنف اردو مراثیِ انیس کا مقابلہ نہیں کرسکتی''۔

گاگر میں ساگر بھرنا اسی کو کہتے ہیں۔ان چند سطور میں مراثیِ انیس کے پھولوں کا عطر کشید کرلیا گیا ہے۔مراثیِ انیس سے مختلف مواقع پر حضرات عونؓ ومحمدؓ، حضرتِ زینبؓ، حضرتِ عباسؓ، حضرتِ شہر بانوؓ، حضرتِ امام حسینؓ اور جناب حرؓ کی گفتگو کی مثالوں سے مقالہ نگار نے اپنے دعوے کی دلیل پیش کردی ہے۔ایسی سیکڑوں مزید مثالیں پیش کی جاسکتی تھیں اور حفظِ مراتب کے نئے گوشوں کو اجاگر کیا جاسکتا تھا لیکن موجودہ مثالیں ہی دعوے کی صداقت کے لیے کافی ہے۔

''غور وفکر'' میں اقبال کے فکر وفن پر دو مضامین ''اقبال کا نظریۂ تعلیم'' اور ''اقبال کی

انسان دوستی'' کے عنوان سے شامل ہیں۔ اقبال روایتی معنوں میں کوئی بڑے ماہرِ تعلیم نہیں تھے لیکن مفکرِ قوم کی حیثیت سے انھوں نے تعلیم کے ان عملی پہلوؤں پر کافی غور وخوض کیا تھا جن پر عمل پیرا ہوکر ان کی قوم انسانیت کے اعلا مدارج پر فائز ہو سکے۔ اقبال کے کلام میں ایسی سیکڑوں مثالیں موجود ہیں جن میں انھوں نے اپنے عہد کے نظامِ تعلیم کو تختۂ مشق بناتے ہوئے اس کی کمزوریوں کو اجاگر کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظر صرف مشرق تک محدود نہیں بلکہ وہ اس مسئلے کو عالمی تناظر میں دیکھنے کے قائل ہیں۔ انھوں نے مکاتب و مدارس کی علمی فضا، طلبہ واساتذہ کی تعلیمی حالت، درس وتدریس کے ماحول اور علمی اداروں کے نصاب پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ طلحہ صاحب نے اپنے مضمون میں تعلیم کے تئیں اقبال کے فکری پہلو کو تو نمایاں کیا ہے لیکن تعلیم کے عملی پہلو سے ان کی خدمات کا سرے سے کوئی تذکرہ ہی نہیں کیا۔ وہ اقبال کے مصرعے ع جوہرِ زندگی ہے عشق، جوہرِ عشق ہے خودی نقل کرتے ہوئے عشق اور خودی کے تعلق سے کہتے ہیں:

> ''ان دونوں کی پرورش، ترتیب وتکمیل دل ودماغ کی حقیقی تعلیم پر منحصر ہے۔ اس لیے تعلیم کے تمام ذرائع کا صحت مند ہونا ضروری ہے کیونکہ تعلیم ہی سے انسان کے اندر پوشیدہ فطری قوّتوں اور خفیہ صلاحیتوں کی صحیح نشو ونما ممکن ہے۔ شخصیت کی نمو، ذہن کی پختگی، فرد و جماعت کے تعلقات اور مجموعی طور پر سوسائٹی کے مختلف رخوں کو اجاگر کرنے کے لیے شخصی وسماجی تعلیم بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ بایں نقطۂ نظر تعلیم سے اقبال کی مراد شخصیت کی اٹھان اور ان فطری صلاحیتوں اور قوّتوں کا صحیح ارتقا ہے جو قدرت کی طرف سے ودیعت کی گئی ہے''۔

طلحہ صاحب نے اقبال کے فکری پیغام کو بھی ان کے نظریۂ تعلیم سے جوڑنے کی کوشش کی ہے مثلاً ۔

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہوجا
خودی کا راز داں ہوجا، خدا کا ترجماں ہوجا

اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

میرے خیال میں اس طرح کے اشعار میں اقبال کے نظریۂ تعلیم کی تلاش بے سود ہے۔ اگر اس پر اصرار کیا جائے تو اقبال کے پورے فکری نظام کا سرا ہی ان کے نظریۂ تعلیم سے ملایا جا سکتا ہے اور یہ کوئی مستحسن بات نہ ہوگی، طلحہ صاحب کا یہ کہنا درست ہے کہ تعلیم کے متعلق اقبال کے عقائد ونظریات بڑی وسعت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اقبال کے اردو اور فارسی اشعار کی مدد سے اس وسعت کی تلاش کی اچھی کوشش کی ہے۔ یہ موضوع وسیع مطالعے کا متقاضی ہے۔ ایک مختصر مضمون میں اس کے تمام پہلوؤں کو سمیٹنا ممکن نہیں۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، طلحہ صاحب نے اپنے مضمون میں اقبال کے فکری پہلو کو ہی مدِ نظر رکھا ہے۔ اقبال نے مختلف اداروں میں اعلا تعلیم کے موضوع پر جو لکچر دیے، صاحب زادہ آفتاب احمد خاں کے نام ایک خط میں اسلامی تعلیمات کے متعلق جو تفصیلات پیش کیں اور امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں لازمی تعلیم کے تعلق سے مسٹر گوکھلے نے جو تجویز پیش کی تھی اور اس کے تعلق سے اسلامیہ کالج میں اقبال کی صدارت میں جو جلسہ ہوا تھا اور اس میں انھوں نے جو اظہارِ خیال کیا تھا، ان تمام باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہی اس موضوع کا حق ادا کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اقبال کی معلّمانہ زندگی کا مطالعہ بھی ناگزیر ہوگا۔ اقبال نے اپنے کلام میں تعلیم کے موضوع پر جتنا لکھا ہے وہ تمام چیزیں طلحہ صاحب کے پیشِ نظر نہیں لیکن انھوں نے جس حد تک اپنے مطالعے کا نچوڑ پیش کیا

ہے وہ بہت حد تک اطمینان بخش ہے۔

''اقبال کی انسان دوستی'' والے مقالے میں طلحہ صاحب نے اقبال کی مذہب پرستی میں ان کی انسان دوستی کی تلاش کی ہے۔ انسان کارخانۂ قدرت کی سب سے عظیم الشان تخلیق ہے۔ اقبال انسان کو ''انسانِ کامل'' کی شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ یہی انسان اور انسانیت کی معراج ہے۔ طلحہ صاحب کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ اقبال کا کلام عظمتِ انسانی کے ترانوں سے لبریز ہے۔ ''پیامِ مشرق'' میں میلادِ آدم کے تحت لکھے گئے تین اشعار ؎

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد　　حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت از خاکِ جہانِ مجبور　　خود گرے خود شکنے خود نگرے پیدا شد
خبرے رفت زگردوں بہ شبستانِ ازل　　حذر اے پیروگیاں پردہ درے پیدا شد

درج کرتے ہوئے ایک ایسا جملہ لکھا ہے جو طلحہ صاحب کی وسیع النظری اور اعلا دماغی کی عمدہ مثال ہے۔ فرماتے ہیں:

''اور یہی انسان مسجودِ ملائک ہو کر اپنے دامن میں دنیائے ممکنات سمیٹے وقت کی نوا بن جاتا ہے''۔

انھوں نے اقبال کے یہاں عظمتِ آدم کی تلاش میں یہ عمدہ بند بھی پیش کیا ہے ؎

آسودہ و سیّارم، ایں طرفہ تماشا بیں　　دربارۂ امروزم کیفیّتِ فردا بیں
پنہاں بہ ضمیرِ من صد عالمِ رعنا بیں　　صد کوکبِ غلطاں بیں، صد گنبدِ خضرا بیں
من کسوتِ انسانم، پیراہنِ یزدانم

طلحہ صاحب کے نزدیک اقبال کے یہاں تخلیقِ انسانی کا مضبوط و مستحکم تصور تعلیماتِ قرآنی کی دین ہے۔ ان کے مطابق:

''(اقبال) کا مزاج اسلامی ہے اور اسلام چونکہ وسعتِ لامکاں کا حامل ہے لہٰذا اقبال کے نظریات و پیغامات میں بھی ایک عالمگیر وسعت پائی جاتی ہے۔ انسان رنگ و نسل اور دین و مذہب کے خواہ کتنے ہی خوانوں

میں منقسم ہو، پیامِ اقبال کی زد سے باہر نہیں''۔

اسی نقطۂ نظر کو نگاہ میں رکھ کر طلحہ صاحب نے اقبال کے جذبۂ انسان دوستی کو سراہا اور ان کے کلام میں حیاتِ آدم کا مکمل افسانہ تلاش کیا ہے۔ ''میلادِ آدم''، ''سجدۂ ملائک''، ''از بہشت بیرون آمدن'' اور ''رجعتِ آدم در حضورِ باری'' میں اقبال نے عظمتِ انسانی کو بیان کرتے ہوئے اس کے سہو و نسیان کی جو پرزور وکالت کی ہے۔ طلحہ صاحب کے بقول وہ ان کی انسان دوستی کا اعلان بن گئی ہے۔ مضمون نگار نے انسان دوستی کی پیچیدگیوں، خود فریبی و خود غرضی، نفرت و کدورت اور انتشار و وحشت پر اقبال کی فکرمندی کا جو اظہار کیا ہے اور اتفاق و اتحاد اور محبت و مروّت کی آفاقی تعلیم میں اس کا جو علاج ڈھونڈا ہے وہ حرف بحرف صداقت پر مبنی ہے۔ انسانوں کے درمیان رنگ و نسل کی تفریق، علاقائیت کی غیر فطری تقسیم اور اس کی بنیاد پر قومیت کو مختلف خانوں میں بانٹنا ذہنی فساد کی بڑی وجہیں ہیں۔ اقبال نے ان سب کے خلاف آواز اٹھائی کیوں کہ یہ تمام چیزیں انسان کے دامن پر بدنما دھبہ ہیں۔ طلحہ صاحب نے کلامِ اقبال کے مطالعے سے ان کی اسلام پرستی میں انسان دوستی کو جو بنیادیں تلاش کی ہیں وہ بہت اہم ہیں اور ان کے مطالعے کو معنیٰ خیز بناتی ہیں۔

''غور و فکر'' میں فارسی ادب سے متعلق تین مضامین شامل ہیں۔ طلحہ رضوی برقؔ فارسی زبان و ادب کے عالم ہیں اور اس زبان سے طبعی مناسبت بھی رکھتے ہیں لہٰذا جب وہ فارسی کے ادبا و شعرا پر لکھتے ہیں تو ان کا قلم اپنی جولانیاں خوب دکھاتا ہے۔ یہاں انھوں نے خسرو کی غزل گوئی، غالب کا فارسی کلام اور فارسی شاعری میں محبوب کے تصور پر خامہ فرسائی کی ہے۔ امیر خسرو نے نو سو سے زیادہ غزلیں کہیں۔ ان تمام غزلوں کو پڑھنا اور پھر ان پر لکھنا خاصا دشوار کام ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ طلحہ صاحب نے خسرو کی کتنی غزلوں کے مطالعے کے بعد یہ مقالہ سپردِ قلم کیا ہے لیکن انھوں نے مختلف مثالوں سے ان کی غزلوں کا جو تجزیہ کیا ہے اس میں خسرو کی غزل گوئی کی تمام تر تو نہیں لیکن بیش تر خصوصیات سمٹ آئی ہیں۔ خسرو دلِ گداختہ رکھتے تھے۔ وہ شاعر کے ساتھ ساتھ صوفیِ باصفا بھی تھے لہٰذا ان کی غزلوں میں وجد و حال کی کرشمہ سازی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

طلحہ صاحب ان کے دائرۂ عمل کے متعلق کہتے ہیں:

''ان کا دائرۂ عمل عشق ہے اور صرف عشق۔ان کی جولانیِ طبع حدودِ عشق سے باہر نہیں جاتی۔ یہی سبب ہے کہ خسرو کی غزلیں ایک طرح کی یکسانیت کا بھی شکار ہیں''۔

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ طلحہ صاحب کی نظر غزلیاتِ خسرو کے کمزور پہلوؤں پر بھی ہے۔انھوں نے عشق کو ایوانِ غزل کا بنیادی پتھر کہا ہے اور عشق کی روشنی میں خسرو کے یہاں اس کی ہزار شیوگی کو پوری طرح نمایاں کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ان کا خیال ہے کہ:

''خسرو کی غزلیں انسانی اخوّت و محبت کے احساس سے لبریز ہیں۔محرومی و شکست، لذتِ کام و دہن ، حیات و موت، رسائی و نارسائی یہ تمام موضوعات عصری و روایتی آہنگ کے ساتھ بے تکلفی و بے باکی سے نظم ہوئے ہیں۔خسرو کا عارفانہ تیور، بے نیازانہ انداز، مضبوط و موثر لب و لہجہ، ان کی داخلی تڑپ اور ظاہری سکون دونوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہے............حقیقتاً فن کاری و دلداری کا اتنا مہذب اور رچا ہوا اسلوب فارسی کے بہت کم شعرا کو حاصل ہے۔ایک اندرونی اضطراب اور سینے میں عشق کے پگھلائے ہوئے لاوے کے ساتھ ضبط و تحمل اور پندار کے اس بے مثل ٹھہراؤ کا نمونہ شاذ ہی ملے گا''۔

اس اقتباس میں غزلیاتِ خسرو کی خصوصیات کا مغز سما گیا ہے۔طلحہ صاحب نے جو دعوا کیا ہے اس کی دلیل بھی پیش کی ہے۔غالبؔ، میرؔ اور سرمدؔ نے خسرو سے کیسے استفادہ کیا ہے اور ان کے چراغ سے اپنا چراغ جلایا ہے اس کی نشاندہی بھی مثالوں سے کی گئی ہے۔یہ مقالہ خسرو کی غزل کا بنیادی خاکہ پیش کرنے میں کامیاب ہے۔

طلحہ صاحب نے جس طرح خسرو کے کلام کا تجزیہ کیا ہے وہی طریقہ غالبؔ کے تعلق

سے بھی اختیار کیا ہے لیکن یہاں اختصار زیادہ ہے۔غالبؔ نے فارسی میں رباعی، غزل، قصیدہ اور مثنوی میں طبع آزمائی کی ہے۔غزلوں اور قصائد میں ان کے جوہر خوب کھلتے ہیں۔ان کی مثنویاں بھی اپنی علاحدہ شان رکھتی ہیں۔اس مقالے میں مقالہ نگار زیادہ گہرائی میں نہیں گیا ہے بلکہ اس نے ایک سرسری جائزے پر ہی اکتفا کیا ہے۔اس کی حیثیت ایک اجمالی تعارف کی ہے لیکن اس اجمال میں بھی بعض جگہوں پر تفصیل کی شان موجود ہے۔اس کے مطالعے سے فارسی کلامِ غالبؔ کی کچھ بنیادی خوبیاں نگاہوں کے سامنے آجاتی ہیں۔

''فارسی شاعری میں محبوب کا تصور'' بے حد تشنہ مضمون ہے اور اپنے موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کرتا۔جب تک فارسی کی عشقیہ شاعری کا پورا منظر نامہ نگاہوں کے سامنے نہ ہو تب تک اس کا حق ادا ہو ہی نہیں سکتا۔غزالی، انوری، بیدل، حافظ، صائب اور غالب کے چند اشعار کی مدد سے محبوب کے تصور کی تکمیل ناممکن ہے۔دیگر شعرا کو چھوڑیے صرف امیر خسروؔ یا حافظ کے کلام میں محبوب کی جو جلوہ گری ہے اس کے تفصیلی بیان کے لیے پچاسوں صفحات درکار ہوں گے۔ یہ مضمون محبوب کے خیال کا ہلکا سا دھندلکا ہے اور بس۔

''غور و فکر'' کے تین مضامین ''نئے ادب کی عظمت''، ''ادب اور احتجاج''، واصفِ شاہِ ہدیٰ۔احمد رضا'' اور چار کتابوں پر تبصروں کو چھوڑ دیجیے تو بھی جتنے مضامین پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے اس سے اس مجموعے کی تنقیدی حیثیت کا ایک اجمالی خاکہ سامنے آگیا ہے۔طلحہ صاحب کا علم حاضر ہے۔قدیم و جدید ادب پر وہ یکساں نظر رکھتے ہیں۔موضوعات و مطالب کی تفہیم میں انھیں مہارتِ تامّہ حاصل ہے۔ادب کے سمندر کا غوّاص ہونا سہل نہیں۔طلحہ صاحب غوّاصی میں کامل ہیں۔وہ جو کچھ کہتے ہیں قطعیت کے ساتھ کہتے ہیں۔وہ لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ان کا لہجہ دوٹوک ہوتا ہے۔ان کے اسلوب پر فارسی کے گہرے اثرات ہیں۔ان کی زبان کہیں کہیں آرایشی اور پرتکلف ہے لیکن آرایشی نثر کے باوجود ان کی باتیں پیچ دار نہیں ہیں اور کہیں ترسیل کے عمل میں رکاوٹ محسوس نہیں ہوتی۔ان کے طرزِ بیان کو ہم بہت حد تک اطمینان بخش تو کہہ سکتے ہیں لیکن اسے تنقید کا معیاری اسلوب نہیں کہا جاسکتا۔مجموعی اعتبار سے ''غور و فکر'' طلحہ رضوی برقؔ

کا قابلِ قدر مجموعہ ہے جس کے ہر صفحے پر غور وفکر کی شعاعیں پھوٹتی نظر آتی ہیں۔ انھوں نے کتاب کے پیش لفظ میں لکھا کہ:

> ''غور وفکر'' کی اشاعت سے اردو ادب میں کوئی اہم اضافہ نہیں ہوگا۔ ہاں! سوچنے سمجھنے کے کچھ نئے امکانات ضرور متوقع ہیں''۔

اگر کوئی مجموعہ قارئین کو سوچنے سمجھنے کے نئے امکانات فراہم کر دے تو یہ اس کے لیے بے حد اہم بات اور اس کی کامیابی کی دلیل ہے۔ یہ مجموعہ اس اعتبار سے اہم ہے اور رہے گا۔

○○○

نقد و سنجش: ایک تبصرہ

پروفیسر اعجاز علی ارشد

زیر نظر مجموعے میں تین مضامین اقبالؔ سے متعلق ہیں۔ بقیہ گیارہ مضامین اردو اور فارسی ادب کی دیگر شخصیات و مسائل پر لکھے گئے ہیں۔

اس مجموعے میں شامل بعض مضامین خالص تحقیقی یا علمی نوعیت کے ہیں اور بعض ایسے ہیں جن میں تحقیق و تنقید دونوں کا جلوہ نظر آتا ہے تاہم ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف کے مزاج کو تنقید کی بہ نسبت تحقیق سے زیادہ لگاؤ ہے۔ مصنف کا نقطۂ نظر اسلامی ہے اور اپنی مختلف آراء کے ثبوت میں اس نے قرآن و احادیث سے بھی مثالیں پیش کی ہیں۔

اقبالؔ سے متعلق مضامین میں ڈاکٹر برقؔ نے اقبالؔ کی شاعری میں انسانِ کامل کا تصور، اقبالؔ اور علامت نگاری اور اقبالؔ اور رباعی جیسے موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ بعض اہم اور چبھتے ہوئے سوالات اٹھائے ہیں۔ کریمائے سعدیؔ پر لکھا گیا ان کا مضمون اسی انداز بیان کی ایک اور کتاب ''رحیم'' کو سامنے لاتا ہے۔ مگر یہ مسئلہ ڈاکٹر برقؔ بھی پوری طرح حل نہ کر سکے ''کریما'' سعدیؔ کی تصنیف ہے یا نہیں۔ عبدالقادر بیدلؔ تلمیذِ غالبؔ شاہ باقر آروی، تلامذۂ وحید الہ آبادی اور سید سلیمان اشرف بہاری سے متعلق ان کے مضامین تحقیقی نوعیت کے ہیں اور محنت سے لکھے گئے ہیں۔ جمیل مظہری، واہی اورش۔ مظفر پوری کے ناول ''کھوٹا سکہ'' سے متعلق مضامین میں مصنف کے تنقیدی شعور کی جھلکیاں ملتی ہیں اور مضامین کی تمہید سے ہماری معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن ''سہیل عظیم آبادی اور سیکولرزم'' کے عنوان سے لکھا گیا مضمون اپنے موضوع کی پوری طرح وضاحت نہیں کر پاتا۔ صرف ''بے جڑ کے پودے'' کو موضوع گفتگو

بنانا اس بات کی دلیل ہے کہ مصنف سہیل صاحب کے مخصوص نظریۂ حیات کو اپنے اخلاقی نقطۂ نظر سے متصادم دیکھ کر اظہارِ خیال پر آمادہ ہوا ہے۔ ورنہ سہیل صاحب کے سیکولرزم سے سہیل صاحب کی قربت شبہ سے بالاتر ہے اور اس کی مثال ان کے بے شمار افسانوں میں بکھری پڑی ہیں۔ مقالہ نگار کو ان سے استفادہ کرنا چاہئے تھا۔

اس کتاب کے بیشتر مقالے ایک مشرقی تناظر رکھتے ہیں اور تحقیق وتنقید کا اچھا معیار پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ کا اندازِ بیان بڑا دلکش اور بلیغ ہے۔ بعض اہم نکات کی طرف انھوں نے توجہ دلائی ہے اور وہ کچھ نئی تحریروں کو منظرِ عام پر لائے ہیں۔

(آج کل، نئی دہلی۔ جون ۱۹۸۶ء)

○○○

''نقد وسنجش'': ایک تبصرہ

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں

''نقد وسنجش'' ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ کی تصنیف ہے جس کا نام ہی اس کے مشتملات کا غماز ہے۔ یہ مصنف کے تنقیدی مقالوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر برقؔ اردو اور فارسی کے اسکالر ہیں اور ادبی مسائل پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کے نظریات بالکل واضح ہیں۔ وہ نہ ترقی پسند ہیں اور نہ جدید یے۔ ان کا نقطۂ نظر اسلامی ہے اور وہ اپنے نظریات کا اظہار بے جھجک کرتے ہیں۔ وہ ہر نئی ادبی تحریک اور رجحان کے ساتھ اپنا ادبی موقف اور فکری چولا نہیں بدلتے۔ ان کے پاس مخصوص افکار ونظریات ہیں جو ان کو شعر وادب کے جائزے میں کسوٹی کا کام دیتے ہیں۔ وہ اسلام کے پیمانۂ خیر وشر اور تعلیمات کو بے کم وکاست تسلیم کرتے ہیں اور ان ہی کی روشنی میں ادب وزندگی کے مسائل اور پھر ادب اور زندگی کے رشتوں کو دیکھتے ہیں۔ وہ اسلامی تعلیمات کے خلاف کچھ بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ خواہ وہ حسن اور جمالیاتی انبساط کے نام پر ہو خواہ نام نہاد حقیقت نگاری کے نام پر خواہ فن کاری یا تفریح کے نام پر، وہ ادب کو انسانی قدروں کے فروغ کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور اقبالؔ کی طرح ایسے ادب کو مضر اور ہلاکت خیز تصور کرتے ہیں جو انسان کو کشمکشِ حیات سے ہٹا کر ہوس ناکی، لذت پرستی، بے عملی اور قنوطیت کا شکار کر دے۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں مندرجہ ذیل مقالے اہم ہیں ''اقبال کی شاعری میں زنِ کامل کا تصور''، ''اقبال اور علامت نگاری''، ''اقبال کی رباعی''، ''ہرج ومرج عروضی''، ''نقیبِ حرکت وعمل: بیدلؔ''، ''جمیل مظہری بہ حیثیت غزل گو''، طنز ومزاح اور واہیؔ''، ''سہیل عظیم آبادی اور

سیکولرزم‘‘،’’کریمائے سعدی‘‘۔

ان کے علاوہ ’’شاہ باقر آروی تلمیذ غالبؔ اور ہنگامہ دل آشوب‘‘ ایک تحقیقی مقالہ ہے۔’’وحیدالٰہ آبادی اوران کے بہاری تلامذہ‘‘ میں وحیدالٰہ آبادی کے بیس بہاری شاگردوں کا تذکرہ ہے۔ یہ مضمون تذکروں کے انداز میں مختلف شاگردانِ وحید کے بارے میں معلومات فراہم کرتا ہے۔بعض شاگردوں کے حالاتِ زندگی اتنے مختصر ہیں کہ ان کی شخصیت اور شاعرانہ حیثیت اجاگر نہیں ہوتی،البتہ اس مقالے کے پہلے حصے میں وحیدالٰہ آبادی کی شخصیت اور شاعری پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔اقبال کی رباعی‘‘ خالص صنفی اور عروضی بحث ہے اور مصنف کی عروض دانی کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔’’سہیل عظیم آبادی اور سیکولرزم‘‘ میں مصنف نے تجزیاتی انداز اختیار کیا ہے اور سہیل صاحب کے ناول ’’بے جڑ کے پودے‘‘اور ان کے خطوط کے حوالے سے ان کے سیکولر نقطۂ نظر کو واضح کرتے ہوئے اس نقطۂ نظر کی کھوکھلی اخلاقی بنیادوں کا پردہ فاش کیا ہے اور اس نظریے کی سمیت اور تباہ کاری کی نشاندہی کی ہے۔’’کریما سعدی‘‘ نیم تحقیقی اور علمی مقالہ ہے جس میں مصنف نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ سعدی شیرازی پر لکھے ہوئے تمام ایرانی علمائے ادب ان کی اس گراں قدر تصنیف کا ذکر نہیں کرتے۔اس سے یہ شک پیدا ہوتا ہے کہ یہ شیخ سعدیؒ کی تصنیف نہیں جب کہ مصنف کے خیال میں یہ سعدیؒ کی ہی تصنیف ہے۔اس سلسلے میں مصنف کی یہ دلیل ہے کہ یہ کتاب ان ہی سے منسوب ہے اور آج تک کوئی دوسرا اس تصنیف کا ذمے دار قرار نہیں دیا گیا ہے۔اسی مقالے میں ڈاکٹر برقؔ نے پر مانند صبر آروی کی تصنیف رحیماؔ کا بھی ذکر کیا ہے اور کریمائے سعدی سے اس کا موازنہ و مقابلہ کرتے ہوئے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ سعدی کی کریما کے اسلوب و انداز اور عنوانات کا رحیماؔ پر کتنا گہرا اثر ہے۔’’ہرج و مرجِ عروضی‘‘ میں ساری بحث کے بعد مصنف نے اپنا نقطۂ نظر ان لفظوں میں پیش کیا ہے:

> ’’وزن و آہنگ سے آزاد کلموں اور جملوں کو شاعری کا نام دینا بڑی بے ادبی ہے‘‘

نثری شاعری اردو میں نئی چیز ہے اس لیے اس کے متعلق اردو کے تنقید نگاروں اور

شاعروں کے درمیان خاصی بحث ہے۔ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ اردو کے تین تنقید نگاروں (کرامت علی کرامت،شمس الرحمٰن فاروقی اور وہاب اشرفی) کی آرا نقل کرنے کے بعد کرامت علی کرامت کے رائے سے اتفاق کرتے ہوئے اس سلسلے میں جس نتیجے پر پہنچے ہیں وہ یہ ہے:

> ’’ہر شعرا اپنے بالکل آغاز سے ہی ہر زبان میں ایک خاص وزن کا پابند ہے اور ہر گز کبھی ناموزوں کلام کو شعر نہیں قرار دیا گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مختلف اقوام و ملل میں اعتبارِ وزن وقت کے ساتھ مختلف اور متفاوت رہا ہے‘‘

سید سلیمان اشرف بہاری پر مصنف کا مضمون سوانحی اور تاثراتی نوعیت کا ہے جس کی شمولیت اس کتاب میں کھٹکتی ہے اس لیے کہ اس مضمون کے علاوہ بقیہ تمام مقالے تنقیدی اور تحقیقی نوعیت کے ہیں۔ایک دوسرے مقالے میں شین مظفر پوری کے ناول ’’کھوٹا سکّہ‘‘ کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔اس ناول کا موازنہ ’’امراؤ جان ادا‘‘ سے کیا گیا ہے۔ناول کے اندر پائے جانے والے نجی عناصر (Autobiographial Elemeub) کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔

مصنف نے پیش گفتار کے عنوان سے جو باتیں کہی ہیں وہ کسی قنوطیت کے شکار ’’ہونے کے سبب نہیں بلکہ حقیقت حال کا اظہار ہے اور ہمارے لیے لمحۂ فکر یہ ہے‘‘۔جدید شاعری تنقید،تحقیق،ناول،افسانہ،ڈراما،رپورتاژ،اخبار وغیرہ میں اگر اردو کے ادب العالیہ کا ٹھہراو بھی نظر آتا تو مقامِ شکر تھا۔

جائے عبرت ہے کہ ہمارا لسانی اور ادبی معیار زوال اور گراوٹ سے مسلسل دوچار ہے۔اردو ہمارے گھروں سے بہ سرعت نکلتی جارہی ہے‘‘۔

(مطبوعہ:ماہنامہ ’’فنکار‘‘ حیدرآباد جلد۵،
شمارہ۷،۸ جولائی اگست ستمبر ۱۹۸۸)

○○○

''نقد و سنجش'' پر ایک نظر

عبدالوہاب قاسمی

سرزمینِ بہار کے اہم ناقدوں میں ایک نام پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ کا بھی ہے۔ 1976ء سے 2014ء تک ان کے تنقیدی مضامین کے کئی مجموعے سامنے آئے۔ ''نقد و سنجش'' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

اس کتاب میں پروفیسر طلحہ رضوی نے اقبال کے لیے تین مضامین مختص کیے ہیں جن میں ''اقبال کی شاعری میں زنِ کامل کا تصور'' ''اقبال اور علامت نگاری'' اور ''اقبال اور رباعی'' جیسے عنوانات شامل ہیں۔

اقبال ایک ایسے خوش نصیب شاعر ہیں جن پر مقالات و مضامین کے علاوہ سیکڑوں تحقیقی و تنقیدی کتابیں معرضِ وجود میں آچکی ہیں۔ ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔ بعض تو کہی ہوئی باتوں کے اعادے پر ہی خود کو محصور رکھتے ہیں اور کچھ ہیں جنھوں نے نئے پہلو تلاش کیے ہیں۔ اقبال نے عورت کا جو تصور پیش کیا اس پر بھی اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس حوالے سے ان کے جو نظریات فارسی اور اردو کلام میں بکھرے پڑے ہیں سبھوں نے ان کی تفہیم اپنے اپنے زاویۂ نظر سے کی ہے۔ پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ نے اپنے پہلے مضمون میں اسی تصور کو محور بنا کر علامہ کے فارسی اور اردو کلام سے ان کے نظریات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

تجدد پسند حلقوں کی جانب سے علامہ اقبال پر یہ اعتراضات ہوتے رہے ہیں کہ علامہ نے عورتوں کو اس کا صحیح مقام دلانے کے بجائے تعصب و تنگ نظری کا رویہ اپنایا ہے۔ مضمون کے

بین السطور سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مبصر نے انھیں اعتراضات کے جواب کی سعی کی ہے۔ ابتدائے مضمون میں مبصر نے مذہبی تناظر میں جو گفتگو کی ہے آگے چل کر اسی تناظر میں علامہ کے نظریات شعری حوالوں سے پیش کیے ہیں اور اس بات پر زور دیا ہے کہ علامہ کے نظریات کی افہام و تفہیم ان کے مذہبی دائرے میں ہی کرنی ہوگی۔ مذہبِ اسلام نے عورتوں کے حوالے سے جن زرّیں اصولوں کی نشاندہی کی ہے علامہ نے انھیں اصولوں کو شعری پیکر میں ڈھالا ہے۔ ماؤں کے قدموں کے نیچے جنت ہے۔ ماں کی آغوش مردِ کامل کی پہلی تعلیم گاہ ہے۔ جس قوم نے عورت کے وقار کو ملحوظ رکھا وہ پائیدار ثابت ہوئی۔ بچوں کی پرورش عورتوں کی تکریم بڑھاتی ہے اور حجابات کی افادیت جیسے پہلوؤں پر مبصر نے شعری حوالوں سے عمدہ مباحث کا اندراج کیا ہے۔

پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ نے علامہ کی علامت نگاری کو بھی ان کے مذہبی معتقدات میں شامل کر کے اپنی فکری تابانی کا احساس دلایا ہے۔ لہٰذا وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ:

> ''اقبال کی علامت نگاری ان کے مذہبی و معاشرتی معتقدات کی گہری چھاپ لیے ہے۔ یہ علامتیں ہمارے شعری ادب کا گنجینۂ لازوال ہیں''
>
> (نقد و سنجش ص:۲۶)

تیسرا مضمون علامہ اقبال کی رباعیات سے متعلق ہے۔ علامہ کی رباعی کا مسئلہ متنازعہ فیہ رہا ہے۔ اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ نے کچھ ایسی تحقیق پیش کی جو بعد کی تحقیق سے باطل ہوگئی ہے۔ مثلاً انھوں نے کہا ہے کہ:

> ''علامہ ڈاکٹر اقبالؒ کے فارسی اور اردو، دونوں کلیات میں ڈھونڈنے سے ایک رباعی بھی نظر نہیں آتی'' (ایضاً ص۳۰)

حالانکہ مذکورہ اقتباس کے ضمن میں علامہ ناوک حمزہ پوری نے ثابت کیا ہے کہ ''بانگِ درا'' میں ایک اردو رباعی اور ''پیام مشرق'' میں ایک فارسی رباعی موجود ہے۔ اسی طرح انھوں نے ڈاکٹر اکبر حیدر کاشمیری کے حوالے سے ایک تیسری رباعی کی بھی نشاندہی کی ہے۔ (تفہیم رباعی ص:۴۵)۔ جب یہ ثابت ہوگیا کہ علامہ اقبال کے ہاں بھی رباعی ملتی ہے تو پھر اس پر حیرت کی کوئی وجہ

نہیں بقول مبصر:

''ان کے خزانۂ شاعری میں ایک بھی دردانہ رباعی نہ دیکھ کر کچھ عجب سا احساس ہوتا ہے'' (نقدوسنجش ص:۳۰)

علامہ ناوک حمزہ پوری نے اقبال کے قطعات کو دوبیتی ماننے سے انکار کیا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ: ''اردو میں دوبیتی عنقا ہے'' مزید آگے لکھتے ہیں کہ: ''دوبیتی فارسی میں وہی چیز ہے جو اردو میں قطعہ ہے'' (تفہیم رباعی ص:۲۱ تا ۲۲)

علامہ ناوک حمزہ پوری کے ان دواقوال سے پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ کے ان دونظریات کا بطلان ہوتا ہے جو اس مضمون کا حصہ ہیں۔ ایک یہ کہ انھوں نے علامہ اقبال کے قطعات کو دوبیتی کہا ہے۔ دوسرا یہ کہ انھوں نے علامہ اقبال کے ''کلیاتِ فارسی'' جسے آقائی احمد سروش ایرانی نے ایران سے شائع کیا ہے۔ مرتب نے اس میں دوبیتی کی وضاحت کی ہے، کو بنیاد بنا کر علامہ اقبال کے قطعات کو دوبیتی کہا ہے۔

مضمون میں مبصر نے یہ خدشہ ظاہر کیا ہے کہ:

''ذہن یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ علامہ رباعی کے اوزان سے واقف نہ تھے''
(نقدوسنجش ص۳۴)

مبصر کے اس خدشے کو بھی علامہ ناوک حمزہ پوری نے یوں دور کر دیا کہ:

''رباعی سے اپنی گہری واقفیت کا اظہار علامہ مرحوم نے ''رباعیاتِ محروم'' کے دیباچے میں بھی کیا ہے۔ جس میں رباعی کے تعلق سے بعض وہ باتیں کہی ہیں جن کا ذکر اب محققین کر رہے ہیں اور انھیں اپنی دریافت سمجھ کر اتراتے پھر رہے ہیں'' (تفہیم رباعی ص:۴۵ تا ۴۶)

اس ضمن میں ایک اور بات محققین کی نظر میں رہی ہے کہ رباعی کے عنوان سے جتنے قطعات شائع ہوئے ہیں وہ سب علامہ اقبال کی موجودگی میں ہوئے ہیں اور تبرّکاً انھیں پلیٹ کو بعد میں استعمال کیا جاتا رہا ہے جس پر آگے چل کر ڈاکٹر جاوید اقبال کے تبصرے نے قولِ فیصل کا

کام کیا۔ مگر ناوک حمزہ پوری کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ رشید حسن خاں نے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی تصنیف ''تصنیفاتِ اقبال کا تحقیقی وتوضیحی مطالعہ'' سے ایک اقتباس نقل کر کے پلیٹ والی بات کو مبالغہ قرار دیا ہے۔

ہم نے یہاں ناوک حمزہ پوری کے اقوال سے اس لیے استدلال کیا ہے کہ ان کی بات میں زیادہ وزن اور علمی وسعت ہے۔ لہٰذا ہم نتیجے کے طور پر کہہ سکتے ہیں کہ علامہ اقبال کے ہاں رباعی کا وجود ہے گرچہ تین ہی سہی۔ علامہ رباعی کے اوزان سے بخوبی واقف تھے۔ ان کے تیئں پلیٹ والی بات محض مبالغہ ہے اور ان کے قطعات کو دوبیتی کہنے کی کوئی وجہ نہیں!!

اس کتاب کا ایک اہم مضمون ''ہرَج ومرَجِ عروضی'' ہے۔ جو نثری شاعری کی مخالفت میں لکھا گیا عالمانہ مضمون ہے۔ زمانۂ قدیم سے لے کر آج تک شاعری کی خصوصیات میں اوزان وبحور کی رعایت، عروض کی پابندی، آہنگ اور قافیہ کے مسلمات شامل رہے ہیں۔ لیکن اٹھارھویں صدی میں فرانس کے کچھ اہلِ قلم نے ان مسلمات کو فرسودہ تصور کیا اور اس بات پر مصر ہوئے کہ یہ پابندیاں افکار وخیالات کی ترسیل میں حارج ہوتی ہیں۔ لہٰذا انھوں نے ان پابندیوں کو ختم کر کے شاعری کی آزاد راہیں اختیار کیں۔ دھیرے دھیرے ان کے اثرات دیگر زبانوں کی شاعری پر بھی مرتب ہوئے اور آزاد شاعری کا چلن عام ہو گیا۔

مختلف دانشوروں کی طرف سے اس کی مخالفت میں آوازیں بھی اٹھیں اور کئی مضامین معرضِ وجود میں آئے۔ پابند شاعری کی حمایت کرنے والوں کے پاس آج تک جو دلائل موجود ہیں وہ بہت قوی اور مضبوط ہیں۔ آزاد شاعری کی حمایت کرنے والے ہمیشہ فکری ترسیل کی تنگ دامانی کو بنیاد بناتے رہے ہیں۔ یہاں سوال قائم ہوتا ہے کہ قدیم زمانے سے لے کر آج تک جن شعرا نے پابندیوں کی رعایت کرتے ہوئے اپنے جذبات کو شعری زبان دی ہے کیا وہ کماحقہٗ اپنی بات پیش کرنے میں عاجز رہے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو پھر ایسی شاعری کے ذخائر اس قدر کیوں جمع ہو گئے؟ اور اگر جواب نفی میں ہے تو پھر نثری یا آزاد شاعری کو رواج دینے کا ماحصل سوائے اس کے اور کیا ہوگا کہ اوزان وبحور پر جتنے شاعروں نے تخلیقات پیش کی ہیں انھیں ضائع

کر دیا جائے۔ سچی بات یہ ہے کہ پابند شاعری کے ایک شعر میں کسی فکر کی ایسی تنظیم ہوتی ہے جو نثری یا آزاد شاعری کے بیسیوں ٹکڑوں میں نہیں ملتی۔

پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ نے اپنی بات انھیں قوی دلائل کی روشنی میں کی جو زمانۂ قدیم سے چلے آ رہے ہیں۔ ''بوطیقا''، ''الشفا''، ''اساس الاقتباس''، ''شعر، غیر شعر اور نثر''، ''جدید شاعری میں وزن و آہنگ کے مسائل''، ''معیار الاشعار''، ''اصولِ نغمہ'' اور ''مجموعۂ اشعار نیا یوشیج'' جیسی کتابوں سے انھوں نے اپنے مدعا کے دلائل دقیقہ سنجی کے ساتھ پیش کیے ہیں اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

''الغرض وزن و آہنگ سے آزاد کلموں اور جملوں کو شاعری کا نام دینا بڑی بے ادبی ہے'' (ص: ۴۶)

''کریما سعدی'' کے عنوان سے لکھے گئے مضمون میں مبصر نے دراصل ایک سوال قائم کرنے کی کوشش کی ہے کہ آخر شیخ سعدی پر تحقیق کرنے والوں نے ''کریما'' کو سعدی کی تصانیف سے الگ کیوں رکھا؟ کیا واقعی یہ ان کی تصنیف نہیں ہے؟ جب کہ دو سو اشعار پر مشتمل اس کتاب کے آخری شعر میں ''ز سعدی'' کا لفظ بھی موجود ہے۔ مبصر نے شیخ سعدی کی دوسری تصنیفات کے طرزِ اسلوب میں اس کتاب کے اسلوب کی مماثلت سے بھی اس پہلو کی نشاندہی کی ہے۔

مبصر کو ''تصانیف سعدی''، مقالاتی دربارۂ زندگی و شعر سعدی''، ''فرہنگ ادبیات فارسی دری'' اور ''قلمرو سعدی'' جیسی تصانیف میں ''کریما'' کا تذکرہ تک نہیں ملا۔ مذکورہ کتابوں کے ان مقامات سے جہاں جہاں بھی سعدی کی تصانیف کا تذکرہ ہوا ہے اقتباسات نقل کر کے اس پہلو کو واضح کیا گیا ہے۔ ہر جگہ مبصر کی حیرانی دیدنی ہے۔ یہ حیرانی اس وقت مزید بڑھ جاتی ہے کہ جب اسے کہن ترین نسخہ میں شیخ سعدی سے منسوب ہزل و خبیثات کا تذکرہ تو مل جاتا ہے مگر ''کریما'' کے حوالے سے ہر طرف سناٹا دکھائی دیتا ہے۔

مبصر نے اپنی طرف سے جواب دینے کی جو کوشش کی ہے اس کی حیثیت محض قیاس آرائی کی ہے جس سے تحقیق کے پہلو تشنہ ہی رہتے ہیں۔ پھر بھی مبصر کی یہ کاوش لائقِ ستایش ہے کہ انھوں نے اس اہم موضوع سے پردہ اٹھایا اور عہدِ قدیم سے ہی ہندستان کے فارسی نصاب کا

اہم حصہ رہنے والی اس کتاب پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے کہ آخر یہ کس کی تصنیف ہے۔

مضمون میں وحدتِ تأثر کو وہاں ٹھیس پہنچتی ہے جب ''کریما'' کے طرز پر لکھی گئی ''رحیما'' کا تقابلی جائزہ پیش کرنے کے لیے تقریباً آٹھ صفحات وقف ہو جاتے ہیں۔ مضمون کا یہ غیر ضروری حصہ ایک نئے عنوان کے ساتھ اہم ہو جاتا جہاں کچھ تفصیلی مباحث کی گنجایش ہوتی۔

اس کتاب میں شعری متون کے مطالعے میں اقبال کے علاوہ باضابطہ طور پر جن کی شاعری مبصر کے زیرِ مطالعہ رہی ہے ان میں جمیل مظہری، رضا نقوی واہی اور حبیب آروی شامل ہیں۔ عبدالقادر بیدل کے حوالے سے ''ورق ورق آئینہ'' کے تجزیے میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ وحید الہ آبادی کے مضمون میں تین مرکزی پہلو ہیں (۱) تخلص کے ساتھ ان کے شاگرد ہونے کی بات (۲) چند اشعار سے ان کی شعری قدر متعین کرنے کی جستجو اور (۳) ان کے شاگردوں کا مختصر تذکرہ۔ اس لیے اس مضمون کو باضابطہ شعری مطالعے میں شمار کرنا مشکل ہے۔ یہی حال ''شاہ باقر آروی...... تلمیذِ غالب'' کے عنوان سے لکھے گئے مضمون کا ہے۔ یہاں باقر کی شاعری کے اختصاص ''قاطع برہان'' پر ہونے والے اعتراضات کے جوابات میں ہی سامنے آتے ہیں۔ جن سے باقر آروی کے شعری قد کی مکمل تعیین نہیں ہو پاتی، کیونکہ شاعری صرف تردیدی جوابات کو شعری پیکر دینے کا نام نہیں۔ یہ زندگی کے تقاضے سے مربوط ہے اور یہ ارتباط شاہ باقر کے یہاں کیسا تھا اس کا اندازہ اس مضمون سے نہیں ہوتا۔

اس مضمون کی اہمیت کا سارا انحصار اس بات پر ہے کہ شاہ باقر آروی غالب کے ایسے شاگرد ہیں جن پر خود غالب کو ناز تھا۔ شاگردی کا یہ سلسلہ مراسلت سے ہی قائم تھا۔ استاد کی عقیدت شاگرد کو محبوب تھی۔ اسی کا اثر تھا کہ جب غالب نے ''قاطع برہان'' شائع کی تو آغا احمد علی احمدؔ نے اس کے رد میں ''مؤید برہان'' لکھی۔ پھر جس معرکے کی بنیاد پڑی اس کو سر کرنے کے لیے شاہ باقر آروی نے میدان ہاتھ میں لیا اور مخالفین کا ترکی بہ ترکی جواب دیا جو اشعار کے پیکر میں ڈھلتے چلے گئے۔ پورے مضمون میں جتنے اشعار نقل کیے گئے ہیں وہ اسی ضمن میں ہیں۔

لے دے کے جمیل مظہری، رضا نقوی واہی، اور حبیب آروی پر لکھے گئے مضامین میں

ہی شاعر کے شعری تلازمات سے مکمل بحث ہوئی ہے۔ ان تینوں مضامین کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مبصر نے مذکورہ شاعروں کی شعری کائنات کا یک رخا مطالعہ کیا ہے۔ زیادہ تر پہلو سمیٹنے میں انھیں ناکامی ہاتھ لگی ہے۔ ان شاعروں نے زندگی اور کائنات کے مطالعے سے کیا کچھ اخذ کیا ہے اس پر پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ کی نظر کم کم گئی ہے۔ شاعر کی فکری کشمکش، شعری انانیت، اور فنی برتری یا اعتماد کے ضمن جس قدر اشعار مضمون کا حصہ ہیں وہی مبصر کے یک رخے مطالعے کو آشکار کرتے ہیں۔ یہ چیزیں تینوں مضامین میں مشترک ہوگئی ہیں۔

علامہ جمیل مظہری کے مضمون میں جو باتیں کہی گئی ہیں کہ وہ اقبال کے خوشہ چیں رہے ہیں مگر انھیں مکمل کامیابی نہیں مل سکی جس سے ان کا اپنا انفرادی آہنگ متاثر ہوا اور ان کی شاعری کا ایک سرا تشکیک سے جا ملتا ہے۔ ان پہلوؤں کی طرف جمیل مظہری کے اکثر ناقدوں نے اشارہ کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس مضمون میں مبصر نے محض مقطع کو پیشِ نظر رکھ کر اپنی بات کہی ہے جن میں زیادہ تر شاعر کا اپنا بیان ہوتا ہے۔ کیونکہ حوالے کے طور پر نقل کیے گئے اکثر اشعار شاعر کے تخلص کے ساتھ موجود ہیں۔

واہی طنز و مزاح کے مردِ میداں تھے۔ یہاں ان کی شعری کائنات کو کھنگالنے کی تھوڑی بہت جستجو ہوئی ہے۔ دس صفحات پر مشتمل اس مضمون کے ابتدائی تین صفحات رسمی گفتگو کے لیے وقف ہیں۔ باقی سات صفحات پر ایک سرسری جائزہ مستحسن کہا جا سکتا ہے کہ یہاں واہیؔ کی شخصیت سے زیادہ ان کے فن کو مطمحِ نظر بنا گیا ہے۔

حبیب آروی کے مضمون میں گرچہ دیگر پہلو بھی زیرِ بحث آئے ہیں جیسے انھوں نے زندگی کے درد کو محسوسات بنا کر پیش کیا، عزم و ہمت کی صدا لگائی اور بے باکانہ اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ صداقت اور خلوص و محبت کی عبارتیں لکھیں مگر یہ گفتگو بھی زیادہ تر شاعر کے ذاتی اوصاف کے بیان کے طور پر سامنے آتی ہے کہ وہ حق گو تھے، قلندرانہ زیست کے مالک تھے، وہ امید کے پیامبر تھے اور خلوص و محبت کے بھکاری تھے۔ اس مضمون میں مبصر نے ایک دعوا کیا ہے کہ:

> ''حبیب نے ادب میں اپنے ماحول، معاشرے اور انسانی قلب و ذہن

> کے اکتشافات پر فنِ لطیف کا ایسا حریری پردہ ڈالا ہے جس سے حقائق کا نور چھن چھن کر دل و نگاہ کی کیف سامانیوں کا مرکز بن گیا ہے''
>
> (ص: ۴۱ تا ۴۲)

مگر حقائق کے اس نور کو چھاننے اور قاری تک پہنچانے میں یہ مضمون ہماری مکمل مدد نہیں کرتا۔ مذکورہ تینوں شاعروں کے فنی لوازمات پر قابلِ قدر گفتگو مضامین کا حصہ ہیں۔ فن کے رچاو اور نبھاو کے حوالے سے مبصر نے انھیں سراہا اور خاصے کی چیز شمار کیا جس میں وہ حق بجانب ہیں۔

کتاب میں سید سلیمان اشرف بہاری پر لکھے گئے مضمون کی حیثیت تذکراتی ہے۔ اسی طرح وحید الٰہ آبادی کے مضمون سے ان کے بہاری تلامذہ کو الگ کر دیا جائے تو ڈیڑھ مضامین سے کچھ کم و بیش کو ہم تذکرہ پر مبنی کہہ سکتے ہیں۔ لہٰذا ان کا جائزہ اسی ضمن میں لیا جانا چاہیے۔

تذکرے کی عموماً تین شقیں ہیں۔ زندگی، شخصیت اور کلام کا تجزیہ۔ طلحہ رضوی برقؔ نے یہاں ان تینوں پہلوؤں کو اپنا محور بنایا ہے۔ وحید الٰہ آبادی کے شاگردوں کے تعارف کے ضمن میں پیدائش اور وفات، شخصیت کی علمی لیاقت، شعری استعداد، فطری خوبی، دستیاب شدہ کلام کی پیش کش کے ساتھ چند جملوں کے تجزیے بھی شامل ہیں۔

تاریخ پیدائش اور وفات کچھ ہی اشخاص کے لکھے گئے ہیں۔ ان میں سید شاہ حبیب الرحمٰن کی تاریخ پیدائش ۱۳۶۹ھ اور تاریخ وفات ۱۳۴۰ھ بتائی ہے۔ یہاں ان کے پیدا ہونے سے ۲۹ سال پہلے ہی وفات پانے کو سہوِ خیال یا سہوِ کتابت ہی کہا جا سکتا ہے (ص: ۱۲۲)

اس قسم کے عجائبات ہمیں اکثر تذکرہ نویسوں کے ہاں دیکھنے کو مل جاتے ہیں جنھیں قاری بے توجہی اور غیر ذمے دارانہ رویہ ہی متصور کرے گا۔

اس ضمن میں ایک اہم بات یہ ہے کہ جتنے لوگوں کا تذکرہ یہاں لکھا گیا ہے۔ وہ سب مبصر کے ہم عصر نہیں رہے۔ ان سے متعلق معلومات کسی دوسرے ذرائع سے حاصل کی گئی ہوں گی۔ مصنف اگر اپنے ماخذات کا ذکر کر دیتے تو تحقیقی اعتبار سے یہ مضمون زیادہ وقیع ہو سکتا تھا۔ اکبر الٰہ آبادی کو صرف اس بنیاد پر کہ وہ بہاری ثابت ہو گئے ہیں لہٰذا وہ بھی مولانا وحید کے بہاری

شاگرد ہیں، اس بات میں تحقیقی نقطۂ نظر سے زیادہ وزن نہیں ہے۔

سید سلیمان اشرف بہاری پر لکھا گیا مضمون ان کے خاندانی پس منظر کے ساتھ ان کی ابتدائی زندگی، تعلیم کے شوق، اساتذہ کے تذکرے، تدریسی خدمات، علی گڑھ کی تقرری، علمی استعداد، شادی اور سفرِ حج وغیرہ کو سامنے لاتا ہے۔

اس مضمون میں ان کے تئیں کچھ ایسے پہلو درج کیے گئے ہیں جن سے اتفاق اس وقت تک ممکن نہیں جب تک دیگر ذرائع سے ان کی تصدیق نہیں ہو جاتی۔ مبصر میں یہ خوبی ضرور ہے کہ وہ اپنی باتوں کو باحوالہ نقل کرتے ہیں مگر حیرت ہے کہ اتنے اہم پہلوؤں کو انھوں نے بغیر حوالے کے یہاں نقل کر دیا ہے۔ انھیں سنی سنائی باتوں پر ہی محمول کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب کے سلسلے سے لکھا گیا ہے کہ:

> ''سید صاحب نے اپنی افتادِ طبع کے تحت تین شرطیں پیش کیں۔ پہلی یہ کہ وہ دورانِ تعلیم ہر ماہ ایک بار اپنی والدہ ماجدہ سے ملنے بہار شریف جایا کریں گے۔ دوسری یہ کہ وہ جو کتاب پڑھنا چاہیں گے وہی پڑھیں گے اور تیسری یہ کہ وہ جس وقت پڑھنا چاہیں گے اسی وقت پڑھیں گے۔ مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب نے سید صاحب کی لیاقتِ طبع دیکھ کر تینوں شرطیں منظور کر لیں'' (ص:۱۵۶ تا ۱۵۷)

اس اقتباس سے یہی تاثر قائم ہوتا ہے کہ ایک شاگرد اپنے استاد پر تحکمانہ انداز اختیار کرتے ہوئے اپنی بات منوانے کا قائل ہے جو اس مقدس رشتے میں ہمیشہ نامعقول متصور کیا گیا ہے۔ لہٰذا ان شرائط سے سید سلیمان اشرف بہاری کی عظمت کا نہیں ان کی انانیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ بات بغیر حوالے کے ہے اس لیے اعتبار کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ جبکہ سید سلیمان ندویؒ کا جو اقتباس مبصر نے نوٹ کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سید سلیمان اشرف کو اپنے اساتذہ سے والہانہ عقیدت تھی۔

دوسرا پہلو مولانا حسین احمد مدنیؒ کے ضمن میں یہ ہے کہ:

> ''مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے سید صاحب کو پہلے ہی مطلع کر دیا تھا کہ مولانا حسین احمد مدنی سلام و قیام کے قائل نہیں ہیں۔ لہٰذا مولانا سید سلیمان اشرف نے دورانِ تقریر اسی مسئلہ پر بڑی وضاحت سے مدلل روشنی ڈالی اور ایسی علمی بحث فرمائی کہ قیام کے وقت صلوٰۃ و سلام کے لیے اٹھنے والوں میں سب سے پہلے مولانا حسین احمد مدنی ہی اٹھے'' (ص:۱۵۹)

اس اقتباس میں سب سے پہلے تو سید سلیمان اشرف کی ایک ایسے مسئلے پر لاعلمی کا اظہار ہوتا ہے جو اہلِ دیوبند کے حوالے سے جگ ظاہر تھا۔ جب واقعی مولانا حسین احمد مدنی نے صلوٰۃ و سلام پڑھا تو یہ ایک تاریخی صداقت ہوئی آخر یہ صداقت کہاں درج ہے جو مبصر کے ہاتھ آئی اور وہ حوالہ دینے سے رہ گئے۔

تیسرا پہلو مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے علمِ لدنّی کے حوالے سے ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ڈاکٹر سر ضیاء الدین کسی ریاضی کے مسئلے کے حل کے لیے جرمنی جانے والے تھے۔ انھیں سید سلیمان اشرف نے کہا کہ آپ بریلی تشریف لے جائیں وہاں فاضل بریلوی آپ کے مسئلے کی وضاحت کر دیں گے۔ چنانچہ وہ تشریف لائے اور فاضلِ بریلوی نے اس مسئلے کی وضاحت فرمائی۔ ڈاکٹر ضیاء الدین متحیر ہوئے اور کہا کہ:

> میں سنا کرتا تھا کہ علم لدنی بھی کوئی چیز ہے۔ آج آنکھوں سے دیکھ لیا'' (ص:۱۶۳)

نہ یہاں اس اہم مسئلے کی وضاحت ہے کہ وہ کون سا مسئلہ تھا اور اس گول مول بات کی وضاحت کے لیے نہ کسی کتاب کا حوالہ موجود ہے۔ اس قسم کے واقعات نقل کرتے ہوئے مبصر کی بے احتیاطی کے پہلو روشن ہوتے ہیں۔ تینوں اقتباس میں محض خوش عقیدگی سے کام لیا گیا ہے، اسی لیے اس کا تاثر قاری تک پہنچنے کے بجائے مبصر ہی تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

نثری اصناف کے حوالے سے کتاب میں دو مضامین درج ہیں جن میں سہیل عظیم

آبادی کے ناول ''بے جڑ کے پودے'' اور ڈاکٹر خورشید الاسلام کے ناول ''کھوٹا سکہ'' کو تجزیے کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔

سہیل عظیم آبادی کے ناول پر لکھا گیا مضمون ہمیں تین مختلف پہلوؤں کی طرف لے جاتا ہے۔ سہیل عظیم آبادی کی سیکولر ذہنیت، ان کے مذہبی نظریات اور آخر میں مذکورہ ناول پر بحث۔ کسی ایک پہلو پر بھی سیر حاصل اور منضبط گفتگو نہیں ہو پائی ہے۔ ہاں اشارے ضرور ہوئے ہیں۔ اس لیے اس مضمون کو ان کے ناول کا مکمل تجزیہ کہنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

''کھوٹا سکہ'' پر لکھا گیا مضمون تجزیاتی ضرور ہے۔ مگر یہاں بھی ناول کی فنی خوبیوں کے مکمل اعتراف کے بجائے پورے ناول کے قصے کو اپنی زبان میں بیان کردینے پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔ ساڑھے دس صفحات کے اس مضمون میں تقریباً ساڑھے پانچ صفحات قصے کی تشریح پر مبنی ہیں۔ کچھ روشنی کرداروں کے تفاعل پر ڈالی گئی ہے۔ اسی طرح ناول میں کھینچے گئے خاکے، مکالمے اور زبان پر بھی تھوڑی بہت گفتگو ہوئی ہے۔ اس مضمون سے قصے کی تفہیم تو ہو جاتی ہے مگر ناول کے فنی لوازمات پورے طور پر واضح نہیں ہو پاتے ہیں۔ ویسے بھی اردو تنقید ناول اور افسانے کے حوالے سے اب تک طفلِ مکتب ہی سمجھی جا رہی ہے۔ ان حالات میں ۱۹۸۲ء سے قبل کی یہ تحریر اپنے پس منظر میں اچھی کوشش کہی جا سکتی ہے۔

''نقد و سنجش'' کے مجموعی مطالعے کے بعد پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ کی تنقید نگاری کا جو خاکہ ابھرتا ہے وہ یہی ہے کہ ان کے ہاں تحلیل و تجزیہ اور متن کے تمام یا اکثر پہلوؤں کا احاطہ نہیں ہو پایا ہے۔ سرسری گزرنے پر ان کا انحصار زیادہ ہے۔ ''نقد و سنجش'' ۱۹۸۲ء ''ورق ورق آئینہ'' ۲۰۱۴ء تک کے تنقیدی سفر میں ان کے ہاں کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں ہوئی ہے۔ متن سے جھوجھنے اور زیادہ سے زیادہ غوطے لگانے کی خو ان کے ہاں کم ملتی ہے۔ طلحہ رضوی برق کی علمی گہرائی اور ادبی گیرائی کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ قاری اس کتاب سے جس بھرپور تنقیدی اور تحقیقی تجزیے کی امید رکھتا ہے وہ مکمل طور پر پوری نہیں ہوتی۔

○○○

''ارزشِ ادب'' ایک مطالعہ

ڈاکٹر قطب الدین اشرف

اسلوب فکر اور اپنے منفرد مزاج کے اعتبار سے اردو کے مایہ ناز ارباب قلم میں طلحہ رضوی برقؔ کا شمار ہوتا ہے۔ بحیثیتِ استاد اور ماہر شعر و ادب انھوں نے کئی نسلوں کی تربیت، پرورش اور ادبی شعور کی آبیاری فیاضی کے ساتھ کی ہے۔ اردو سے ان کی عقیدت و وابستگی قولی (قولی) ہنگامی یا وقتی مصلحت و مفاد کی بنا پر نہیں، خداداد ہے۔ ادب کے فروغ وصحت مند ادب کی تخلیق کے لیے ان کی بے پناہ و بے لوث کاوشیں مختلف نہج و جہت سے ان کی شخصیت کو گراں قدر اور لائقِ احترام بناتی ہیں۔

''ارزشِ ادب'' ان کی ساتویں تصنیف ہے۔ ''پیشین'' کو چھوڑ کر کل بیس عدد تنقیدی و تبصرہ جاتی مضامین ۱۹۸ر صفحات پر مشتمل اہم ترین ادبی دستاویز ہے۔ بہار اردو اکادمی کے مالی تعاون سے ۱۹۹۵ء میں ''ادارۂ اصحاب قلم'' پٹنہ سے طبع ہوئی۔ عرفیؔ کے ایک شعر سے برقؔ صاحب نے اپنے چھوٹے ابّا، سراجؔ داناپوری کے نام معنون کیا ہے۔ صفحہ ۱۹۹ اور ۲۰۰ پر موصوف کے علمی و ادبی کارناموں و مطبوعہ کتابوں کی فہرست ہے۔ قطعۂ تاریخ طباعت چھے مصروں میں ہے جن سے ہجری سن اشاعت ۱۴۱۶ھ برآمد ہوتا ہے۔

''حرف پیشین'' کتاب کا تعارف بھی ہے اور اردو کی زبوں حالی کا مرثیہ بھی۔ اردو کی گرتی مقبولیت اور دن بہ دن کم سے کم تر ہوتے قاری و طالب علموں کا سبب یہ دریافت کیا کہ اردو داں طبقے اور طالب علموں نے عربی و فارسی سے رشتہ توڑ لیا ہے ''آمدن نامہ'' ''گلستاں بوستاں''

وغیرہ کا پاٹھ کرنا ترک کر دیا ہے اس لیے یہ نوبت آ گئی۔ موصوف رقم طراز ہیں:

''اردو زبان و ادب کے زوال کا ایک بڑا سبب فارسی زبان و ادب سے بے توجہی، بے اعتنائی (بے اعتنائی) بے التفاتی اور لا پروائی ہے اردو اور فارسی کا رشتہ چولی دامن کا نہیں 'گوشت و پوست کا ہے'' (ارزشِ ادب ص ۸)

موصوف یہیں نہیں رکتے صفحہ ۶۱ پر راہیؔ قریشی کی کتاب ''عکس کی ہجرت'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آج اردو فن کاروں کا بڑا المیہ یہ ہے کہ ان کا رشتہ عربی و فارسی سے بے حد کمزور بلکہ ٹوٹ سا گیا ہے۔ جس نے فارسی نہ پڑھی ہو وہ اچھی اردو کیا لکھ سکے گا'' (ایضاً ص ۶۱)

برقؔ صاحب اردو زبان کے لسانی ارتقا اور اس کی پیدائش وغیرہ مرحلوں سے ضرور واقف ہوں گے، لیکن شاید وہ ابھی تک یہی سمجھ رہے ہیں کہ اردو دو زبانوں اور تہذیبوں کے اتحاد و ارتباط سے وجود میں آئی اور لازمی طور پر وہ دو زبانیں فارسی، عربی اور ہند میں بولی جانے والی علاقائی بولیاں یا ہندی اسلامی تہذیبیں ہیں۔ جب کہ یہ سارے نظریات اب فرسودہ، باطل اور قیاس آرائیوں پر مبنی ثابت ہوئے۔ اردو خالص ہند آریائی زبان ہے۔ فارسی و عربی یا دوسری بولیوں کی حیثیت اردو کی پیدائش میں خارجی معاون کی ہے نہ کہ بنیادی محرک کی۔ ''رانی کیتکی کی کہانی'' اور ''سریلی بانسری'' جیسے بہت سارے لسانی تجربے اس دعوے کو قوی تر کرتے ہیں کہ اردو کا اپنا انفرادی وجود اور ہندوی ڈھانچہ ہے جو کسی کی مشاطگی کا محتاج نہیں۔ کسی بھی زبان کی پیدائش کا جو ایک فطری ضابطہ یا عمل ہے وہی اردو کی پیدائش کا ضامن ہے۔ یہی سبب ہے کہ بغیر کسی بیرونی سہارے اور رحم و کرم کے اردو اپنے دم خم پر زندہ رہ سکتی ہے بلکہ بہترین ادب بھی پیش کر سکتی ہے۔ اردو کے زوال کا سبب وہ نہیں جو برقؔ صاحب بتاتے ہیں بلکہ اس کا سبب ان جیسے ہمالہ پیکر لوگ ہیں جو سہل، سادہ، عام فہم اردو لکھ ہی نہیں سکتے یا پھر وہ لوگ جو آسمان اور زمین دونوں

کو سوئی کی نوک پر آن واحد میں ٹانگ دیتے ادق، اجنبی، غیر مانوس الفاظ، علامتی و تجریدی پیرائے ایجاد کرتے اور نومشق طالب علموں کو اردو سے بیزار، بدظن اور گمراہ کرنے کا سامان کرتے ہیں اور یہ گمان بھی رکھتے ہیں کہ انھوں نے اردو کی ترقی میں کارہائے نمایاں انجام دیا۔ کیا یہ سچ نہیں کہ اردو آئی سی اور سر پڑی اپنے وجود، اپنی زندگی کی جنگ لڑ رہی ہے؟ کیا آج اردو کی ارتقا کی باتیں فضول اور بکواس نہیں لگتیں؟ اردو کی بقا اور حوصلہ افزائی کی باتیں کیجیے یہ اردو کے لیے زیادہ سودمند اور اس کی صحت کے لیے ضروری ہے نہ کہ یہ باتیں:

''فارسی پڑھے بغیر صحیح اردو زبان نہیں آ سکتی'' (ایضاً ص ۸)

کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بحال اردو کے نام نہاد اہل کاروں نے خود اردو کا گلا گھونٹ دیا وہ تو خیر منائیے اہلِ مدرسہ کی جنھوں نے مدرسہ کے خیراتی تیلوں سے اردو کی شمع حیات روشن رکھی ہے۔ اردو زبان کی پہلی معلوم شعری تصنیف ''مثنوی کدم راو پدم راؤ'' جو ۱۴۳۵ـ۱۴۲۱ عیسوی کے درمیانی عرصے میں فخر دینؔ نظامی نے لکھی، فارسی و دیگر زبانوں کے اثرات کے ضمن میں ڈاکٹر جمیل جالبی رقم طراز ہیں:

'' 'کدم راو پدم راؤ' میں فارسی و عربی کے اثرات لہجہ میں، اسلوب میں، ذخیرۂ الفاظ میں آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ اس مثنوی میں تقریباً بارہ ہزار الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ان میں صرف سوا سو کے قریب الفاظ عربی و فارسی کے ہیں ان میں بھی بہت سے الفاظ بگڑی ہوئی شکل میں آئے ہیں'' (مثنوی کدم راؤ پدم راؤ' فخر دین نظامی۔ مرتبہ: ڈاکٹر جمیل جالبی۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۷۹ء ص ۳۶)

ایسے میں اردو سے فارسی کا رشتہ گوشت پوست کا کہاں ثابت ہوا؟ یوں بھی اس موضوع پر برق صاحب کی تحریروں اور فرمودات میں تضاد بھی ہے۔ ایک طرف وہ غالبؔ کی بے خودی و سرمستی ''کچھ اور وسعت چاہیے مری بیاں کے لیے'' کو اساس بناتے ہیں جب کہ اردو کے پاس نہ ذخیرۂ الفاظ کی کمی ہے اور نہ وسعت بیان و پیرایۂ اظہار کی۔ اردو کا دامن کل بھی اتنا ہی وسیع تھا آج اور

زیادہ بے کنار اور لامتناہی ہے۔ برق صاحب کا اعتراف ملاحظہ ہو:

''عصر حاضر میں علامہ آرزو لکھنوی نے ''سریلی بانسری'' کی شعری تصنیف سے یہ ثابت کر دیا کہ بغیر عربی و فارسی الفاظ کے بھی اردو زبان کا محل اسی شان و شکوہ سے کھڑا رہ سکتا ہے۔ ''سریلی بانسری'' کے سیکڑوں غزلیہ اشعار میں سوا لفظ ....آرزو جو شاعر کا تخلص ہے ایک لفظ بھی بدیسی نہیں'' (ارزشِ ادب ص ۱۹۳)

برق صاحب نے ''ارزشِ ادب'' کے مضامین کو بہ اعتبارِ زمانہ چھے حصوں میں بانٹ رکھا ہے۔ اولین دور سے اقبالؔ تک کے چند شعرا کو پہلے حصے میں جگہ دی ہے۔ دوسرے میں نظم گو و غزل گو شعرا ڈاکٹر راہیؔ قریشی، صدیق مجیبیؔ، نازش سسرامی اور قوس حمزہ پوری کی شعری و فکری رسائیوں پر معلوماتی و تاثراتی انداز اپنایا۔ موصوف کی مسجّع اور مرصّع عبارتیں ان نامور شخصیتوں کے شایانِ شان ہیں اور جچتی بھی ہیں۔ تیسرے حصے میں فن رباعی، دوبیتی اور دو رباعی گو شعرا وحیدؔ اشرف اور ناوک حمزہ پوری کی رباعیوں پر موصوف کا انداز اچھے معیار کا ہے۔ چوتھا حصہ انھوں نے تحقیق و تنقید کے رشتے اور اصلاحِ سخن کی ضرورت و ماہیت کے لیے مخصوص کر رکھا ہے۔ اصلاحِ سخن و دیگر موضوع پر ان کے مطالعے کی وسعت اور ادبی ذوق مقالوں کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔ آخری حصہ عبدالمالک آروی اور قومی یکجہتی وار دو ادب کے تعلق سے ہے۔ اس طرح کل بیس مضامین کا ایک گلدستہ برق صاحب نے ارزش ادب کے نام سے ترتیب دیا ہے۔

''دیوان ولی'' ارزش ادب کا اولین نقش ہے۔ ولیؔ کے شعری افکار اور ان کے کلام کی تاریخی و فنی قدر و قیمت پر ان کی تحریریں تحقیقی کم، ذائقہ دار زیادہ لگتی ہیں۔ ہمیں تسلیم ہے کہ ولی کا دیوان اردو کا بیش بہا سرمایہ ہے اور بہت حد تک اردو غزلوں کی اساس کا درجہ رکھتا ہے لیکن ولیؔ اردو کا پہلا باضابطہ صاحب دیوان شاعر ہے یا نہیں؟ یہ امر متنازعہ ہے۔ موزونیت، معاملہ بندی، واقعہ نگاری اور مضمون آفرینی مشترکہ طور پر ولیؔ کی شاعری کے دونوں ادوار میں ان کا امتیاز بن کر پائی جاتی ہیں۔ برقؔ صاحب کے مطابق ولیؔ کی پیدائش ۱۶۶۸ء میں اور تقریباً ۷۶ سال کی عمر میں

۱۷۴۴ء پیری کے آغاز میں دلّی آئے۔ (ارزشِ ادب ص ۱۱-۱۲) ولی کے کلام میں یوں دو آبۂ گنگ و جمن کی کھڑی بولی اور دکنی ماحول و معاشرت کے اثرات نمایاں ہیں۔ تیسرا رنگ ولیؔ کا جو ان کی پائیدار شہرت کا باعث بنا وہ ان کا عارفانہ اور متصوّفانہ انداز تھا۔ دیوان ولی کی مختلف اشاعتوں کا چرچہ کرتے ہوئے موصوف نے اردو اکادمی یوپی کے زیر اہتمام شایع شدہ نسخہ کو سب سے معتبر اور مستند قرار دیا ہے۔ دیوان اور کلیات کی تشریح میں رقم طراز ہیں:

''کسی شاعر کے دیوان کی تعریف یہ ہے کہ اس میں الف تا ی ردیف وار غزلیں جمع ہوں۔ تکمیل دیوان کے بعد اس میں دیگر اصناف سخن مثلاً قطعات و رباعیات، مستزاد، مخمسات یا فردیات و متفرقات اور قصائد و مثنویات بھی شامل کر دی جاتی ہیں۔ اس طرح دیوان گویا کلیات کی صورت اختیار کر لیتا ہے'' (ارزشِ ادب ص ۱۰)

برق صاحب کے متذکرہ بیان میں حشو و زوائد سے قطع نظر انھوں نے یہ بتانے کی زحمت نہ کی کہ ولیؔ کا کون سا دیوان ان کے مطالعے میں رہا۔ وہ نورالحسن ہاشمی والے نسخے کے معیار تدوین و ترتیب کے معترف ہیں مگر ولیؔ کے اشعار درج کرتے کوئی حوالہ نہیں دیتے۔ گریسن کے ترتیب یافتہ دیوان ولی ۱۸۳۳ء میں پیرس (فرانس) میں چھپا۔ پھر مطبع حیدری ممبئ سے ۱۸۷۳ء بعد ازاں مطبع نول کشور لکھنؤ سے ۱۸۷۸ء شایع ہونے کی اطلاع دیتے ہیں اور یہ بھی کہ ۱۹۲۷ء تک جتنے بھی دیوان ولیؔ کے شائع ہوئے وہ اغلاط سے خالی نہیں تھے۔ ایسا مترشح ہوتا ہے کہ مختلف کتابوں سے فراہم کردہ معلومات کو ایک ترتیب کے ساتھ جمع کر دیا ہے ورنہ اس قدر بے پناہ موضوع کو 9x6 کے ساڑھے چار ورق میں سمیٹ دینا موضوع کے ساتھ ناانصافی ہے۔ غرض یہ کہ ولی سے متعلق ان کا مضمون اپنی بہترین انشا کے باوجود تحقیقی اعتبار سے کمزور اور سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہے ان کے بہت سے دعوے متنازعہ اور کھوکھلے ہیں۔

ارزش ادب میں قصیدہ نگاری پر واحد تحریر منشی عبدالغنی بنارسی سے متعلق ہے۔ جو بقول موصوف ہندستان میں مصحفیؔ اور فارسی میں انوریؔ سلسلے کے بڑے عروضی قصیدہ گو تھے۔ 'دیوان غنیؔ'

۱۹۷۵ء تک تشنۂ طبع تھا اس لیے برق صاحب کے پیش نظر حضرت غنیؔ کے چار قصیدے تھے جن کا انھوں نے جائزہ لے کر غنی بنارسی کا تعارف کرایا اور ان کا شعری رتبہ طے کیا۔ حضرت محسن کاکوروی سے غنی بنارسی کا سرسری موازنہ بہت خوب ہے۔ غنی بنارسی کے چوتھے قصیدہ کی زمین محسن کاکوری کے قصیدۂ لامیہ کی زمین پر ہے۔ مگر بقول ان کے غنی بنارسی کی فکری پرواز محسن کاکوری کی اڑان سے آگے نہیں جاتی۔ ہوسکتا ہے برق صاحب صوبائی عصبیت کی زد میں ہوں۔ یہ بحث وتجزیے کا ایک الگ رخ ہے۔ زیر نظر مضمون میں برق صاحب نے عربی وفارسی اور اردو میں اس صنف کے ارتقائی مراحل، اجزائے ترکیبی، فنی رموز واسرار پر خالص ادبی طرز اپنایا ہے۔ خصوصاً عرفیؔ، شیرازی کی معروف زمین ع

”چہرہ پرداز جہاں رخت کشد چوں بر جمل“

کا ذکر چھیڑا ہے اور یہ انکشاف کیا کہ اس زمین پر اردو کے بے شمار قصیدہ کاروں نے طبع آزمائی کی۔ حضرت غنیؔ بنارسی کا مطلع ملاحظہ ہو۔

کرکے اشنان جو کاشی سے اٹھا بادل
زلف شب گوں سے ٹپکتا ہے ابھی گنگا جل

علامہ محسنؔ کاکوروی کے دو اشعار۔

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
ابر کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل
ڈوبتے جاتے ہیں گنگا میں بنارس والے
نوجوانوں کا سنیچر ہے یہ بڑھوا منگل

سحر لکھنوی کا یہ شعر بھی اس سلسلے کا ہے۔

اے صبا جاکے بنارس سے اڑا لا بادل
چاہیے ہندویۓ سوسن کے لیے گنگا جل

سید غلام حسین قدر بلگرامی نے مطلع یوں کہا۔

باغ پر آج گھٹا ٹوپ اٹھا ہے بادل
خسروِ بادبہاری کا کھچا دل بادل

(ارزش ادب ص ۳۲۔۳۱)

ہمیں تو غنی بنارسی کے کلام میں جو روانی، برجستگی، معنی آفرینی اور ندرت ہے وہ زیادہ متاثر کرتی ہیں۔ غنی بنارسی کے چند متفرق اشعار پیش ہیں۔

ابر پانی کے دیے جاتا ہے چھینٹے منہ پر
ہے مگر برق تپاں سوزِ دروں سے بیکل
سانس لینے کی جگہ بلبل شیدا کو نہیں
اے صبا ہے جو تجھے دعویٔ رفتار تو چل

غنی بنارسی کے قصائد کا خصوص وامتیاز یہ ہے کہ وہ حمدیہ اور نعتیہ ہیں اور صلہ وستائش کی تمنا سے بے نیاز ہوکر لکھے گئے۔ مدحت رسولؐ کا نرالہ انداز ملاحظہ کریں۔

نور احمد سے یہ خالق نے کہا روز ازل
ایک تو مجھ سے ہے کم اور ہے سب سے افضل
میم معبودِ احد میں جو ملائے کوئی
تب تیرے نام مقدس کا میسر ہو بدل
شہسوار عربی جلوہ گر پشت براق
شب اسرا جو چلے سوئے شہہ عزّ و جل
ہم رکابِ شہہ دین تھا فرشتوں کا ہجوم
ساتھ نوشاہ کے ہوں جیسے براتی پیدل
بار احساں سے جھکی گردن عرش اعلیٰ
نعل نعلین مقدس کی پہن کر ہیکل

(ایضاً ص ۳۵)

غرض غنی بنارسی کے اشعارفنِ شاعری پران کی کامل دسترس کے شاہد ہیں مگر ان کے ساتھ انصاف نہ ہوسکا۔ برق صاحب نے غنی بنارسی کی شاعرانہ خوبیوں کو اجاگر کر کے لائقِ تحسین خدمت انجام دی ہے۔

بہ اعتبار موضوع نثار بھٹی کے نعتیہ کلام کا مجموعہ ''آیات بشریٰ'' کو اسی زمرے میں رکھا جائے۔ نثار بھٹی کی نعتیہ غزلیں، قصیدے اور نظمیں عشق رسولؐ کے زمزموں معمور ہیں۔ حضرت حسّان ابن ثابت کی نعتیہ شاعری کو رسول خدا نے نہ صرف پسند کیا بلکہ ان کے لیے دعا فرمائی۔ فارسی کے شاعر عرفی شیرازی اس صنف کے بارے میں یوں گویا ہیں ؎

عرفی مشتاب ایں رہ نعت است نہ صحرا ست
آہستہ کہ رہ بردم تیغ است قدم را

(ایضاً ص ۴۰)

نعت گوئی بہت نازک اور خطروں سے بھرا راستہ ہے۔ عبد و معبود کے رشتے اور شرعی آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے حضورؐ کی مدحت کا عمل بہت احتیاط، مطالعہ اور وافر علم فقہ کا متقاضی ہے۔ ذرا سی چوک ہوئی تو عافیت برباد۔ حضرت نثار بھٹی بزرگوں کے خاندان کے وہی شاعر تھے۔ محبت رسولؐ، دینداری وراثت میں ملی تھی۔ راہ سلوک وطریقت کے مسافر بھی تھے۔ گویا آپ کی ذات میں وہ سارے اوصاف تھے جو نعت گوئی کو مطلوب ہیں۔ اعلیٰ حضرت رضا بریلوی کے ہم عصر تھے۔ نعتیہ شاعری بلکہ ادب میں محبتِ رسولؐ کے عروج و معراج کا دور تھا۔ ''آیات بشریٰ'' نے بہت شہرت پائی۔ وہ کلام جو اپنے اچھوتے پن وانوکھے پن کی وجہ سے مقبول ہوئے ان میں چند پیش نظر ہیں ؎

ظہور نور احمد باعثِ ایجاد عالم ہے
نبوت کو ملی جس کے قدم سے مسند آرائی
ابھی تھا وسعت آباد جہاں موہوم سا نقطہ
ابھی ارض و سما کی گم تھی ایک قطرے میں پنہائی

ان اشعار کے صوتی آہنگ حفیظ جالندھری کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ برق صاحب کی یہ ایک اور اچھی دریافت ہے۔

اس زمرے کا آخری مضمون اقبال کی فارسی غزل گوئی پر ہے۔ صنف غزل اور اس کے ماخذ کا ذکر کرتے ہوئے برقؔ صاحب رقم طراز ہیں:

''کہا جاتا ہے کہ صنف غزل عربی قصیدوں کے نسیب وتشبیب سے ماخوذ ہے۔ قصیدے کا یہ حصہ عشق وشباب کی باتوں کے لیے مخصوص تھا۔ لہٰذا اس کی ساخت ہیئت اور مزاج کو مدنظر رکھتے ہوئے شعرا نے ایک صنف سخن باضابطہ اس سے اخذ کر لی اور غزل کے نام سے موسوم کیا۔ غزل کی ہیئت، مطلع ومقطع کی قوسین، ردیف وقوافی کا دل نشیں التزام، اس کا مانوس لب ولہجہ، غنائی آہنگ، مترنم بحریں، زبان کی سادگی، بیان کی پرکاری، تازگیٔ تشبیہ، ندرت استعارہ اور ان کی پیدا شدہ دلفریب متحرک تصویریں ے سب مل کر صنف غزل کو قبولیتِ عام کا سامان مہیّا کرتی ہیں''

(ارزشِ ادب ص ۴۷)

غزل گوئی کے مختلف مراحل مثلاً موزونیٔ طبع، وجدان، بحر ووزن پر دسترس کے بعد غزل وجود پاتی ہے۔ برق صاحب کی تحقیق کے مطابق اقبالؔ کی فارسی غزلوں کی تعداد ۱۶۷ اور ان کے علاوہ ۱۳۱ مربوط اور مسلسل غزلیں اور بھی ہیں جن کا مقصد خودی کی ترویج، پیغام رسانی اور روح اسلام کی تبلیغ ہے۔ اقبال اپنے غزلیہ افکار کے ذریعہ انسان کی مادّی وروحانی ارتقا وعظمت کے فروغ پر زور دیتے ہیں۔ خودی اقبالؔ کے لیے خود شعوری کے واسطے سے خدا شناسی کا حربہ ہے۔ انھوں نے رمز، کنایہ اور ایمائی اسلوب کے سہارے رموزِ عشق کی آگہی اپنی غزلوں میں کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے اور اپنی ذات کو عشق کی کائنات میں بدل دیا ہے۔ عقل وعشق کی باہمی آویزش بھی اقبالؔ کی شعری فکر کا عنوان رہی ہے ملاحظہ ہو ؎

نہ شیخ شہر نہ شاعر نہ خرقہ پوش اقبال
فقیر راہ نشیں است و دل غنی دارد
من بندہ آزادم عشق است امام من
عشق است امام من عقل است غلام من
ہردو بہ منزلے رواں ہر دو امیر کارواں
عقل بحیلہ می برد عشق برد کشاں کشاں

مختصر یہ کہ برق صاحب نے اقبال کی فارسی غزلوں میں پنہاں اسرارحیات،تغزل، شعریت کے ساتھ اوصاف شاعری کے اثرانگیز استعمال و برتاؤ کومثالوں سے قارئیں کے حوالے کیاہے۔

دوسرے زمرے میں چار شاعروں ، ڈاکٹر راہیؔ قریشی، صدیق مجیبیؔ ، نازش سہسرامی اورقوس حمزہ پوری کی شعری رسائیات ولفظیات کا مطالعہ ان کی کتابوں کے حوالے سے ہے۔ بقول برقؔ ''یہ ظاہری اورلفظیاتی جائزہ ان کے پروازسخن کا صرف ایک رخ ہے''۔ ڈاکٹر راہی قریشی کی ایک سوانیس غزلوں کا مجموعہ ''عکس کی ہجرت'' پر تبصرہ ان میں موجود تکنیکی زاویوں، فارسی تراکیب اورمخصوص علامتوں کی جستجو ہے۔ان کے اشعار کی قدر و قیمت اوراس لیے بڑھ جاتی ہے کہ ان میں واقعات کربلا اور وہاں کے روح فرسا منظر کی مصوری و عکاسی کی گئی ہے۔لفظِ فرات اہل کربلا و اہل حق کی تشنگی کی علامت بن گیا ہے۔ان کے انداز میں سادگی ، برجستگی کے ساتھ لفظوں کی بہتات ہے جنھیں وہ ایک بازیگر کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ملاحظہ ہو ؎

تشنگی، دھوپ، لہو، دشت، بستم، محرومی
زندگی نام ہے اس کا تو شہادت کیا ہے؟
محبت، وفا، دوستی، سادگی
انھیں مقبروں کی زیارت کرو

محبت، مروت، اخوت، خلوص
یہ ساری چتائیں جلادی گئیں
کربلا، دھوپ، لہو، پیاس، غریب الوطنی
ابر چھا جائے خدایا کہیں سایہ بن کر

(ارزش ادب ص ۶۵)

واقعی برق صاحب نے ڈاکٹر راہی قریشی کے پروازتخیل کے مختلف رخوں کا حسین مرقّع ترتیب دیاہے جوان کے عمیق مطالعہ اور سچی شعرفہمی کا غماز ہے۔

صدیق مجیبیؔ کی نظم نگاری اوران کی شاعرانہ وقائدانہ شخصیت پر برقؔ صاحب نے مدلل علمی گفتگو کی ہے۔ جدیدیت کے نظریے سے پرے مجیبیؔ کی آواز اوران کا انداز مثالی حیثیت کا ہے۔ان کی نظمیں ''صندل کا شجر'' ''دائرے میں چھپا زاویہ'' ''احتساب'' وغیرہ موقر روایت ، تہذیب کی کشیداورعصری حسّیت کا سنگم ہیں ؎

تم نے آئینے پہ کیوں اتنا بھروسہ رکھا
ہم تو پتھر ہی سمجھتے تھے نسب جانتے تھے
بچ گیا سانپ گری شاخ ثمرور کٹ کے
دست گل چیں میں ہنر کیا ہے یہ سب جانتے تھے

برقؔ صاحب نے مجیبی کی شاعرانہ عظمت اوران کی آفاقی سوچ کا مثبت جائزہ لیاہے۔
چند نمائندہ اشعار کی ایک فہرست بھی پیش کی ہے جنھیں وہ اردو شاعری کا ''سرمایۂ ارزش'' سمجھتے ہیں اور بقول موصوف صدیق مجیبی نے ان اشعار کے ذریعہ اپنی انا کو شکست دینے کا کام کیا ؎

کشتیاں ریت پہ بیٹھی ہیں امیدیں باندھے
ایسا لگتا ہے یہ صحرا کبھی دریا ہوگا

نازش سہسرامی کے شعری مجموعہ ''حرف تمنا'' پر تبصرہ اور تاثرات کا انداز واسلوب بھی متذکرہ بالامعنوں سے مختلف نہیں۔نازش کا طرز فغاں، منفرد ادا، سہل ممتنع، محاوروں کا برمحل استعمال

وغیرہ کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔ بقول موصوف:

''نازش رنگ ونور کی قدروں کے نکتہ داں تھے۔ نازش انوار وتجلیات کے شاعر ہیں'' (ارزش ادب ص۸۲)

''ان کے کلام کی لطافت صدائے حق بنی اور پاکیزگیٔ خیال دیدہ ودل کی تابش روح کی آواز عطائے ربانی ہے۔ روح جتنی بالیدہ ہوگی شاعری اسی قدر لطیف'' (ایضاً ص۸۱)

برق صاحب شاعری میں اس بات کے قائل ہیں کہ موقر ومعتبر قدروں کا احترام اور انانیت وشدید انتہا پسندی پر عبور حاصل ہو تو اچھی تخلیق وجود پاتی ہے۔ نازش کے یہاں انا پر گرفت، تزکیۂ نفس اور خود احتسابی، زبان پر دسترس، الفاظ وتراکیب کی لڑیاں شاعری کا زیور بن گئی ہیں۔ ملاحظہ ہوں چند اشعار۔

اور تو حضرت نازش میں کوئی بات نہیں
ہاں مگر ایک طرز فغاں رکھتے ہیں
چلی ہے بات رسم سرفروش کی خدا حافظ
فلک سے بجلیاں مانگے ہے پھر دیوانگی اپنی
خدا کرے دل نازاں کی آبرو رہ جائے
فسانے جاگ رہے ہیں حسیں اشاروں کے
گرگئی نظروں سے ساری کائنات رنگ و بو
حاصل عمر رواں بس ایک نظر بنتی گئی

نازش کی شاعری کی بے پناہ خوبیوں کو کوزے میں مقید کرلیا ہے۔ زبان لچھے دار اور بیان موثر ہے مگر موصوف کا یہ بیان متنازعہ اور عجیب سا لگتا ہے:

''عصر حاضر کی جدید اردو شاعری جس عجز بیان کی حامل ہے اس کا واحد سبب زبان پر ڈھیلی گرفت اور رفارسی سے عدم واقفیت ہے۔ القائے

مضامین اور تنوع تصورات کی ترسیل وابلاغ سے نئی شاعری عاجز ہے''

(ایضاً ۸۷۔۸۶)

جب کہ وہ خود حضرت نازش کو دورِ رواں کا شاعر کہتے ہیں ان کی فارسی تراکیب کو ''عروسِ شاعری کا طلائی زیور'' لولو ومرجان کی دلفریب لڑیاں'' اور عرفانِ بیان کو معراج زبان'' کہتے نہیں تھکتے اور پھر نفی بھی کرتے ہیں کہ ''تنوع تصورات کی ترسیل وابلاغ سے نئی شاعری عاجز ہے'' اس نوع کی تضاد بیانی ''ارزش ادب'' میں کئی جگہ آپ کو ملے گی۔

حضرت قوس حمزہ پوری اردو کے بزرگ شاعر اور ناوک حمزہ پوری کے والد ہیں۔ شیر گھاٹی کا حمزہ پور ادب کا چشمہ رہا ہے۔ قوس حمزہ پوری ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے برق صاحب کی انشاپردازی دیکھیے:

''قوس ایک صوفی صافی اور عارف حقائق انسان تھے۔ انھیں ہستی اپنے فریب میں کبھی نہ لا سکی۔ حلقۂ دام خیال کو انھوں نے بازیچۂ اطفال ہی سمجھا۔ عجز وانکسار کا یہ پیکر ہمیشہ اعلا قدروں کے حصار میں رہا۔ جوہری توانائی کی طرح اس کے قلب مصفّیٰ کی نوری شعائیں شعر وسخن کے فضائے بسیط کو لبریز کرتی رہیں اور یہ دانہ خاک میں مل کر ہی گل وگلزار ہوتا رہا''۔

(ایضاً ۹۱)

اظہار بیان یا اسلوب پوری طرح فنکار کی شخصیت کا عکس اور پرتو ہوتا ہے۔ گویا اس کی ذات پوری طرح اس کے اسلوب میں پنہاں ہوتی ہے۔ حضرت قوس حمزہ پوری ایک جید عالم دین صوفی اور برگزیدہ انسان تھے۔ ان کی غزلوں میں حق رسائی اور فنافی العشق ہوجانے کی آرزو پائی جاتی ہے۔

یہ محویت کا کرشمہ دکھا رہا ہے عشق
کہ جس طرف نظر اٹھتی ہے تو مجسم ہے

قوس کا عارفانہ انداز اور ترسیل وابلاغ کے پیمانے کس قدر دلآویز ہیں ملاحظہ کریں۔

یہ کس پردہ نشیں کی نقرئی آواز تھی یارب
جو بن کر لن ترانی گونجتی رہتی ہے کانوں میں

جو بوجھ کائنات سے ہرگز نہ اٹھ سکا
انساں ہے یہ امانتِ یزداں لیے ہوئے

مقالہ بہت دلچسپ، برقؔ کا اندازِ تفہیم بہت دل نشیں اور کیوں نہ ہو جب ان کا پسندیدہ موضوع بھی ہو۔

مضامین ارزش کے تیسرے زمرے میں تین عدد تحریریں ،ایک رباعی و دوبیتی اور دو......رباعی گو شعرا وحید اشرفؔ اور ناوک حمزہ پوری کے تعلق سے ہیں۔

’’رباعی اور دوبیتی‘‘ کا پس منظر یہ ہے کہ برق صاحب کے ایک دیگر مضمون ’’اقبال اور رباعی‘‘ پر کچھ اعتراضات ناوکؔ حمزہ پوری نے کیے تھے۔ ناوک کے مطابق ’’رباعی کا اولین نام دوبیتی رکھا گیا اولین دوبیتی جو لکھی گئی وہ رباعی کے لیے مخصوص کیے گئے اوران پر لکھی گئی‘‘ (ارزش ادب ص ۹۸)۔ برقؔ نے اسے ان کا ’’سہوفہم‘‘ قرار دیا اوران کے دعووں کی رد میں دلیل دی اور تحقیق سے اپنے موقف کی حمایت میں ثبوت فراہم کیے اور استاد شعرا کے کلام سے مثالیں پیش کیں۔ نتیجہ یہ اخذ کیا کہ کسی کے لکھنے اور کہنے سے ’’فن عروض کے مسلمات‘‘ رد یا تبدیل نہیں کیے جاسکتے۔ ملاحظہ ہوں برقؔ صاحب کے اقوال:

’’جب رباعی کے اوزان کی جمہور عروضیوں نے تعین کردی تو غیر رباعی وزن کے چار مصرعوں کو رباعی کہنا ہٹ دھرمی ہوگی۔ کیونکہ ان کے لیے دوبیتی کا نام مخصوص کردیا گیا ہے‘‘ (ایضاً ص ۱۰۲)

تحقیقی نقطۂ نظر سے یہ مضمون بہت گٹھا ہوا، پر زور دلیلوں وحوالوں کا گوشوارہ ہے۔ کہیں نہ جھول ہے اور نہ معیار سے گرا ہوا انداز۔ برقؔ صاحب اپنی بات منوانے کا ہنر رکھتے ہیں۔

رباعی غزل کی مانند ایک معروف اور مشکل ترین صنف سخن ہے۔اس میں معنی کے دریا کو چار مصرعوں کے کوزے میں بند کردیا جاتا ہے۔ اس میں صرف چار مصرعے مقررہ وزن کے

ہوتے ہیں۔ اس صنف کا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم وزن وہم قافیہ ہوتا ہے۔ چوتھا مصرعہ برجستہ ہوتا ہے۔ شعرا میں دیکھیں تو تقریباً تمام فارسی اور اردو کے شعرا نے اس میں طبع آزمائی کی ہے۔ خیام، سعدی، جامی، ادھر سوداؔ سے لے کر فراقؔ پھر عہد نو کے بیش تر شعرا کی چہیتی رہی ہے۔ اس سلسلے کی ایک کڑی وحید اشرف کچھوچھوی ہیں جنھوں نے لگ بھگ ایک سو بچاس رباعیاں لکھی ہیں جن کے موضوعات رنگا رنگ ہیں۔ ماحول ناسازگاری، حمد ونعت، مذہب واخلاق، اقدار سائنس رومان ہر عنوان پر رباعی کہی اور ڈھنگ کی کہیں ؎

مسجد مندر، گرودوارہ، کلیسا
کرتے ہیں سبھی وہاں خدا کی پوجا
لیکن یہ ہے کیا خدا سے ڈرنے کی دلیل
خود عیش کریں اور پڑوسی بھوکا

شدّاد و سکندر یزید و نمرود
چنگیز و ہلاکو و فرعون و ثمود
سب مٹ گئے دنیا کو دکھا کر طاقت
ہے فاتح دل اب بھی محبت کا سرور

(ایضاً ص ۱۱۴۔۱۱۳)

اس ضمن میں ناوک حمزہ پوری کی کتاب ’’بہارستان رباعیات‘‘ کا تذکرہ ضروری ہے۔ ایجاز واختصار کے ساتھ اپنی آواز وآہنگ سے فنِ رباعی کو نئی سمت دی ہے۔ ناوک کے یہاں اخلاقی ترغیبات اور اقدار حیات کی تبلیغ کا انداز اچھوتا ہے ؎

ہر صبح ہے اک فریب ہر شام فریب
سیسہ، ساغر، بتان گلفام فریب
اے طائر نفس ہوس کے ناخن لے
ہر سمت بچھا ہوا ہے ایک دام فریب

مت روک اسے تا باب اثر جانے دے
آہِ دلِ مظلوم سے ڈر جانے دے
پہنچے گا مکافاتِ عمل کو ظالم
بھرنے دے گھڑا پاپ کا بھر جانے دے

(ایضاً ص۱۲۰۔۱۱۹)

اس پر طرہ برقؔ صاحب کی بجی سنوری زبان، رباعی کی مبادیات اور رباعی شعرا پر ان کے مقالے بہت اچھے اور اعلا پیمانے کے ہیں۔

برقؔ صاحب کے کثرت مطالعہ کی دلیل ہیں ان کے چار مضامین جو تخلیق، تنقید، پابند شاعری اور اصلاح سخن کی ضرورت و ماہیت پر ہیں۔ تخلیق اور تنقید کے رشتے کو کلیم الدین احمد نے زندگی اور سائنس کا رشتہ قرار دیا یعنی دونوں لازم و ملزوم ہیں اے دوسرے کے لیے۔ ازل سے یہ رشتہ قائم ہے۔ دونوں کے اجزائے ترکیبی میں تعابل، تجزیہ، امتیاز اور قدروں کا تعین کا شمار ہوتا ہے۔ اس پر برق صاحب نے آیات قرآنی کی روشنی میں مدلل گفتگو کی ہے اور مذکورہ چاروں کو تخلیق آدم و انسانیت کے چار ارتقائی مراحل سے تعبیر کیا ہے۔ یوں بھی زندگی ہو ادب ہو یا فنون لطیفہ ان کی تخلیق میں ان عناصر میں ''ظہور ترتیب'' عروج و کمال کو پہنچاتا ہے۔ برق صاحب کا انداز افہام و تفہیم عالمانہ ہے جس کے سبب تنقید و تخلیق کے ضابطے، مراحل و مبادیات تک ہماری رسائی ہوتی ہے۔

ایسے ہی ساختیاتی تنقید پر برقؔ صاحب کا انداز ہمیں متوجہ کرتا ہے۔ ملاحظہ کریں:

''تنقید کا عمل کسی فنِ لطیف میں تخلیق سے الگ نہیں۔ تنقید ایک تابع اور زیریں لہر کی طرح فنکار کے تخلیقی شعور کے ساتھ چلتی رہتی ہے''

(ایضاً ص۱۳۱)

تخلیق شعور و وجدان خدا کا عطیہ ہے۔ جدید و قدیم کی خواہ مخواہ کی بحث کو اقبال کی میں ''سوادِ کم نظری'' قرار دیتے ہوئے تنقید کی نو بہ نو شاخوں کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً فلسفیانہ تاریخی، ثقافتی، تاثراتی، کلاسیکی، سماجیاتی اور مارکسی تنقید۔ پھر رقم طراز ہیں:

''انھیں اقسام میں ایک ہیئتی تنقید بھی ہے۔ ہیئت فارم (Form) کو کہتے ہیں اور کسی بھی ہیئت کو فنکار اپنے فنی شعور سے ساخت کرتا ہے۔ بناتا ہے۔ اسی بناوٹ کو ساخت کہتے ہیں۔ ظاہر ہے ساخت فارسی کے مصدر ساختن کا حاصل ہے لہٰذا ہیئتی تنقید ہی دراصل ساختیاتی تنقید ہوئی''

(ایضاً ص۱۳۲)

اب برق صاحب کے ان اقوال میں کتنی صداقت ہے ماہرین ضرور پرکھیں گے۔ میری حد تبصرہ و تعارف تک ہے۔ بقول موصوف ۱۹۶۰ء کے بعد اردو میں اس قبیل کی تنقید کے آثار واضح طور پر ملنے شروع ہوئے۔ شمس الرحمٰن فاروقی، فضیل جعفری، کرامت علی کرامت، عبدالمغنی، اختر اورینوی، حامد کاشمیری نے اس رجحان تنقید کو آگے بڑھایا۔ برق صاحب کا پر اعتماد لہجہ ادبیات پر مضبوط گرفت کا شاہد ہے۔

پابند شاعری اور صحت مند قدریں بھی ان کا شاندار مضمون ہے۔ زندگی ہو یا فن صحت مند قدروں کا مرہون منت ہے۔ ان کا پاس نہیں تو وہ فن، فن نہیں زندگی، زندگی نہیں بے آبروئی ہے۔ نثر ہو یا نظم ضابطوں، قاعدوں اصولوں کی پابندی صحت زبان کا پتہ دیتی ہے۔ برق صاحب نے یہ پیغام اور تاثر دینے کی سعی کی ہے کہ شاعری اگر عروض کی پابند ہے تو وہی اصل شاعری ہے۔ اس سے آزاد و بے بہرہ رہ کر شاعری چیز دیگر بن جاتی ہے۔ شاعری نہیں رہتی۔ برق ادب کی سیکڑوں برساتیں جھیلے ہوئے گھاگ ہیں۔ کئی تحریکیں دیکھی اور جھیلی ہیں۔ موقر قدروں و روایتوں سے ذرا بھی انحراف ان کے نزدیک ایک مذموم فعل ہے۔ وزن آہنگ، موزونیت شاعری کی عصمت ہیں۔ آزاد و معریٰ نظموں کے لیے ان کی برہمی کتنی لطیف ہے ملاحظہ ہو:

''نثری نظم کہنا ویسا ہی ہے جیسے مردانہ عورت، یا زنانہ مرد کہا جائے۔ ظاہر ہے مرد اور عورت کے درمیان کی کوئی تیسری صنف خلق نہیں ہوئی۔ آپ کا دھیان اگر زنخوں کی طرف جاتا ہے تو نثری نظم کو اسی قماش کی چیز سمجھ لیں''

(ایضاً ص۱۳۷)

"آزمودہ قدروں سے صرف نظر کر کے نئے شعری تجربات برات
عاشقاں برشاخ آہو کے مصداق ہیں اور بس" (ایضاً ص۱۳۹)

قصہ مختصر یہ کہ برق صاحب کا بہت شاندار مضمون ہے۔ان کا جو ایک مثبت نظریہ ہے وہ پوری صحت اور توانائی کے ساتھ بین السطور میں کارفرما ہے۔

"اصلاح سخن کی ضرورت" برق صاحب کا نمائندہ مضمون ہے۔ان کے ذریعہ دراصل اچھی قدروں اور روایتوں کی خوشنما بازیافت ہے۔"معجزۂ فن" کی نمود خون جگر کی متقاضی ہے۔ خون جگر "مشق" کاوش پیہم اور ریاض کا اشاریہ ہے۔اس مرحلے سے گذر کر ہی کوئی فن کار اپنے فن پارے کو رتبۂ کمال تک پہنچا سکتا ہے ؎

خشک سیروں تن شاعر میں لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرعۂ تر کی صورت

(ایضاً ص۱۴۰)

ریاض و مشق رہبری واصلاح کے بغیر تشنہ ہے۔استادی وشاگردی کی رسم کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔اساتذہ کی اصلاح اور رہنمائی نے اردو شاعری کا رخ موڑ دیا۔ برق صاحب نے حوالوں اور تاریخی واقعوں سے یہی ثابت کرنے کی مشکور کوشش کی ہے۔ دیگر ادبا کی اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں کا ذکر بھی کیا ہے۔مثلاً شوق سندلوی کی "اصلاح سخن"، علامہ تمنا عمادی کی "ایضاح سخن" کا خصوصی تذکرہ ہے۔غرض اصلاح، مشورہ اور نظرثانی کا عمل رک جائے تو شاعری خودرو پودوں کا جنگل بن جائے۔

نایاب وگم شدہ ادب کی دریافت برق صاحب کا محبوب مشغلہ ہے۔ان کے اسی شوق سے "مثنوی کتھارنگ" از قاضی احمد تاج اور "مثنوی قصۂ سوداماں" تلف ہونے سے بچ گئیں۔ اور مثنوی کی تاریخ ایک قدم آگے بڑھی۔ یہ دونوں مخطوطے خانقاہ دانا پور کے کتب خانے سے نہایت بوسیدہ اور خستہ حالت میں دستیاب ہوئے برق صاحب کے تعارف نے انھیں زندگی دیدی۔ یہ بہت بڑا تحقیقی کام ہے گو یہ معیاری چیزیں نہیں لیکن ان کی قدامت ان کی اہمیت کا

احساس دلاتی ہے۔

آزادی ہند کے بعد اردو مثنویوں میں دانشوری کی تلاش خاصے کی چیز ہے۔ برق صاحب کے اسلوب وانداز نگارش پر قرآنی علوم وحکمت وآیات کا پرتو دیدنی ہے۔ برق صاحب علم، حکمت، فن ادب زندگی کا محرک وسرچشمہ قرآن وحدیث کو مانتے ہیں۔اس کے لیے ان کے پاس منطق اور دلیلیں ہیں۔اردو کی بیشتر مثنویاں فرضی عشقیہ داستانوں پر مبنی ہیں جن میں دانشوری، اسرار حیات، فلسفۂ زندگی اور سائنسی تجربات کو موضوع بنایا گیا۔ایسی مثنویاں کم ہیں۔اس سلسلے میں انھوں نے جمیل مظہری کی مثنوی "آب وسراب" اور ڈاکٹر عبدالحمید شمس کی "حیات وکائنات" اور مولانا عزیز الحق کوثر کی مثنوی "صحیفۂ زندگی" کا نام لیا ہے اور ان میں موجود علم ودانش کے مختلف گوشوں کو اجاگر کیا ہے۔

عبدالمالک آروی کا خاکہ لکھ کر برق نے اردو کے ایک بےلوث اور جاں باز سپاہی کو اپنی عقیدت اور ان کی ادبی خدمت کے اعتراف کا نذرانہ پیش کیا ہے۔عبدالمالک آروی کے ادبی ذوق ودیوانگی، ولادت وخاندانی حالات "ادارۂ طاقِ نسیاں" آبائی وطن وسکونت، تعلیم ملازمت، صحافت، مقالہ نگاری، کتابوں کی تدوین واشاعت غرض ان کی زندگی کے نمائندہ گوشوں و پہلوؤں کی آئینہ داری کا حق ادا کر دیا ہے۔ مجھے بارہا یہ شکایت رہی کہ برق صاحب کی تحریریں فارسی آلود اور عربی مآبی کی زد میں ہیں اس لیے عام قاری کو گراں محسوس ہوتی ہیں۔مگر ان میں جب اعتدال اور توازن رہتا ہے، عربی وفارسی کے ذوق کی کشید لیے ہوئے ہوتی ہیں تو دوآتشہ بن جاتی ہیں اور ہمارے ذوق وظرف کا ذائقہ بدل دیتی ہیں۔آپ کو یقین نہ ہو تو "ارزش ادب" کا آخری مضمون "قومی یکجہتی اور اردو ادب" کو ضرور پڑھ لیں۔آپ قائل ہوجائیں گے۔عنوان کی وسعت پر لکھنے والے کی عبقری شخصیت حاوی ہے۔ ہمارے ملک کی تہذیب وثقافت، زبان، علاقہ، مسلک، مذہب میں تنوع کے باوجود ہم 'ہندستانی' وحدت کے زیر سایہ ہیں۔ ہمارا دین، آئین یہی سکھاتا ہے کہ کسی مذہب پر تنقید گناہ اور احترام میں ثواب کا پہلو ہے۔ ہر شے ذات خداوندی کا مظہر اور اس کے نور کا پرتو ہے۔اس کی ایک ادبی تخلیق "زمین" کے اسرار ورموز یا اس میں پنہاں

راز خدائی تک انسان کی پہنچ نہ ہو سکی تو بھلا مرئی و غیر مرئی ہر شے پر محیط ذات بے کراں تک کوئی کیسے باریاب ہو سکتا ہے؟ اصفیا نے ہر جگہ اس ذات کا جلوہ پایا۔ ''عاشقی میں ہے محویت درکار'' کے مصداق غیروں کے رسوم و رواج میں بھی راحتِ وصل کا گوشہ نکال لیتے تھے۔ قومی یکجہتی کی بنیاد صوفیوں سنتوں، فقیروں کی کٹیا و خانقاہوں سے نکلنے والی رشد و ہدایت کی ضیاؤں نے ڈالی۔ اردو میں قومیت و یکجہتی کے اولیں معمار امیر خسروؔ ہے۔ خسرو اپنے پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیا کے ساتھ ہندوؤں کا تہوار جمنا کنارے مشاہدہ کر رہے تھے کہ خسرو سے برجستہ و فی البدیہہ یہ شعر وادر ہوا ۔

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے
من قبلہ راست کردم بر سمت کج کلاہے

امیر خسرو کی شاعری یکجہتی وطن پرستی، حب الوطنی، اولاد آدم کی عظمت و قدر و قیمت کا بے مثال درس کا درجہ رکھتی ہے۔ تمام مذاہب عالم کی بنیاد اخوت و مساوات، حق و صداقت اور یگانگت و رواداری پر استوار ہے۔ کوئی مذہب نفرت، تفریق، عصبیت کی تعلیم نہیں دیتا۔ برق صاحب نے کتنی بہترین وضاحت کی ہے ملاحظہ ہو:

> ''قومی یکجہتی اس حقیقت سے عبارت ہے کہ ہر مذہب کے ماننے والے ہر خطے کے رہنے والے، ہر تہذیب کے شیدا، ہر فرقے کے اسیر انسانیت اور اس کی آفاقی قدروں کو پہچانیں ان سے محبت کریں اور کسی بھی ایسی تحریک کو پنپنے نہ دیں جو آدمیت و انسانیت کی عظمت کو مجروح کرے''
>
> (ایضاً ص ۱۹۱)

قومی یکجہتی اور اتحاد کی یہ وہی طاقت تھی جس نے جنگ آزادی میں ہتھیار کا کام کیا اور بغیر کسی خوں ریز جنگ کے انگریزوں کا کام تمام ہو گیا۔ بے شمار ادبا، علما و شعرا نے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے۔ ملک محمد جائسی، نظیر اکبر آبادی، اودھ پنچ کے نورتنوں، الہلال، البلاغ کے شمارے کے علاوہ پریم چند، حسرت موہانی، حیات اللہ انصاری، سہیل عظیم آبادی، نذیر بنارسی،

نازش پرتاب گڈھی، اقبال کے علاوہ کثیر تعداد ہے جنھوں نے قومی وحدت اور ایکتا کے تصور کو فروغ دے کر صحت مند معاشرے اور ایک مضبوط ملک بنانے کی سر توڑ کوششیں کیں۔

بہ اعتبار قدر و قیمت، معیار، صحت زبان ''ارزش ادب'' اردو زبان و ادب کی ایک بہترین کتاب ہے۔ کتابت طباعت لاجواب اور اغلاط سے مبرا ہے۔ مضامین و مشمولات بلیغ، وقیع اور معلومات افزا ہیں۔ عربی و فارسی فہمی کی بابت برق صاحب کی انتہا پسندی سے پرے یہی کیا کم ہے کہ اس مرد مجاہد نے ''ملک ادب'' کی سیاحی میں سود و زیاں کی پرواہ کیے بغیر عمر گذار دی۔ مانند کولمبس نادر نسخوں کی کھوج کی اور انھیں تاریخ کا حصہ بنا دیا۔ ان کی شخصیت اور کارنامے درس عبرت اور اچھا کام کرنے کی ترغیب ہیں۔

○○○

”ورق ورق آئینہ“ ایک مطالعہ

عبدالوہاب قاسمی

ادب کے بزرگ اور معتبر قلم کار پروفیسر طلحہ رضوی برق سے ایک دنیا آشنا ہے۔انھوں نے کئی حوالوں سے ادبی دنیا میں اپنے گہرے نقوش ثبت کیے ہیں۔کئی کتابوں کے مصنف،مرتب اورفارسی واردو مقالات ومضامین ان کے رشحاتِ قلم کے آئینہ دار ہیں۔تحقیق،تنقید،شاعری، تبصرے،تقاریظ،تاریخ گوئی،ترجمے،تذکرے اورتصوف جیسے اہم موضوعات ان کی علمی وادبی شخصیت کوسامنے لاتے ہیں۔

”ورق ورق آئینہ“اکیس مضامین پرمشتمل ان کا تنقیدی مجموعہ ہے۔اس کتاب میں مختلف موضوعات پران کے تنقیدی افکار کا اظہار موجود ہے جن میں برسہابرس کے مطالعے کا نچوڑ،کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش،موضوع کے ساتھ عالمانہ گفتگو اور کوئی نہ کوئی گہرا علمی نکتہ قاری کو علمی سیرابی عطا کرتا ہے۔انھوں نے نظم ونثر کے ساتھ اردو اخبارات ومجلّات کوبھی اپنی گفتگو کا محور بنایا ہے۔بعض ایسے موضوعات بھی زیرِ بحث آئے ہیں جن پرتنقیدی نظر سے کم ہی گفتگو کی گئی ہے۔

آج بزرگ قلم کاروں کی اکثریت ایسی ہے جن کے ہاں تقاریظ اورمقدمات کے عنوان سے لکھی گئی زیادہ تر تنقیدیں نیک دعاؤں اور پرُ امید خواہشات سے بوجھل ہوتی جارہی ہیں اور تنقیدی مسلمات پر رسمی گفتگو کا دائرہ وسیع ہوتا جارہا ہے اسی لیے ایسی تحریروں میں منطقی اوراستدلالی پیرایۂ بیان کا فقدان نظر آتا ہے۔مقامِ شکر ہے کہ پروفیسر طلحہ رضوی برق نے پچھتّر سالہ زندگی کے اس پڑاو پر بھی بہت حد تک تنقیدی اصول وضوابط کوملحوظ رکھ کراپنی بات پیش کی ہے۔ہاں یہ ضرور ہے

کہ بعض مضامین تاثراتی نوعیت کے ہیں اور کچھ میں مذہبی شدت کا احساس توانا ہے۔

پروفیسر طلحہ رضوی برق کی تنقید میں تحقیقی زاویے روشن ہیں۔انھوں نے جس ژرف بینی سے متعلقہ کتابوں اور موضوعات کے جائزے لیے ہیں ان میں جگہ جگہ خامیوں کی نشاندہی محققانہ نظر سے کی ہے۔اصل ماخذ تک رسائی حاصل کر کے اپنی تنقید کا وزن ووقار بڑھایا ہے۔اس حوالے سے بعض مضامین اس قدر اہم ہیں کہ مسافرانِ تحقیق ان سے بہت کچھ استفادہ کر سکتے ہیں۔

پروفیسر طلحہ رضوی برق سجادہ نشیں ہونے کے ساتھ تصوف اوراہلِ دل سے خاصے متاثر ہیں۔کتاب کے اکثر مضامین جس تناظر میں سامنے آتے ہیں ان میں زیادہ تر کا تعلق تصوف اوراہلِ دل کے کلام کے جائزے سے ہے۔یہ بات پوشیدہ نہیں کہ تصوف کے اسرار ورموز پر لکھی گئی زیادہ تر کتابیں فارسی زبان سے تعلق رکھتی ہیں۔اسی طرح اہلِ دل کے ملفوظات اوران کی شاعری بھی زیادہ تر فارسی میں ہی ہیں۔پیشِ نظر کتاب کا نصف سے زائد حصہ فارسی سرمایے کے جائزے کے لیے وقف ہے۔جو مبصر کی فارسی دانی کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔پروفیسر طلحہ رضوی برق نے اپنے تنقیدی افکار کی تابانی سے فارسی سرمایے کی تفہیم ایسے وقت میں کی ہے جب اردو آبادی کی اکثریت اس زبان سے اپنا رشتہ منقطع کرتی جارہی ہے۔اس کتاب میں تصوف اورشاعری کے بہت سے نکات اور گوشوں کو فارسی زبان کے سرمایے سے اپنے ذہن کا حصہ بناتے ہوئے ہم مسرت اور طمانیت محسوس کرتے ہیں۔کلاسیکی ادبیات سے یوں بھی ہمارا رابطہ کمزور ہوتا جارہا ہے۔ایسے میں یہ کتاب اپنے مندرجات کی افادیت کا احساس دلاتی ہے۔کتاب کے اکیس مضامین میں دس ایسے ہیں جن کا تعلق فارسی ادبیات کے جائزے سے ہے جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ پروفیسر طلحہ رضوی برق کو فارسی زبان کے ساتھ اس کے ماخذ تک اچھی رسائی ہے۔آج کے تنقیدی مجموعے اس انفرادیت سے عموماً خالی ہوتے ہیں۔ان مضامین کو پڑھتے ہوئے کہیں بھی یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ مبصر نے ایک ایسے وقت میں فارسی کے تئیں اپنی ”ہمہ دانی“ کا رعب طاری کرنے کی کوشش کی ہو جب کہ حالات کے فطری تقاضے کے تحت آج کی نسل فارسی سے کٹتی جارہی ہے۔بلکہ مضامین کا سنجیدہ اورمخلصانہ انداز اس بات کی تائید کرتا ہے کہ آج کی نسل کو فارسی افہام

وتفہیم سے جوڑا جائے کہ وہ اپنے ابتدائی ادبی سرمایے سے آگاہ ہوسکے۔

''نکات الحق......ایک مطالعہ'' ''مناقبِ محمدیہ......ایک مطالعہ'' ''تذکرۃ الکرام (فارسی) کی خصوصیات'' اور ''گشایش نامہ، خواجہ راج کرن کا یستھ'' کے عنوان سے جو مضامین شاملِ کتاب ہیں، ان میں فارسی کی قیمتی کتابوں کے جائزے پیش کیے گیے ہیں۔ جو مربوط اور منظّم انداز میں تنقیدی وتحقیقی گل بوٹوں سے سجائے گئے ہیں۔ مبصر کی دقت نظری، علمی گہرائی اور مطالعے کی وسعت ان مضامین میں متاثر کرتی ہے۔ اختلاف، اتفاق اور استنباط کے زاویے ان چاروں مضامین میں روشن ہیں۔ مبصر نے اصل متن کے ساتھ ترجمہ شدہ کتابوں کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے جس سے جائزے میں جہاں آسانیاں پیدا ہوئی ہیں وہیں بات مدلل ہوگئی ہے۔

''نکات الحق'' شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی تصنیف ہے۔ جس میں تصوف وطریقت کے بیش بہا نکات فارسی زبان میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس کی افادیت کے پیشِ نظر سید حمزہ حسینی دہلوی نے پہلا ترجمہ ''لطائف الحق'' کے نام سے کیا۔ پھر ڈاکٹر محمد عارف الدین شاہ فاروقی قادری ملتانی نے ترجمہ کیا۔ دونوں مترجمین اس بات پر متفق ہیں کہ ''نکات الحق'' ۹۴/نکات کا مجموعہ ہے۔ مگر پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ نے اختلاف کرتے ہوئے ۹۵/نکات کی نشاندہی کی ہے اور اپنی بات اصل نسخے کے ایک اقتباس سے مدلل کی ہے۔ اسی لیے وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''اصل فارسی نسخے میں نکات کی ترتیب ۹۵/نمبر پر ختم ہوتی ہے۔
> اردو مترجم نے اصل نسخے کے نکتہ نمبر ۶۹/کو حذف کردیا اور شمارہ ۹۴/ پر مکمل کیا'' (ورق ورق آئینہ ص:۱۲)

اس مضمون میں نکات کے موضوعات اور اس کی افادیت کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے۔

کچھ اقتباسات اصل نسخے سے نقل کیے گئے ہیں اور شیخ محدث دہلوی کے بیعت وارشاد اور سلسلۂ طریقت کو بھی مبصر نے اپنی گفتگو کا مرکز بنایا ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ ان کا سلسلہ قادریہ تھا۔

''مناقبِ محمدیہ'' یہ کتاب حضرت سیدنا محمدن القادری البغدادی پر لکھی گئی ہے۔ جو اہلِ تصوف وطریقت کی ممتاز شخصیت ہیں۔ نویں اور دسویں صدی ہجری کے اس بزرگ کے ایک خاص

مرید حضرت علی شیر شیرازیؒ نے اپنے پیرو مرشد کے وصال کے چھے سال بعد محض تین شب میں یہ کتاب تحریر فرمائی تھی۔ اس میں چھوٹی بڑی کل چھیالیس منقبتیں فارسی نثر میں لکھی گئی ہیں اور جا بجا پُرکیف اشعار سے ان کی معنویت دوچند ہوگئی ہے۔ یہ اشعار مبصر کی نظر میں ''گنجینۂ معنی کا طلسم خانہ'' ہیں۔ مبصر نے دیگر حوالوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہندستان میں سلسلۂ عالیہ قادریہ کی ترویج واشاعت کی ابتدا حضرت سیدنا محمدن القادری البغدادی سے ہوئی ہے۔ اس حوالے سے انھوں نے ''مطالعہ اسلامیات'' کے مصنف حسن واصف الہ آبادی اور ''تاریخ مشائخ قادریہ'' کے مرتب پروفیسر غلام یحییٰ انجم کی رائے سے اختلاف کیا ہے اور اپنی تائید میں ''سید الہند'' اور ''جادۂ عرفان'' سے ایک ایک اقتباس نقل کیے ہیں۔ تحقیقی نقطۂ نظر سے مبصر نے یہاں اچھی بحث کی ہے، لیکن سلسلۂ قادریہ کے ہندستان میں پہلے مبلغ کے تئیں ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پاتے۔ مبصر نے کسی ایک پہلو کو یقینی بنانے کے بجائے محض اتنا کہہ کر کہ:

> ''بہر طور تحقیق کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہوا ہے۔ یہ تاریخ کا موضوع ہے۔
> یہاں مجھے اس سے بحث نہیں'' (ایضاً ص:۳۲)

اپنی بات اصل کتاب کی طرف موڑ دی ہے۔ حالانکہ یہ موقع تھا کہ کسی ایک پہلو کو اگلی تحقیق تک کے لیے مدلل کر دیا جاتا۔

پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ نے اس کتاب کی منقبتوں کو شیخ کی زندگی کے مدارجِ روحانی اور مقاماتِ عرفانی کا سچا آئینہ قرار دیا ہے اور اس کی زبان کو فارسی ادب العالیہ کی مثال سے تعبیر کیا ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''حضرت سیدنا کی حیات وخدمات، ان کا فقر وفاقہ، ان کے مدارجِ روحانی ومقاماتِ عرفانی سے متعلق اتنی سچی معلومات کا کوئی دوسرا ماخذ موجود نہیں۔ اس کے مؤلف حضرت شیخ علی شیر شیرازی شیخ سعدی کے ہم وطن فارسی نثر ونظم کے یکہ تاز اور مایۂ ناز ہیں۔ مناقبِ محمدیہ کی زبان شیریں فارسی ادب العالیہ کی مثال ہے۔ مؤلف کا ادبی وشعری ذوق ایک

ایک ''مناقب'' سے نمایاں ہے'' (ایضاً ص:۳۲)

مذکورہ اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مبصر نے گہرائی سے کتاب کا مطالعہ کیا ہے۔ مناقب کی نوعیت، مؤلف کی علمی شخصیت اور زبان کی فصاحت تینوں پہلوؤں کو مبصر نے اجمال کی دل کشی کے ساتھ قاری تک پہنچایا ہے۔

''تذکرۃ الکرام (فارسی) کی خصوصیات'' کے عنوان سے جو مضمون شاملِ کتاب ہے وہ تحقیقی انداز میں لکھا گیا تاریخی مضمون ہے۔جس میں حضرت مولانا شاہ محمد ابوالحیاۃ قدس سرہٗ کی فارسی تصنیف ''تذکرۃ الکرام فارسی'' کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب پھلواری شریف کے ۵۱؍مشائخِ صوفیہ کے احوال کے تذکرے پر مشتمل ہے۔

پانچ صفحات پر محیط اس مختصر مضمون میں ''تذکرۃ الکرام'' کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ اس کے مصنف کی بھی جھلکیاں دکھائی گئی ہیں۔مبصر نے اس کتاب کو صوبۂ بہار کے بزرگوں کے فارسی تذکرے میں دوسرا مقام دیا ہے۔ جب کہ اولیت کا سہرا ''مناقب الاصفیا'' مصنف حضرت مخدوم شعیب قدس سرہٗ کے سر باندھا ہے۔مبصر کے مطابق دوسوسال کی اس تصنیف میں کل ۶۷۲؍صفحات ہیں۔ زیادہ تر بزرگوں کے احوال اختصار کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں جب کہ ۲۷۹؍صفحات مصنف کے والد ماجد کے محامد واخلاق اور سلوک وتصرفات کے تذکرے کے لیے وقف ہیں۔اس کتاب میں مستعمل فارسی زبان سہل ودل نشیں ہے اور فارسی ادب کی بہترین مثال کتاب میں موجود ہے۔ القاب وآداب میں ادب واحترام کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ آخرِ کتاب میں اعراسِ خانقاہِ مجیبیہ کے معمولات کی تفصیل درج ہے۔

مضمون کی مذکورہ جزئیات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ نے کس امعانِ نظر سے کتاب کا جائزہ لیا ہے۔بطورِ استدلال کچھ اقتباسات بھی مضمون کا حصہ ہیں۔ اس کتاب کے متعلق انھوں نے کہا ہے کہ:

''تذکرۃ الکرام میں بزرگوں، صوفیوں اور مشائخِ سلسلہ کی حکایات، مشاہدات، کرامات ومکاشفات کا ایک دفتر ہے۔ جسے ثقہ بزرگانِ دین

وعرفاء کاملین کے بیاناتِ صادقہ کی سند حاصل ہے'' (ص:۱۷۳)

مگر حیرت ہے کہ مبصر نے کسی ایک بزرگ کا قول بھی بطورِ استدلال نقل نہیں کیا ہے۔

اس سلسلے کا آخری مضمون ''گشایش نامہ خواجہ راج کرن کایستھ'' ہے۔ ''گشایش نامہ'' آج سے تین سوا کتیس برس پرانی تصنیف ہے۔ جسے ہندی نژاد خواجہ راج کرن کایستھ نے تحریر کی ہے۔ یہ کتاب مطبوعہ نہیں تھی۔ مبصر نے دوسو برس پرانے نقل شدہ قلمی نسخے کے مطالعے سے مضمون کا تانا بانا بنا ہے۔

کتاب کے سالِ تصنیف کے حوالے سے جتنے تاریخی قطعات کہے گئے ہیں مضمون میں ان کے اندراج سے بات شروع ہوئی اور پھر رسالہ کی خصوصیات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس کتاب کی زبان کو مبصر نے سراہا ہے مگر اسلوب وادا کو ''شبنم وشاداب'' (ظہیرالدین ظہیر تفریشی) اور ''مینا بازار'' (ملانورالدین محمد ظہوری ترشیزی) کے اسلوب وادا سے ''متاثر ومستعار'' تسلیم کیا ہے۔ انھوں نے اس مقام پر اپنی بات کو مدلل کرتے ہوئے مذکورہ دونوں کتابوں کا مختصر تعارف بھی پیش کردیا ہے۔ اس تقابل میں انھوں نے جس انداز سے اپنے مدعا کو ثابت کیا ہے وہ خاصہ علمی ہے۔ نتائج کے طور پر انھوں نے لکھا ہے کہ:

''اس طرح مذکورہ دونوں کتابیں یعنی شبنم وشاداب اور مینا بازار گیارھویں صدی کے اواخر تک ضرور منظرِ عام پر آچکی تھیں اور ایسا تھا تو کوئی وجہ نہیں کہ راج کرن جیسا فارسی داں اور علم دوست اس سے واقف نہ رہا ہو۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ گشایش نامہ میں شبنم وشاداب اور مینا بازار کی طرزِ نگارش وانداز وادا کی تقلید نمایاں ہے'' (ص:۱۸۳تا۱۸۴)

مذکورہ اقتباس میں پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ نے اپنی بات کی توثیق کے لیے سالِ اشاعت اور راج کرن کی علمی شخصیت سے جو نتیجہ برآمد کیا ہے وہ بہت معقول ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے طرزِ نگارش کی مماثلت کو اقتباسات کے ذریعے بھی قاری کے روبرو کردیا ہے۔جن سے مبصر کے نتائج کی تائید ہوتی ہے۔ ان تمام باتوں کے بیچ ''گشایش نامہ'' کی انفرادیت کو تسلیم

کرتے ہوئے مبصر نے اس کی اہمیت کو بھی واضح کیا ہے اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ:

''اس کی گوناں گو خوبیوں کی وجہ سے ہم اسے انشاء فارسی کا ایک غریب ونادر نمونہ کہیں گے۔ مصنف چونکہ ہندستانی ہے لہذا اس میں کہیں کہیں ہندی الفاظ بھی سلمیٰ وستارہ کی طرح چمکتے دمکتے نظر آتے ہیں اور ان سے ایک گنگا جمنی حسن پیدا ہوتا ہے'' (ص:۱۸۴)

اس مضمون میں مبصر نے مزید جزئیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کے قصّوں کی خصوصیات، بکثرت استعمال ہونے والے الفاظ، مصنف کی علمی ولسانی لیاقت اور قلمی نسخے کی املائی خامیوں کو بھی اجاگر کیا ہے، جن سے مبصر کی دقتِ نظر کا احساس ہوتا ہے۔

فارسی ادبیات پر لکھے گئے دیگر مضامین میں ''عظیم صوفی شاعر، جلال الدین رومیؔ'' ''ملفوظات نویسی کی روایت'' ''فارسی ادب میں نعتیہ شاعری'' ''امام احمد رضا کی مثنوی: ردامثالیہ'' ''نقیبِ حرکت وزندگی: مرزا عبدالقادر بیدل'' اور ''خسرو کی غزل گوئی'' جیسے عنوانات سے لکھے مضامین کتاب میں شامل ہیں۔

جلال الدین رومیؔ، عبدالقادر بیدل اور امیر خسرو کی شاعری پر بحث کرتے ہوئے ان کے متصوفانہ خیالات کو پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ نے ان کی شعری عبارتوں میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ جستجو تینوں مضامین میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔ ظاہر ہے یہ موضوعات مبصر کے ذہنی میلانات کے آئینہ دار بھی ہیں۔ تینوں مضامین سے بطورِ تائید ایک ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

''دراصل رومی کا تصوف اسلامی تصوف کے ساتھ ساتھ نوافلاطونی اور ہندی تصوف سے بھی متاثر معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ ان کے افکار کی بنیاد ان کے احوال وواردات ہیں۔ رومیؔ کے یہاں کشف والہام کا درجہ بہت بلند ہے۔ وہ بنیادی طور پر صوفی ہیں۔ مفکر یا فلسفی نہیں ہیں۔ لہذا ان کے یہاں کسی باضابطہ نظامِ فکر کی تلاش مناسب نہیں'' (ص:۲۵)

''بیدل ایک صوفیٔ باصفا، ایک شاعرِ خوش نوا، ایک مصلحِ اخلاق، ایک مبلغِ انسانیت اور ایک دانشورِ بے مثال تھے۔ ایک بیدار ذہن مفکر کی حیثیت سے بیدلؔ نے الہیات وخلقتِ کائنات، نظامِ عالم وآویزشِ خیر وشر اور حیاتِ انسانی کے انفرادی واجتماعی پہلوؤں پر غور کیا ہے'' (ص:۷۱)

''سب جانتے ہیں کہ خسروؔ صوفی بھی تھے اور شاعر بھی۔ ان کی عارفانہ حقائق سے آگاہی اور گوناگوں تجربات ومشاہدات نے حقیقت ومجاز کا بڑا ہی دلنشیں امتزاج پیش کیا ہے'' (ص:۹۸)

ان تینوں شاعر پر قلم اٹھانے والا کوئی بھی ناقد اسی وقت کامیاب ہوگا جب وہ تصوف کے اسرار سے آگاہ اور متصوفانہ جذبات کا شناسا ہو۔ پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ نے اس راہ کے جن تجربات کو اپنے ذہن ودل اور زندگی کا حصہ بنایا ان کی روشنی میں تینوں مضامین قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتے ہوئے بھی انفرادی نکات کے غماز ہیں۔ مذکورہ اقتباسات میں غور کریں تو ان کی تنقیدی نظر کی گہرائی کا سرا ہاتھ آتا ہے۔ ''رومی صوفی ہیں مفکر نہیں۔ بیدل صوفی بھی ہیں اور مفکر بھی اور خسرو صوفی ہونے کے ساتھ ساتھ حقیقت ومجاز کا امتزاج پیش کرتے ہیں'' جیسے خیالات کی پیش کش میں ہر مضمون اپنی ایک حیثیت رکھتا ہے۔

تحقیقی انداز میں ملفوظات نویسی کی روایت پر لکھا گیا مضمون کافی اہم ہے۔ آٹھ صفحات میں جس طرح انھوں نے اپنی گفتگو مکمل کی ہے وہ بہت سی تفصیلات کا نچوڑ پیش کر دیتی ہے۔ ابتدائے مضمون میں ملفوظات کے پس منظر کے حوالے سے بہت کارآمد بحث کی گئی ہے۔ اس کی تعریف، اس کے موضوعات اور ابتدائی سلسلے تینوں پہلو یہاں سمیٹے گئے ہیں۔

اس مضمون میں برصغیر ہندستان میں ملفوظات نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے کچھ ملفوظات کے نام، مصنف اور مرتب کے ذکر پر اکتفا کیا ہے اور کچھ ملفوظات کی اندرونی خصوصیات پر بھی بحث کی ہے۔ ایسے تمام ملفوظات شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے ہیں جن کی تعداد نو ہے۔ معتمد اور غیر معتمد دونوں طرح کے ملفوظات کی فہرست سے انھوں نے قاری کے لیے

آسانیاں پیدا کردی ہیں۔

امام احمد رضا کی مثنوی ''ردامثالیہ'' کے تجزیے میں مبصر پر مذہبی شدت کا غلبہ محسوس ہوتا ہے۔ یہ تجزیہ معتدل انداز اور فکری سنجیدگی کے بجائے حد درجہ عقیدت کے بار سے بوجھل ہوگیا ہے۔ حضور ﷺ ہمارے مثل انسان ہیں۔ یہ ایک مذہبی تنازع ہے۔ جس کے متعلق دیوبندیوں اور بریلیوں کے پاس اپنے اپنے نظریات اور دلائل ہیں۔ ان دونوں گروہوں کا یہ ایسا موضوع رہا ہے جس پر بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے مگر پھر بھی یہ تنازع آج تک برقرار ہے۔ لہٰذا اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے حزم و احتیاط کا پہلو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ نہ یہ کہ جذباتیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کسی گروہ کے مذہبی پیشوا پر رکیک حملے کیے جائیں۔ ان سے تھوڑی دیر کے لیے عقیدت کی تشفی تو ہوسکتی ہے مگر باوقار تنقید مجروح ہوتی ہے۔ اس مضمون میں پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ نے تنقید سے زیادہ وہابیت اور ان کے عقیدے پر حملے کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ اس لیے اسے تنقیدی مضمون کہنا تو مشکل ہے اور خالص مذہبی مضمون بھی نہیں کہہ سکتے۔

''فارسی ادب میں نعتیہ شاعری'' کے عنوان سے لکھا گیا مضمون وقیع اور معلومات افزا ہے۔ مبصر نے اپنا ارتکاز نعتیہ تحریک اور رجحانات پر رکھا ہے۔ اس مضمون کا عنوان فارسی ادب کے وقیع سرمایے تک ذہن کو لے جاتا ہے مگر مضمون چند رجحانات کا ہی عکاس ہے۔ اس کا اعتراف خود مبصر کو بھی ہے۔ اچھا ہوتا اگر عنوان بھی اسی قسم کا باندھا جاتا۔ رجحانات تک ذہن کو محدود رکھ کر مضمون کا مطالعہ مایوس نہیں کرتا۔ دو رجحانات کے محور پر پورا مضمون گھومتا ہے۔ بقول مبصر:

> ''نعت گوئی کی تحریک اور مہیج کے اس فرق کو دکھانا چاہوں گا جو ایک طرف تو شعری روایت کے طور پر قصائد اور مثنویوں میں در آیا اور شعراء نے اس میں محض اپنی فنکاری وصنعت و ہنرمندی کے اور دوسری طرف جو عشق کا جذبہ درونِ وارفتگی بن کے شاعر کے قلب و روح پر طاری رہا''
>
> (ایضا:ص ۴۷ تا ۴۸)

چنانچہ پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ نے ان رجحانات کو ثابت کرتے ہوئے قصیدہ گو شاعروں کی نعتوں کو ''تبحرِ علمی کے ظہور اور نمودِ فنکاری'' کا نمونہ قرار دیا ہے۔ ہاں عہدِ سلجوقیہ میں تصوف کے پہلو بہ پہلو جن شعرا نے نعتیہ کلام کہا ان کی نعتوں کو مبصر نے ''ارتعاشِ قلبی وصفاتِ درونی کی غماز'' سے تعبیر کیا ہے۔ جن میں سنائیؔ، عطارؔ اور رومی بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ مضمون میں اشعار کے حوالے سے مبصر نے ان رجحانات کی اچھی نشاندہی کی ہے۔ طوالت کے خوف سے انھوں نے اپنا مضمون گرچہ تشنہ ہی چھوڑا مگر جتنی باتیں یہاں درج ہوگئی ہیں ان سے مضمون کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔

اردو ادبیات پر لکھے گئے مضامین ''تقدیرِ غزل''، ''حضرت آسی غازی پوری کی شاعری''، ''شاہ قتیلؔ داناپوری: ایک منفرد شاعر''، ''ظفر کمالی اور رباعی'' اور ''اردو رباعی گذشتہ بیس سال میں'' جیسے عنوانات شاملِ کتاب ہیں۔

اردو غزل سے متعلق مختلف ناقدوں کے نظریات بہت واضح اور صاف ہیں۔ اس کی مخالفت کرنے والوں میں چند نام ایسے ہیں جنھیں غزل کی حمایت میں آواز اٹھانے والے تقریباً تمام لوگوں نے پیشِ نظر رکھا اور ان کے نظریات کی تردید کی کوشش کی۔ پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ نے بھی ''تقدیرِ غزل'' میں کم وبیش انھیں نظریات کی تردید اور غزل کی حمایت کی ہے۔ پچھلے چند برسوں کے درمیان اس موضوع پر جتنے مضامین سامنے آئے اکثر مضامین میں یکسانیت اور مماثلت نمایاں ہے۔ گرچہ ایسے مضامین میں ضمناً کچھ کارآمد باتیں بھی درج ہوجاتی ہیں، مگر کلیم الدین احمد کے اس ایک جملے ''غزل نیم وحشی صنفِ سخن ہے'' کو فراموش نہیں کیا جاتا۔ مسعود حسن رضوی نے اپنی کتاب ''ہماری شاعری'' میں اس موضوع پر جس علمی اور استدلالی انداز سے گفتگو کی ہے اس کے بعد اس موضوع پر قلم اٹھانا کارِ زیاں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ یہی وجہ ہے کہ پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ کا یہ مضمون اپنا کوئی خاص تاثر دینے میں ناکام رہتا ہے۔

اردو رباعی پر بالترتیب دو مضامین کتاب کی اہمیت میں اضافہ کرتے ہیں۔ ایک مضمون ڈاکٹر ظفر کمالی کی کتاب ''رباعیاتِ ظفر'' پر ہے جسے ہم تنقید سے زیادہ تقریظ نما مضمون کہہ سکتے

ہیں۔ ڈاکٹر ظفر کمالی اپنی رباعی گوئی کے ذریعے ادبی دنیا میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ ''رباعیاں''، ''رباعیاتِ ظفر''، ''چہکاریں''(ادب اطفال) اور''خاکِ جستجو'' کے ذریعے انھوں نے اپنی رباعی کو قاری کے روبرو کیا ہے۔موضوعات کے تنوع کے ساتھ فن کا جو رچاو ان کی رباعی کا حصہ ہے۔انھیں ایک تقریظی مضمون میں سمیٹنے کی گنجائش ذرا کم رہتی ہے۔ پھر بھی پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ نے ان دونوں حوالوں سے اس مضمون میں اپنے خیالات ونظریات کی پیش کش مدلل انداز میں کی ہے۔اوزان کے اثبات کے لیے چند رباعیوں کے سامنے ان کے بحور کا اندراج کیا ہے اور موضوعات پر بھی نگاہ رکھی ہے۔انھوں نے ڈاکٹر ظفر کمالی کو فنی نقطۂ نظر سے مسلم الثبوت رباعی گو تسلیم کیا ہے اور رباعی کے چوبیسوں اوزان کے ہنرمندانہ استعمال کی عمدہ داد دی ہے۔مبصر نے کہیں ان کی رباعیوں کو سنجیدہ اور فکر انگیز کہا ہے کہیں فن کی کرشمہ سازیوں سے تعبیر کیا ہے۔کہیں کلامِ بلاغت نظام کا عنوان دیا ہے۔کہیں حروف والفاظ کے باوقار انتخاب کے تحسین کی ہے، کہیں تازگیٔ مضمون اور تہہ داری وعمقِ معنی کے ایجاز کو شاعری کا اعجاز کہا ہے۔اس مختصر مضمون میں پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ نے ڈاکٹر ظفر کمالی کی رباعی کے تئیں اپنے نظریات کو عمدہ طریقے سے پیش کیا ہے۔

رباعی کے حوالے سے ان کا دوسرا مضمون گذشتہ بیس برسوں کے جائزے پر مبنی ہے۔ ۱۹۹۰ء سے ۲۰۱۰ء کے عرصے میں سامنے آنے والے رباعی گو کی تخلیقات پر یہ جائزہ محیط ہے۔جن شاعروں کا یہاں تعارف ہوا ہے ان میں ڈاکٹر فتح اللہ قادری، خورشید اکبر، ڈاکٹر التفات امجدی، ڈاکٹر فرید پربتی، رفیعہ شبنم عابدی، ناوک حمزہ پوری، علقمہ شبلی، ظہیر غازی پوری، اصغر ویلوری، طہور منصوری نگاہ، ڈاکٹر ظفر کمالی، شاہ حسین نہری، قمر سیوانی، سید وحید اشرف کچھوچھوی، عادل اسیر دہلوی، سوامی شیاما نند روشن دہلوی، شیام سندر شرما ساکچھی، کیسر، عنبر، کرشنا، درپن، ڈاکٹر سلیم ساغر کشمیری، اسلم پرویز بھاگلپوری اور طلحہ رضوی برقؔ کے نام شامل ہیں۔ یہ مضمون تعارفی انداز میں لکھا گیا بطورِ فہرست سامنے آتا ہے۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ اس میں بیس برسوں کے دوران سامنے آنے والے تمام رباعی گو کے نام شامل ہیں۔اس پہلو کا اعتراف کرتے ہوئے مبصر کا ایک

جملہ کہ''اور جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے'' کھٹکتا ہے۔اس کی عمومیت میں ان رباعی گو شاعروں کو بھی سند مل گئی جو حد درجہ غیر معیاری کلام پیش کرتے ہیں مگر پھر بھی وہ جہاں ہیں وہیں آفتاب ہیں!!

دبستانِ عظیم آباد کی تاریخ گوئی پر لکھا گیا مضمون مبصر کی محنت، ژرف بینی اور تاریخی سلسلے پر گہری نظر کا عکاس ہے۔تاریخی قطعات کی تعریف، اس کے لوازمات، اس کا شعری وفنی حسن، اس کے آغاز وارتقا، اس کی اہمیت وافادیت، اس کے اقسام اور اس کی تفہیم جیسے گوشوں کو عرق ریزی سے مضمون کا حصہ بنایا گیا ہے۔ یہ مضمون دبستانِ عظیم آباد کی ان شعری تابناکیوں کو ہمارے سامنے لاتا ہے جن سے تاریخی قطعات کے طویل سلسلے مربوط ہیں۔

مضمون میں پندرہ تاریخ گو شعرا کے نام وتخلص اور نمونوں کے اندراج سے مبصر کی محنت کا اندازہ ہوتا ہے۔انھوں نے صوبہ بہار کی تاریخ گوئی کو امتیاز کا درجہ دیا اور مطبوعہ وغیر مطبوعہ مجموعوں کی نشاندہی کر کے اپنی بات میں وزن پیدا کیا ہے۔اسی لیے وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''غرض یہ کہ فارسی اور اردو تاریخ گوئی کا یہ سلسلہ آج بھی دبستانِ بہار میں توریثی طور پر پایداری کے ساتھ برقرار ہے۔صوبہ بہار غالباً تنہا صوبہ ہے جہاں اردو فارسی میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں قطعاتِ تاریخ کے دسیوں حیرت انگیز مجموعے مطبوعہ وغیر مطبوعہ موجود ومحفوظ ہیں''
>
> (ص:۱۳۶)

اس موضوع پر تحقیق کرنے والوں کے لیے یہ مضمون ایک راہ نما کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ نے ایک سرسری جائزے میں بھی بہت کچھ مواد جمع کر دیا ہے۔

کتاب کا آخری مضمون''غبارِ خاطر کا مقدمہ'' چونکانے والا ہے جو عظیم فیروزآبادی کے ایک مضمون''کیا غبارِ خاطر کا مقدمہ محمد اجمل خاں کا لکھا ہوا ہے؟'' کے جواب میں رقم کیا گیا ہے۔اس مضمون میں مولانا آزاد کی شخصیت کے وہ پہلو اجاگر کیے گئے ہیں جن سے بہت کم لوگ واقف ہوں گے۔سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ مولانا آزاد دوسروں کی تحریروں کو اپنے نام سے چھپتے

دیکھ کر خاموش رہا کرتے تھے۔اسی خاموشی کے پس منظر میں مبصر نے عظیم فیروز آبادی کے اس نظریات کہ:

''انھوں نے مناسب سمجھا کہ مقدمہ نگاری کی خدمت کو وہ خود انجام دیں''

کی تردید کی ہے۔یہ تردید دیگر قیاسی دلیلوں کے ساتھ ایک ایسے خط کے ذریعے بھی کی گئی ہے جس سے مولانا آزاد کی خاموشی والی بات کی تائید ہوتی ہے۔یہ خط ۲۸؍جون ۱۹۵۳ء کی تاریخ میں سید سلیمان ندویؒ کا لکھا ہوا ہے۔جو الہلال میں قلمی معاون کے طور پر اپنی خدمات انجام دے چکے تھے۔اس خط میں اس بات کا اندراج ہے کہ دوسروں کے بہت سے اہم مضامین ناشر نے مولانا آزاد کے نام سے چھاپا مگر مولانا ہر جگہ خاموش رہے۔اس خط سے پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

''مولانا ابوالکلام آزاد اس ظرف کے آدمی نہیں تھے کہ اپنے رشحاتِ قلم
دوسروں کے نام منسوب دیکھتے بلکہ ان کے ساتھ معاملہ برعکس تھا''

(ص:۲۲۱)

اس مضمون میں مبصر نے عظیم فیروز آبادی کے نظریات کی تردید تو اس خط کے ذریعے کر دی ہے مگر وہ خود سوالات کے گھیرے میں ہیں کہ وہ کون سا ایسا راز داں تھا جس کو سید سلیمان ندویؒ نے اس خفیہ خط کے ذریعے حقیقتِ حال سے آگاہ کیا؟ نہ اس کی وضاحت خط سے ہوتی ہے اور نہ ہی مبصر نے اس اہم پہلو پر کوئی روشنی ڈالی ہے۔مکتوب الیہ کا خفا کہیں خط کی چغلی تو نہیں کھا رہا ہے؟ اسی طرح اس جملہ پر ''ایک نہایت اہم خط جس کی فوٹو کاپی میرے پیشِ نظر ہے'' سوال یہ قائم ہوتا ہے کہ مبصر نے ثانوی ماخذ پر بغیر حوالے کے اعتبار کیا ہے۔اصل تحریر ان کے پیشِ نظر نہیں تھی۔پھر اس خط تک مبصر کی رسائی کیسے ممکن ہوئی اور اصل کاپی کس کے پاس تھی۔اس طرح کے کئی سوالات ہیں جو مبصر پر عائد ہوتے ہیں۔

پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ کی تنقید میں اپنے عقیدے کے رنگ کا خاصا اثر ہے۔قرآنی آیات کا استعمال بھی وہ کثرت سے کرتے ہیں،بعض بعض جگہیں حدیثیں بھی درج کی گئی ہیں۔

برمحل اشعار بھی ان کی تنقید میں دمکتے ہیں۔ان کی تنقید نے جہاں بھی عقیدت کا رنگ اختیار کیا ہے وہاں تنقید سے زیادہ تنقیص کے پہلو نمایاں ہو گئے ہیں جن میں سنجیدگی کی جگہ جذباتیت کی لے تیز ہو جاتی ہے۔''مطعون،ملعون،گستاخ اور کافر'' جیسے الفاظ تنقیدی مضامین میں کیا تاثر قائم کریں گے یہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔

کتاب میں کچھ املائی غلطیاں بھی راہ پا گئی ہیں۔خصوصاً قرآنی آیات میں یہ بے توجہی قابلِ افسوس ہے۔صفحہ۳۷؍پر **یزکیھم** '' کو ''**یذکیھم**'' صفحہ۱۹۸؍پر **اسجدوا لآدم** '' کو ''**فاستجدلادم**'' اور صفحہ۲۰۸؍پر ''**یوحیٰ**'' کو ''**یوحیط**'' لکھا گیا ہے۔

پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ کی تنقیدی زبان صاف ستھری ہے مگر کہیں کہیں فارسی آمیز ترکیبیں ثقالت کا باعث بن جاتی ہیں۔فارسی ادب سے گہرے رشتوں کے باوجود انھوں نے اردو کی شایستگی کو بہت حد تک باقی رکھ کر اپنے خیالات قاری تک پہنچائے ہیں۔تنقیدی ادب میں علم و فن کے اساتذہ کی ایسی کتابیں کم سامنے آتی ہیں اس حوالے سے اس کتاب کی اپنی اہمیت اور انفرادیت ہے۔

○○○

’’عشرۂ مبصرہ‘‘ایک مطالعہ

ع رضوی

میرے روبرو’’عشرۂ مبصرہ‘‘ ہے یہ کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے پروفیسر طلحہ رضوی برق کے ان منتخب تبصروں کا مجموعہ ہے جو ملک کے مؤقّر مجلّات ورسائل میں اشاعت پذیر ہوکر قبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی تبصرہ نویسی کا سلسلہ نصف صدی سے بتدریج جاری ہے اس درمیان نہ جانے انھوں نے کتنے کتب ورسائل کو اپنے مقدمات وتقریضات اورتقاریب وتاثرات وغیرہ سے متفخر کیا ہوگا اگران تمام قلمی جواہر پاروں کو جمع کر دیا جائے تو لاریب ایک بڑا علمی ذخیرہ تیار ہوسکتا ہے۔پیش نظر کتاب کا نام بڑا عمدہ ونفیس ہے۔ جو محترم مصنف کے ذوق علمی اور اختصاصی فکر کا پتہ دیتا ہے اس سے ان کی علمی جلالت و وقعت تو جھلک ہی رہی ہے، بصیرت وآگہی اورفکری نفاست و پاکیزگی بھی وجد کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کتاب کو ڈاکٹر سید محمد جنید رضوی نے زیورترتیب سے آراستہ کیا ہے۔ سنہ اشاعت جون ۲۰۰۹ء ہے۔اس کو منظر عام پر لانے کی سعادت’’علامہ قتیل اورینٹل لائبریری ومرکزی تحقیق‘‘ دانا پور پٹنہ کے حصے میں آئی ہے۔ ۹۶صفحات پر مشتمل اس کا انتساب ڈاکٹر شاہ عبداللہ عباس ندوی پھلواری کے نام سے کیا گیا ہے جن کی کتاب’’نگارشات‘‘ پرطویل تبصرہ بھی شامل مجموعہ ہے۔

پروفیسر طلحہ رضوی برق کی شخصیت دنیائے علم وادب میں محتاج تعارف نہیں ہے۔ قدرت نے اس قدر دینی ودنیاوی نعمتوں کی ارزانی فرمائی ہے کہ زمانہ رشک کرتا ہے۔ان کا شمار

عہد حاضر کے ماہرین علم میں ہوتا ہے۔ مؤرخین ونا قدین ان کے رشحات قلم کو بطور حوالہ پیش کرتے اوراپنے فکرونظر کی بنیادوں کو استوار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں، خاص کر علمی ، ادبی، تاریخی اور مذہبی کتب ورسائل پر ان کے تبصرے ہمیشہ بے باک اورمنفرد رہے ہیں۔ کتاب میں شامل تبصرے جن کتابوں پر لکھے گئے ہیں ان میں سے بیشتر کتابیں آج ہمارے لیے اجنبی نہیں ہیں اور نہ ان کے مصنفین غیر معروف ہیں۔ تاریخ علم وادب کا عام قاری بھی ابوالامتیاز ع س، مسلم، علامہ انواراللہ حیدرآبادی ،قمر وارثی کراچی، حضرت امیرابوالعلا اکبر آبادی، سید مصطفیٰ رفاعی، امام احمد رضا خاں فاضل بریلوی، مولانا عبداللہ عباس ندوی، شاہ محمد اکبر دانا پوری، افسر مودودی بڑودوی اورش مظفر پوری کے ناموں سے ضرور واقفیت رکھتا ہے اور بالفرض ان معتبر مصنفین کے کتب ورسائل اجنبی بھی قرار پائیں پھربھی ان کتابوں پر تبصروں کا مطالعہ دلچسپیوں سے قطعاً خالی نہیں۔ یہی علمی فائدہ کیا کم ہے کہ ان کے مطالعہ سے ہمیں ماضی قریب کے علمی احوال وکوائف سے آگاہی حاصل ہوتی ہے اورعلمی سفر کی سمت متعین کرنے میں سہولت میسر آتی ہے۔

اردو میں تبصرے کی روایت بہت زیادہ جاندار نہیں رہی ہے کیونکہ تبصرہ کا مقصد عام طور پر کتاب کا سرسری تعارف ہوتا تھا یا کچھ اشتہاری قسم کی رایوں کا اظہار۔ یا اس کے برعکس کتاب میں اسے کیڑے نکالنے اور مصنف کی شہرت پر خاک ڈالنے کا ہنر سمجھا جاتا تھا۔ مجموعی طور پر اس کا منظر نامہ تعصب وغیر معروضیت کا شکار رہا ہے۔اس کے باوجود ہمارے یہاں اچھے لکھنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ اس حوالے سے تاریخ میں بعض ایسے بھی صاحبان قرطاس وقلم ملتے ہیں جن کا نام بڑے احترام وادب سے لیا جاتا ہے۔عشرۂ مبصرہ میں جن تبصروں کو شمولیت کا اعزاز بخشا گیا ہے ان میں بعض تبصرے حجم کے اعتبار سے مختصر بھی ہیں اور طویل بھی۔ تبصرہ نگاری بھی عجیب فن ہے بسا اوقات مصلحت یا افتادطبع کے باعث پہاڑ کوتل اورتل کو پہاڑ کر دیا جاتا ہے لیکن ایک اچھے مبصر کی پہچان یہ ہے کہ وہ کتاب کے سارے اجزا پر نظر عمیق ڈالتا ہے۔ اس کی صوری ومعنوی خوبیوں اور کمزوریوں کو دیکھتا ہے۔ وہ تقریظ و

دیباچہ سے لے کر متون تک بلکہ متون کے پیچھے سربستہ رازوں کو بھی اپنی فہم و بصیرت اور دیانت داری کے ساتھ ڈھونڈ نکالتا ہے۔ گویا یہ فن آسان نہیں ہے۔ بے شمار نزاکتوں کا مجموعہ ہے۔ جب ہم اس کی روشنی میں عشرہ مبصرہ کا جائزہ لیتے ہیں تو اس بات کا برملا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان تبصروں میں تنقید و تعارف اور تجزیہ و تفہیم کی جو گہرائی ہے وہ تبصرہ نگاری کی عام روایت میں بہت کم ملتی ہے۔

پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ کے تبصروں میں چند اہم باتیں خصوصیت سے عام قارئین کی توجہ کو مرکوز کراتی ہیں۔ اول یہ کہ وہ کسی بھی کتاب کے علمی و ادبی تسامح اور فکری لغزشوں سے صرف نظر نہیں کرتے اور خلوص و دیانتداری کے ساتھ ان کی نشاندہی کرنا اپنا علمی فریضہ سمجھتے ہیں۔ اس ضمن میں انھیں بڑی سی بڑی شخصیت بھی متاثر نہیں کرتی۔ ان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ حق کی وضاحت، باطل کی رد اور مظلوموں کی حمایت میں ان کا قلم مداہنت کا شکار نہیں ہوتا۔ اس موقع پر انھوں نے متون کے پیچھے چھپے ہوئے تعصب و نفاق کو کھینچ کر قارئین کی نگاہوں کے سامنے رکھ دیا ہے۔ وہ ہر قسم کی دینی و اخلاقی قدروں کی پامالی دیکھ نہیں سکتے۔ لہٰذا ان کا قلم جور و بے انصافی کے خلاف صدائے احتجاج ہی بلند نہیں کرتا بلکہ نصرت حق کا پاسدار و امین بن جاتا ہے۔ ''قصیدۂ امام احمد رضا در مدح ام المومنین'' آنجہانی عامر عثمانی کے عریاں تبصرے کی جس بے باکی کے ساتھ خبر لی گئی ہے وہ ہوش و حواس کو ٹھکانے لگانے کے لیے کافی ہے۔ اس ضمن میں مصنف ''بریلوی فتنہ کا نیا روپ'' کے تحت لکھتے ہیں:

> ''میں نے ابھی تک یہی سن رکھا تھا کہ ندوۃ العلما میں زبان و ادب کی تعلیم بہت معیاری ہوتی ہے اور مجھے قدرے حسن ظن بھی تھا لیکن اسی ندوۃ العلما کے استاذ عارف سنبھلی کی مذکورہ کتاب کو پڑھ کر وہاں کا سارا بھرم جاتا رہا۔ عربی تو عربی ہے حیرت ہے کہ عارف سنبھلی اپنی مادری زبان اور اس کے ادب و شعر فہمی سے بھی کورے نکلے''

اسی طرح مصنف ''تذکرہ حضرت رفاعی'' کی بوالعجبی پر اظہار افسوس و حیرت کرتے ہوئے اس کے مقدمہ نگار مولانا ابوالحسن علی ندوی کے تعصب و نفاق اور تضاد عقیدہ و عمل کو کھول کر رکھ دیا ہے جو زندگی بھر محبوبان الٰہی کے خلاف منفی سوچ اور گستاخان نبوی کی حمایت و مداحی میں مبتلا رہے۔ باتیں سب حیرت انگیز ہیں مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ کوئی بات اپنی جانب سے گڑھی گئی ہو بلکہ مبصر نے اپنی ہر بات کو مضبوط دلائل و براہین اور حوالوں سے مزین کیا ہے۔ اس مقام پر اگرچہ مبصر کا لب و لہجہ تلخ نوائی میں بدل گیا ہے اور اسلوب بیان بالکل صاف ستھرا دوٹوک بن گیا ہے مگر ان میں جو حقائق موجود ہیں ان سے انکار ممکن نہیں ہے۔ ان کے آئینہ تمثال تیور کو دیکھ کر ہر قاری کو محسوس ہوتا ہے جیسے ان کے اندر ''حضرت علامہ قتیل داناپوری'' کی روح حلول کر گئی ہو جن کا قلم زندگی بھر خرمن باطل پر صاعقہ بن کر برستا رہا۔ یہی وہ خوبیاں ہیں جو ہمیں بتاتی ہیں کہ اردو تنقید و تبصرہ میں ابھی سچائی اور دیانت داری کی روایت فوت نہیں ہوئی ہے۔

پروفیسر برق کے عالمانہ تبصرے متعلقہ کتابوں کے بنیادی تقاضوں کو محیط ہیں جو ہمیں نیاز فتحپوری، آل احمد سرور، محمد حسن عسکری اور خلیل الرحمٰن اعظمی جیسے مبصرین کی یادیں تازہ کرتے ہیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے تبصروں میں تقدیم و تقریظ اور تاثرات و پیش لفظ کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ وہ کسی بھی شعری یا نثری متن پر اپنی رائے پیش کرنے سے پہلے امعان نظر کے ساتھ ان چیزوں کا تجزیہ کرتے ہیں اگر کوئی دیباچہ، متن کی تشریح و تعبیر میں معاون ہے تو پھر اس کی تعریف و تحسین میں بخالت سے کام نہیں لیتے اور اگر کوئی علمی و ادبی خامی، شکوک کو ہوا دیتی ہے تو بڑی صفائی، بے باکی اور توازن کے ساتھ اس کا پتہ بتانے کی کوشش سے گریز بھی نہیں کرتے۔ مثال میں قمر وارثی کے مجموعہ نعت ''کہف الوریٰ'' کا تبصرہ پیش کیا جاسکتا ہے جس میں سید ابوالخیر کشفی، عاصی کرنالی، صبیح رحمانی، حفیظ تائب، حنیف اسعدی اور اختر لکھنوی کے تاثرات کا جائزہ لینے کے بعد ایک جگہ عاصی کرنالی کی تضاد بیانی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''حضرت عاصی کرنالی ایک معتبر نقاد ہیں انھیں اپنے ان (بظاہر متضاد) دعووں کی دلیل بھی پیش کرنی چاہیے تھی۔ انھیں اس کا احساس تھا شاید اس لیے آخر میں یہ لکھ کر مضمون ختم کرتے ہیں کہ!

''میں چاہتا تھا کہ اشعار کا ایک انتخاب درج کروں لیکن مجموعے میں اچھے اشعار کثرت سے ہیں بلکہ سارے ہی اشعار اچھے ہیں اس لیے اس سعی لاحاصل سے رکا رہا''۔

اس ضمن میں ان کی نوکِ قلم سے بعض ایسے جملے بھی ٹپک پڑتے ہیں جو اپنی بھرپور معنویت کا احساس دلاتے ہیں۔ان جملوں کے پیچھے جو فکر ہے میرا خیال ہے کہ اس کی آب وتاب ہمیشہ قائم رہے گی۔مثال کے طور پر وارثی شعرا کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ:

''حضرت وارث پاک کی ایک زندہ و پایندہ کرامت یہ ہے کہ ان کے سلسلے میں شعری ذوق عام ہے اور شعرا بالخصوص نعت کے میدان میں جذبۂ عشق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل کامیاب اور نمایاں رہتے ہیں۔ خواہ بیدم وارثی ہوں یا بے نظیر شاہ وارثی، عزیز وارثی ہو یا قمر وارثی ایک دوسرا نمایاں وصف وارثی شعرا کی نعتوں اور غزلوں میں ان کی کوثر وتسنیم سے دھلی رواں دواں، پاکیزہ زبان، برجستگی وشگفتگی اور سہل ممتنع ہے۔ یہ ایک ایسی قدر مشترک ہے جس سے کوئی وارثی نعت گو محروم نہیں ہے''۔

حضرتِ برقؔ رضوی نے مختلف اسالیب کے فنکاروں کو اپنے مطالعہ کا حصہ بنایا ہے۔ تاکہ اپنے عہد کے اچھے لکھنے والوں سے شائقین کو خبر وآگہی حاصل ہو سکے۔ان کی یہ کوشش قابلِ تقلید ہے اور لائقِ ستایش بھی، کتاب میں شامل پہلا تبصرہ ابوالامتیاز ع ش مسلم کی کتاب ''حمد باری'' پر ہے جو سنہ ۲۰۰۸ء میں لکھا جب کہ دسواں تبصرہ ش مظفر پوری کے مشہور ناول ''کھوٹا سکہ'' سے تعلق رکھتا ہے جو سنہ ۱۹۶۰ء میں تحریر اور شائع ہوا بُعد زمانی کے باوجود تمام تبصرے بالکل تازہ کار

معلوم ہوتے ہیں۔ اخیر کے دو صفحے میں محترم مصنف کی زندگی جو بحر بیکراں سے کم نہیں اسے مرتب نے کوزے میں سمیٹ دیا ہے امید ہے کہ شائقینِ ادب اس قلمی کاوش کو سراہیں گے اور ادبی حلقوں میں اس گراں قدر مجموعہ کو قدر و تحسین کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ کتاب کی چھپائی، سرورق اور رنگوں کا انتخاب بھی جاذب نظر ہے۔ قیمت ۱۰۰/روپے ہے۔ یہ کتاب خانقاہ چشتیہ نظامیہ داناپور کینٹ پٹنہ یا دیگر اردو بک اسٹالوں سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

○○○

(انٹرویو)

بھارت میں اردو زبان وادب کا مستقبل بہت روشن ہے

اختر سعیدی

ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ کا شمار بھارت کے ان صاحبِ بصیرت، دانش وروں میں ہوتا ہے جو اپنی ادبی اور علمی خدمات کے حوالے سے اپنی نمایاں شناخت رکھتے ہیں۔ وہ نجیب الطرفین سید ہیں۔

شاعری اور تصوف ان کا خاندانی ورثہ ہے انھوں نے داناپور کی ایک خانقاہ میں آنکھ کھولی، جہاں اردو اور فارسی شاعری، مشرقی تہذیب وتمدن اور تصوف اردگرد کی فضا پر چھائے ہوئے تھے۔ ان کے بزرگوں کا شمار دینی اور مشرقی علوم کے ماہرین میں ہوتا تھا لیکن ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ نے انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کیا، اسکول اور کالج کے مراحل طے کرنے کے بعد پٹنہ یونیورسٹی سے اردو اور فارسی زبان و ادب میں ایم اے کی اسناد حاصل کیں۔

ڈاکٹر طلحہ رضوی کے والد علامہ قتیلؔ دانا پوری بھی قادرالکلام شاعر اور صاحبِ سلسلہ بزرگ تھے، انھیں علامہ جمیل مظہری، ڈاکٹر اختر اورینوی اور پروفیسر عطا کاکوی جیسے اساتذہ اور صاحبانِ دانش کی قربت حاصل رہی۔ نبیرۂ شاد عظیم آبادی، سیّد آل احمد انجم فاطمی ایم اے میں ان کے ہم جماعت تھے۔

ڈاکٹر طلحہ رضوی اپنی وضع قطع اور نشست و برخاست کے حوالے سے مشرقی

بلکہ ہنداسلامی تہذیب کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔

انھوں نے ویرکنور سنگھ یونیورسٹی آرہ میں تدریسی خدمات انجام دیں اور صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔ انھیں شاعری کے علاوہ تحقیق وتنقید سے خصوصی شغف ہے 'تحقیق' تنقید اور شاعری پر مشتمل ان کی متعدد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور کئی کتابیں اشاعت کی منتظر ہیں۔ ریسرچ اسکالرز کی رہنمائی بھی ان کے اہم فرائض میں شامل ہے۔

ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ دائرۂ ادب وثقافت (انٹرنیشنل) کے صدر پروفیسر سید ظفر رضوی کے حقیقی چچا ہیں ان کی قیام گاہ پر ہم نے ڈاکٹر صاحب سے ایک تفصیلی ملاقات کی اس دوران ہونے والی گفتگو سوال و جواب کی صورت میں پیش کی جارہی ہے۔

س: وہ کیا محرّکات تھے جنھوں نے آپ کو شعر وادب کی طرف راغب کیا؟

ج: میں نے شعری جرثومہ ورثے میں پایا ہے۔ میرے والد علامہ قتیلؔ دانا پوری بھی شاعر تھے والدہ نے بھی موزوں طبیعت پائی تھی۔ ان کی نعتوں کا مجموعہ ''گلستانِ سخن محمودہ'' شائع ہو چکا ہے۔ میرے خالو علامہ تمنّا عمادی کا شمار اساتذہ میں ہوتا تھا۔ داناپور میں میرے والد کے شاگردوں کی تعداد خاصی تھی جن میں مسلمان ہی نہیں ہندو بھی شامل تھے۔ انھوں نے ''بزم احباب'' کے نام سے ایک ادبی تنظیم قائم کی ہوئی تھی جس کے تحت ہر ماہ طرحی مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ میں بھی اس مشاعرے میں پابندی کے ساتھ شریک ہوتا تھا۔ ابا جان غزل لکھ کر دیتے تھے اور میں پڑھ دیا کرتا تھا۔ نویں کلاس میں جانے کے بعد میں نے مصرعے موزوں کرنے شروع کر دیئے تھے۔ میٹرک میں تھا تو میں نے ایک غزل اصلاح کے لیے ابّا جان کے پاس بھیجی انھوں نے میرے مقطع میں ترمیم کرکے لکھ دیا ؎

یہی ہے وقت پڑھنے کا، پڑھو محنت سے اے طلحہ
نہیں پڑھتا جو لڑکا وہ تو کم بختی کا مارا ہے

مصرعہ طرح تھا

''تمہارے ما سوا کب غیر کو ہم نے پکارا ہے''

ساتھ ہی انھوں نے مجھے تنبیہ کی کہ ابھی شعروشاعری سے رغبت مت پیدا کرو۔ بہرحال کالج میں جانے کے بعد میں نے باقاعدہ شاعری شروع کردی۔ پٹنہ کالج کی ادب کا میں سکریٹری جنرل منتخب ہوا۔ اس دور میں ادب کی طرف میری طبیعت بڑی تیزی سے راغب ہوئی نثر نگاری کی طرف بھی رجحان بڑھا یہ غالباً ۱۹۵۸ء کی بات ہے اس دور میں میرے مضامین اور غزلیں ''نگار'' جیسا مستند ادبی جریدہ چھاپتا تھا۔ ممبئی کے ''شاعر'' میں بھی میری تخلیقات شائع ہونے لگی تھیں۔ گویا وقت سے پہلے میں ادبی طور پر بالغ ہوگیا اور لوگ مجھے جان گئے آنرز میں پوزیشن حاصل کی ایم۔اے میں بھی سرِ فہرست رہا۔ اساتذہ بھی میری استعداد مانتے تھے۔ ایم۔اے کیا میری عمر بائیس سال تھی۔ مجھے فوراً کالج میں بحیثیت لکچرر ملازمت مل گئی۔ دس بارہ سال تک اس حیثیت میں کام کیا پھر ریڈر رہا۔ اس عہدے پر بھی تین سال رہا۔ پھر پروفیسر شپ مل گئی۔ میری ریٹائرمنٹ صدر شعبہ کی حیثیت سے ہوئی۔ اس زمانے میں اردو اور فارسی کا شعبہ ایک ہی تھا۔ میری پرورش جس ماحول میں ہوئی اس میں فارسی زبان حاوی تھی۔ درس و تدریس میں بھی فارسی کا اثر نمایاں تھا۔ اس زمانے میں فارسی پڑھانے والے اساتذہ کم ملتے تھے اس لیے یہ شعبہ میرے حوالے کردیا گیا۔ میں نے اپنے بزرگوں کی دعا سے اردو میں جو کچھ حاصل کیا فارسی میں اس سے بھی آگے نکل گیا یہاں تک کہ ایران کے دورے کے لیے جب ہندوستان سے فارسی اساتذہ کا انتخاب کیا گیا تو ان میں میرا نام بھی شامل تھا۔ اس دوران ایران، تہران یونیورسٹی میں میرے فارسی لیکچر بھی ہوئے۔ وہاں کے اساتذہ سے بھی میں نے بہت کچھ حاصل کیا۔

س: آپ نے جب اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا اس وقت آپ کن لوگوں سے متاثر تھے؟

ج: میرے اساتذہ میں پروفیسر اختر اورینوی کا نام نہایت اہم اور معتبر ہے۔ ان سے مجھے تنقیدی بصیرت و بصارت حاصل ہوئی۔ دوسرے اساتذہ میں علامہ جمیل مظہری کا نام بہت

نمایاں ہے۔ ان کا شمار اس عہد کے قابلِ ذکر شعرا میں ہوتا تھا۔

س: آپ نے غزل سے ادبی سفر کا آغاز کیا پھر نعت کی طرف رجحان کیسے ہوا؟

ج: جو شخص موزوں طبع ہوتا ہے وہ مشاہدات و احساسات کسی نہ کسی صورت میں ضرور نظم کرتا ہے۔ میں نے تمام اصنافِ سخن میں لکھا لیکن آدمی کی زندگی میں ایک موڑ ایسا آتا ہے کہ اس کا رجحان مذہبی ہوجاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ حضور اکرم ﷺ سے عقیدت و محبت کا تقاضا تھا کہ ان کی مدح سرائی کی جائے۔ سو یہ وصف اب میری پہچان بنتا جارہا ہے۔ میں نے بہت نعتیں لکھیں ''اربعین'' کے نام سے نعتوں کا ایک مجموعہ زیرِ طباعت ہے۔ ان شاءاللہ جلد منظر عام پر آجائے گا۔

س: آپ نے تنقید کے حوالے سے بھارت میں جو خدمات انجام دیں اس پر کچھ روشنی ڈالیے؟

ج: جب میں پٹنہ کالج کا طالب علم تھا ان دنوں ہمارے پرنسپل اردو کے ممتاز نقاد کلیم الدین احمد تھے۔ ان کی تنقیدی بصیرت کا ایک زمانہ معترف ہے۔ ان کی ہنگامہ خیز کتابیں ''اردو شاعری پر ایک نظر''، ''اردو تنقید پر ایک نظر'' نہایت وقیع اور قابلِ ذکر ہیں۔ یہ وہی کلیم الدین احمد ہیں جنھوں نے غزل کو ایک وحشی صنفِ سخن قرار دیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ بہار سے باہر کلیم الدین کے لیے لوگوں کے دل میں نرم گوشہ نہیں تھا لیکن انھوں نے انگریزی ادب سے جو حقائق اخذ کرکے اردو ادب کو دیے اس کے لوگ آج بھی معترف ہیں۔ وہ کلاس روم میں آکر نہیں پڑھاتے تھے بلکہ ان کی کلاس کبھی کبھار کسی نشست کی صورت میں ہوتی تھی۔ اس میں وہ اپنے نظریات کی وضاحت فرماتے تھے۔ ان کی کتابیں بھی ہمارے نصاب میں شامل تھیں۔ میں ان کی کتابیں پڑھ کر بہت متاثر ہوا۔ ان کی تنقید نگاری پر میرا ایک مضمون بھی چھپا ہے جس میں میں نے ان کی رائے سے اختلاف کرنے کی جرأت کی۔ میرے اس مضمون کو خود انھوں نے بھی سراہا۔ میں نے اپنے تنقیدی مضامین میں قرآنی تعلیم سے بھی استفادہ کیا ہے۔ میں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ادبِ عالیہ بغیر ام الکتاب سے مستفید ہوئے اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ میں نے اپنے عقائد کی روشنی میں

تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ لوگ میرے افکار و خیالات سے اتفاق کریں یا نہ کریں میں اپنے نظریات کا پرچار کرتا رہوں گا۔

س: موجودہ عہد میں جو تنقید لکھی جا رہی ہے اس حوالے سے مزید کیا کہیں گے؟

ج: جب میں نے لکھنا شروع کیا اس وقت ترقی پسندی کا زوال شروع ہو چکا تھا اور نیا ادب سامنے آ رہا تھا۔ ہر طرف ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ کوئی انسان اپنی ذات، اپنے ماحول اور احساسات سے الگ ہٹ کر نہیں لکھ سکتا، اس صورت میں شاعری ہماری زندگی کا آئینہ بن جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر مجھے کسی کی شاعری کا جائزہ لینا ہے تو اس کی افتادِ طبع، اس کی فطرت، اس کی لفظیات، اس کی شخصیت، اس کے خیالات میں کیسے منعکس ہو رہی ہے اور الفاظ کی سیٹنگ جسے سائیکی کہتے ہیں وہ کیسے ڈیولپ، کن کن عناصر اور کن کن عوامل کا اس میں دخل رہا۔ یہ ایک طرح سے تجزیاتی تنقید ہے اور میں اس کا قائل ہوں۔

س: بھارت میں تنقید کی کیا صورتِ حال رہی ہے؟

ج: بہار اس معاملے میں بڑا خوش نصیب رہا ہے کہ وہاں حسن عسکری، اختر اورینوی اور ممتاز حسین جیسے ناقدین بھی رہے۔ جمیل مظہری جیسا شاعر بھی اس سرزمین کا عطیہ ہے۔ قاضی عبدالودود جیسا بڑا محقق بھی اردو ادب کو اسی خطے نے عطا کیا۔ مجھے ان سے ملاقاتوں کا شرف حاصل رہا ہے۔ میں نے بیش تر ادبی مسائل پر ان سے سوالات بھی کیے اور ان سے استفادہ بھی کیا۔ ان کا معمول تھا کہ وہ خدا بخش خان کی لائبریری میں بیٹھا کرتے تھے۔ انھوں نے تحقیق کو جو صراطِ مستقیم دی ہے محققین کے لیے اس راہ سے ہٹنا بہت دشوار ہے۔

س: بھارت میں اردو کے سلسلے میں حکومت کا کیا کردار ہے، اردو زبان کی مجموعی صورتِ حال کیسی ہے؟

ج: ہندوستان میں دبستانِ لکھنؤ، دبستانِ دہلی اور دبستانِ عظیم آباد کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ جنوبی ہندوستان میں حیدر آباد دکن میں بھی ایک مستقل دبستان رہا ہے اور اس وقت بھی ہے۔ بہار میں اس وقت جس طرح اردو پھول پھل رہی ہے اس کی نظیر آپ کو کسی اور بھارتی

صوبے میں نہیں ملے گی۔ وہاں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ ۱۷۰۰ مدارس میں اردو اور فارسی پڑھائی جا رہی ہے۔ یہ مدارس گورنمنٹ کے ہائی اسکول کے مساوی ہیں۔ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ قائم ہے جس کے تحت یہ مدارس کام کرتے ہیں۔ ان مدارس کے اساتذہ کی تنخواہ سرکاری اسکولوں کے اساتذہ کی تنخواہوں کے برابر ہے۔ دیہی علاقوں میں جو کالجز ہیں ان میں بھی اردو زبان کے شعبے اسی طرح قائم ہیں۔ یونیورسٹیز میں قائم اردو شعبوں میں منظور شدہ سیٹوں سے بھی زیادہ فاصلے ہوتے ہیں۔ اکثر یونیورسٹیوں نے فارسی کے شعبے بند کر دیے ہیں۔ ہائی ایجوکیشن میں ہندی انگریزی، پولیٹیکل سائنس اور نفسیات کے شعبوں میں داخلے کم ہونے شروع ہو گئے ہیں لوگ ان شعبوں کی طرف رجوع کر رہے ہیں جنھیں جدید زبان میں ٹیکنیکل، الکٹریکل، میڈیکل، انجینئرنگ یا بالخصوص کمپیوٹر کہا جاتا ہے۔ یہ ایسے شعبے ہیں جن پر عبور حاصل کرنے سے روزگار آسانی کے ساتھ مل جاتا ہے۔

س: بھارتی حکومت ادب اور ادیبوں کی سرپرستی کس طرح کرتی ہے؟

ج: وہاں ہر دو سال بعد سرکاری محکموں میں اردو پڑھنے لکھنے والے لوگوں کے لیے ٹرانسلیٹر، اسسٹنٹ ٹرانسلیٹر وغیرہ کی اسامیاں نکلتی رہتی ہیں جو اردو بولنے والوں یا مسلم کمیونٹی کے لیے بڑا سہارا ہیں۔ اس کے علاوہ اردو اکیڈمی ہے جس کی سالانہ بڑھا کر ایک کروڑ کر دی گئی ہے۔ اس کے لیے گورنمنٹ نے باقاعدہ ایک سہ منزلہ عمارت بھی دی ہے، اس میں ترقیِ اردو بورڈ کا دفتر بھی ہے اور اردو اکیڈمی بھی ہے۔ اردو اکیڈمی کا اچھا خاصا عملہ ہے جس کی تنخواہوں پر پچاس ساٹھ ہزار روپے اٹھ جاتے ہیں۔ وہاں سے کئی ادبی جرائد نکلتے ہیں جن کی مقبولیت اور مانگ دوسرے ممالک میں بھی ہے۔ سیمینار، ادبی کانفرنسیں اور مشاعروں کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے جن میں باہر سے اہم اور قابل شخصیات کو مدعو کیا جاتا ہے۔ ملک گیر سطح پر اردو میں جو کتابیں چھپتی ہیں ان میں منتخب کتابوں کو انعامات بھی دیے جاتے ہیں۔ ایسے مصنفین یا شاعر جو معاشی تنگ دستی کا شکار ہیں یا ان کے پاس وسائل نہیں ہیں تصدیق کے بعد اردو اکیڈمی ان لوگوں کی مدد کرتی ہے۔ ماہنامہ وظیفہ بھی دیتی ہے۔ ایسے لوگ جن کے پاس شاعری، نثر، تحقیق یا سائنسی موضوعات پر مسودات

ہیں مگر وسائل نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنی کتاب نہیں چھپوا سکتے، اکیڈمی ایسے لوگوں کے مسودے لے کر انھیں دیکھتی ہے، ان کی جانچ پڑتال ہوتی ہے۔ اگر وہ مسودہ معیاری ہو تو اسے شائع کرنے کی منظوری دے دی جاتی ہے۔ کتاب کی اشاعت کے لیے ۷۵؍ فیصد رقم حکومت دیتی ہے۔ پچیس فیصد مصنف کو خود لگانا پڑتا ہے۔ پچھلے دنوں پٹنہ گاندھی میدان میں ''کتاب میلہ'' لگا تھا جو ۱۳؍ دن تک جاری رہا۔ اس میں شرکت کے لیے پاکستان سے بھی پبلشر گئے تھے۔ آپ یقین کریں کہ پاکستان سے جانے والی لاکھوں روپے کی کتابیں وہاں چار پانچ روز کے اندر اندر بک گئیں۔ اس پر وہاں ایک پاکستانی پبلشر کا بیان آیا کہ اردو والوں کی ایسی ریڈرشپ مجھے پورے ہندوستان میں کہیں نہیں ملی بلکہ ان کا کہنا یہ بھی تھا کہ پاکستان کے بڑے شہروں میں بھی اتنی کتابیں نہیں بکتیں جو یہاں چند روز میں بک گئیں۔

س: نئی نسل کی اردو ادب میں دل چسپی یا اس کی کارکردگی کیسی ہے؟

ج: پٹنہ میں نئی نسل کے ایسے کئی شعرا ہیں۔ عصری حیثیت کے حوالے سے جن کا کلام پڑھ کر حیرت ہوتی ہے اور اس بات کی خوشی ہوتی ہے کہ یہ ورثہ نئی نسل میں بھی منتقل ہو رہا ہے۔

س: وہاں انجمن ترقی اردو ہند کی کارکردگی کیسی ہے؟

ج: غلام سرور صاحب انجمن ترقی اردو ہند کے کرتا دھرتا تھے۔ ان کا سیاست سے بھی تعلق تھا، ان سے ڈاکٹر عبدالغنی کے کچھ نظریاتی اختلافات ہو گئے تو انھوں نے انجمن ترقی اردو (بہار) قائم کر لی۔ اب یہ دونوں انجمنیں بغیر کسی اختلاف کے اپنے اپنے طور پر کام کرنے لگیں، دونوں کا دائرۂ عمل الگ الگ تھا جس کی وجہ سے کام کی رفتار بڑھ گئی۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ چند روز کے اندر اندر انجمن ترقی اردو بہار کی تعداد ہزاروں میں پہنچ گئی۔ اس وقت یہی انجمن فعال بھی ہے۔ غلام سرور صاحب کافی عرصہ علیل رہنے کے بعد انتقال کر گئے۔ ان دنوں انجمن ترقی اردو ہند کے سکریٹری، ممتاز ادیب، ڈاکٹر خلیق انجم ہیں۔

س: آپ کا نظریہ ادب کیا ہے؟

ج: ''ادب ایک ایسا لفظ ہے جس کی فارسی میں بھی تشریح کی گئی ہے۔ انسانی زندگی کو

اس انداز سے برتنے کا نام ادب ہے کہ وہ انفرادی حیثیت سے بھی اور اجتماعی حیثیت سے بھی مفید اور سودمند ہو۔ مثلاً بزرگ بچوں سے کہتے ہیں کہ ادب سے بیٹھو۔ یہ ادب سے بیٹھنا بھی ایک ادب ہے۔ جب ہم لغوی اور لسانی طور پر اس طرف رجوع کرتے ہیں۔ انسان جب بولنا شروع کرتا ہے تو وہ اس کی بولی ٹھولی ہوتی ہے، اس بولی ٹھولی میں جب تھوڑا استھراؤ آتا ہے تو پھر وہ ایک زبان کی صورت اختیار کر لیتا ہے، پھر زبان میں جب ارتقائی صورتیں پیدا ہوتی ہیں تو وہ ادب کی منزل پر پہنچتا ہے، اس میں انسان کی تخلیقی چیزیں سامنے آنے لگتی ہیں، اس کے تصورات، اس کے تخیلات جب لفظوں کا پیراہن اختیار کرتے ہیں تو اس میں ایک ایسی چیز سامنے آجاتی ہے جو ترسیل وابلاغ کی اس منزل میں پہنچ جاتی ہے کہ ایک انسان کے ذہن کی باتیں دوسرے انسانی ذہن میں بآسانی منتقل ہو جائیں، اسے ادب کہتے ہیں اور پھر اس ادب میں اس حد تک صفائی اور ستھرائی پیدا ہو جائے کہ اس کو القائی یا الہامی کہا جائے تو وہ ادب عالیہ بن جاتا ہے۔ ادب ادب ہے اور ادب بہر طور انسانی زندگی کو نفع پہنچاتا ہے، خواہ وہ شعری صورت میں ہو یا نثر کی شکل میں۔ ڈراما بھی ادب ہی کی ایک قسم ہے، افسانہ بھی اور شاعری بھی ادب کے اقسام ہیں۔ یہ ساری چیزیں ادب سے تعلق رکھتی ہیں۔ ''میر کوہ سار'' ایک بہت بڑی داستان ہے، اسے پڑھ کر لوگ محظوظ ہوا کرتے تھے، اس میں قدریں تھیں، مسئلہ قدروں کا ہے، ویلوز کا ہے۔ اخلاقی قدروں کی ترجمانی اگر ادب میں ہوتی ہے تو وہ ادب نافع ہے۔ اگر یہی ادب اخلاقیات یا معاشرتی اقدار کے لیے مضر ہے مثلاً فحش ادب۔ شاعری میں بھی فحش لکھنے والے موجود ہیں۔ ایسی چیزوں کو ادب کہہ کر کیا ہم ادب کو رسوا نہیں کرتے۔ ادب کی اس وقت رسوائی ہوتی ہے، جب ادبی قدریں، مذہبی قدریں، تہذیبی قدریں، تصوف کی قدریں، روحانی قدریں، یا انسانی قدریں پائمال کی جاتی ہیں، انسانی اقدار کی پائمالی بہت بڑا جرم ہے۔ مشہور شعر ہے ؎

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

اگر ہم دوسرے کے دل کے درد کو محسوس نہ کریں تو پھر ہماری شاعری کس کام کی۔ بہت

مشہور شعر ہے۔حضرت امیر مینائی کا شعر دیکھیے۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

س: نعت نگاری پر تنقید کے حوالے سے آپ کیا رائے رکھتے ہیں؟

ج: نعت سرکار دوعالم ﷺ کی مدحت بیان کرنے کا نام ہے۔موزوں طور پر نظموں کی شکل میں، غزلوں کی شکل میں، رباعی یا ادب کی مختلف اصناف ہیں، لیکن نعت کی کوئی الگ صنف نہیں ہے۔مثلاً قصیدہ ایک صنف ہے، غزل ایک صنف ہے، دوہا ایک صنف ہے، رباعی ایک صنف ہے، قطعہ ایک صنف ہے۔ ہر صنف میں رسول پاک کی مدحت بیان کر سکتے ہیں۔نعت ایک ایسا موضوع ہے جسے ہم اردو شاعری کی ہر صنف میں بیان کر سکتے ہیں یا ادا کر سکتے ہیں۔اس لیے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کیا ہم نعت کو ادب قرار دے سکتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کیوں نہیں۔ایک سے ایک نعت گو گزرے ہیں اور جتنی محتاط ہو کر انھوں نے نعت لکھی ہے وہ قابلِ قدر ہے۔اور اسے دیکھ کر نقدِ ادب کا ایک اعلا معیار سامنے آتا ہے۔

س: نعت کو کن حدود میں رہنا چاہیے؟

ج: میرا خیال ہے کہ اس میں تجاوز کرنے والے نہیں ہیں۔بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپ نے تو نعت میں نبی کو خدا سے بڑھا دیا۔ میں یہ کہتا ہوں کہ نعوذ باللہ کیا آپ نے اپنے ذہن میں خدا کے متعلق کوئی حد قائم کر رکھی ہے کہ جہاں پر جا کر خدا کی خدائی ختم ہو جاتی ہے، ایسا نہیں ہے۔ہم نے رسولِ خدا کو خدا کا بندہ اور خدا کو معبود قرار دیا ہے ؎

’’بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر‘‘

اس مصرعے کے بعد تو اب کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔بلاشبہ نعت کے لیے بہت محتاط رویہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ایسا شاید ادب کی کسی دوسری صنف میں نہیں ہے۔

س: رسم الخط کی تبدیلی کے سلسلے میں آپ کا کیا موقف ہے؟

ج: عصمت چغتائی اور علی سردار جعفری نے یہ تجویز ڈھکے چھپے انداز میں دی تھی کہ

اردو ہندی رسم الخط میں لکھی جائے لیکن اس تجویز پر بہت زیادہ اختلافات سامنے آئے، ان لوگوں کو علمی طور پر اس پر قائل کیا گیا کہ کسی بھی زبان سے رسم الخط کا رشتہ یا تعلق روح اور جسم کا ہے۔اگر رسم الخط بدل دیں تو زبان ختم ہو جائے گی، مر جائے گی۔پنڈت نہرو نے اپنے ان خطوط میں، جو انھوں نے اندرا گاندھی کو کسی زمانے میں لکھے تھے، ان کا یہ مشہور جملہ لوگ اب بھی کوڈ (نقل) کرتے ہیں کہ ’’کسی زبان کو مارنا ہے تو اس کا رسم الخط چھین لو اور کسی قوم کو مارنا ہے تو اس کی زبان چھین لو‘‘۔

(روزنامہ ’’جنگ‘‘ پاکستان۔۱۱ر مئی ۲۰۰۵ء)

○○○

مختصرات

ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی

''ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ صوبۂ بہار کے ایک معزز اور باوقار صوفی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ بہار اردو اکادمی، پٹنہ کے خسرؔو سے می نار میں مجھے ان کا مقالہ سننے کا موقع ملا۔ میں ان کے دلکش انداز بیان، شگفتہ طرز تحریر اور لب ولہجہ سے بے حد محظوظ ہوا۔ وہ فارسی ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اس زبان سے ان کا تعلق تدریسی ہی نہیں بلکہ خاندانی بھی ہے۔

برقؔ صاحب کی کتاب ''غور وفکر'' کے بعض مضامین بھی میں نے دیکھے جو دل چسپ اور فکر انگیز ہیں۔ ان کا پر زور تنقیدی نقطۂ نظر تجزیاتی، استدلالی اور موثر ہے۔ اس مجموعے کی اشاعت سے اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہوگا''

○○○

ڈاکٹر وزیر آغا

''ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ کے کلام میں روایت کا مخصوص نکھار اور جاذبیت تو موجود ہے لیکن ساتھ ہی ان کے ہاں ماحول کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کا میلان بھی ابھر آیا ہے۔ اسلوب کے سلسلے میں وہ فارسی تراکیب اور بندشوں کے رسیا ہیں لیکن ان کے لہجے پر گذرتے ہوئے زمانے کی کلبلاہٹ اور بے سمتی کا احساس بھی ثبت ہے جو ان کی جدیدیت پسندی کا ایک روشن ثبوت ہے......''

ایضاً

''ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ متعدد بصیرت افروز مقالات لکھ کر نام پیدا کر چکے ہیں۔ آپ نے میری نظم ''یاترا'' پر گہری نظر ڈال کر نتائج کا استخراج کیا ہے اور اس کے بعض مخفی گوشوں کو سطح پر لانے میں کامیابی حاصل کی ہے''

○○○

پروفیسر عبدالمغنی

ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ اردو کے ان معدودے چند ادیبوں اور شاعروں میں ایک ہیں جو فارسی زبان وادب کی بھی اچھی واقفیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اردو نظم ونثر دونوں کے اظہار وبیان پر قدرت رکھتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے معتد بہ تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں اور اشعار بھی۔ ان کے مضامین واشعار قابل ذکر ادبی رسایل میں شایع ہوتے رہے ہیں۔ نثر میں ان کی پانچ کتابیں شایع ہو چکی ہیں اور اب وہ نظم میں اپنا پہلا مجموعۂ کلام دنیاے ادب کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

اس مجموعے میں بیش تر غزلیں ہیں۔ چند پابند نظمیں اور کچھ آزاد نظمیں۔ اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ برقؔ ہر ہیئتِ فن میں دادِ سخن دے سکتے ہیں۔ بہر حال ان کی غزلوں میں اردو شاعری کی بہترین روایات کا عکس ہے اور ان کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ شاعر اپنے ادب کے سرمایے سے نہ صرف بخوبی آگاہ ہے بلکہ اسے پر اثر انداز سے استعمال کرنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔

برقؔ کی انفرادی استعداد اردو شاعری کی روایات کے تناظر میں اپنے تجربات کا اظہار کرنے پر قادر ہے۔ یہ حقیقت ان کے فن سے توقعات پیدا کرتی ہے اور امید کی جاتی ہے کہ با ذوق قارئین ان کے کلام سے لطف اندوز ہوں گے۔

○○○

پروفیسر عنوان چشتی

’’ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ اردو کے ان مخلص اور ممتاز شاعروں میں شامل ہیں جن کی شخصیت ادب، تہذیب اور تصوف کا حسین پیکر ہے۔ ان کی تربیت میں حضرت علاّمہ قتیلؔ دانا پوری کی دعائیں اور نیک تمنائیں بھی شامل ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری میں وہی غنائیت اور رنگِ معرفت ہے جو ان کی شخصیت کا جوہر ہے۔ ’’شایگاں‘‘ موصوف کا شعری مجموعہ ہے جس میں غزلیں، رباعیاں اور نظمیں شامل ہیں۔ ان کی شاعری میں ایک طرف ان کے رنگ افشاں جذبات اور متنوع کیفیات کی جلوہ گری ہے اور دوسری طرف زندگی اور زمانے کے وہ تاثرات بھی ہیں جن سے انسان کے شب و روز عبارت ہیں۔ ان کی شاعری میں ہماری تہذیبی اور اخلاقی قدروں کی چاندنی بھی چھٹکی ہوئی ہے اور ان کی نظموں میں روحانیت کے سایے بھی لرزاں ہیں۔ انھوں نے اردو شاعری کی مہذب شعری زبان میں اپنے افکار و جذبات کو جمالیاتی انداز سے پیش کرنے کی سعیٔ بلیغ کی ہے۔ یقین ہے کہ اللہ کے فضل سے ان کا مجموعۂ کلام ’’شایگاں‘‘ مقبول ہوگا‘‘

OOO

ڈاکٹر اطہر شیر

میں نے آپ کو پٹنہ کے چند سمینار ہی پڑھتے سنا تھا۔ شاید پہلی ہی دفعہ سن کر چونک گیا تھا۔ آپ کا اٹھان مستقبل میں ایک پختہ کار ادیب کی غمازی کر رہا تھا۔ پٹے پٹائے مضمون اور گھسی پٹی باتوں کو سن سن کر طبیعت اکتا چکی تھی۔ آپ کا انداز اور تیور مجھے اوروں سے قدرے مختلف نظر آیا۔ میں نے دوستوں سے پیش گوئی کر دی۔ آپ کا تنقیدی مجموعہ ’’غور و فکر‘‘ نصف پڑھ چکا ہوں۔ اب تو یہ کہنے میں مجھے کوئی تامل نہیں کہ فی الحال بہار کی یونیورسٹیوں کے اردو فارسی اساتذہ میں آپ کی شخصیت بہت جلد قد آور ہو جائے گی۔ میں کبھی کبھی سوچتا تھا کہ ہمارے اساتذہ جو گوشہ نشیں ہو گئے ہیں یا جنھوں نے تخلیقی کام روک دیا ہے ان کی جگہ کیسے پُر ہوگی۔؟ مگر آپ جیسے لوگوں کے میدان میں آ جانے سے مایوسی ختم ہو گئی۔ فارسی ادب سے متعلق آپ کے مضامین بہت وقیع ہیں۔ اس میں آپ کی بصیرت، ژرف بینی، گہرائی، شعرا کا تقابلی مطالعہ، خوبصورت پیرایۂ بیان سبھی کچھ ہے۔

اردو ادب سے متعلق آپ کے جتنے مضامین ہیں ان میں آپ کا تنقیدی شعور بہت رچا ہوا ہے۔ صاف صاف اور بے لاگ باتیں، نقاد کا یہی فرض بھی ہے۔ جملے بڑے دلکش، ترشے ہوئے اور دل میں کھب جانے والے ہیں۔ آپ نے بہت اچھا تجزیہ کیا ہے۔ آپ کے یہاں صلابت رائے ہے۔

OOO

پروفیسر وارث کرمانی

شعر کہنے کے لیے یوں تو کئی صلاحیتیں بہ روے کار آتی ہیں جیسے صنّاعی بیاں، فکر و خیال اور احساسات وغیرہ لیکن ان تمام خوبیوں سے بڑھ کر جو چیز شعر کو واقعی شعر بناتی ہے وہ عشق ہے۔ ساری گرمیِ خیال ساری تاثیر اور تمام تر خیال افروزی درحقیقت جذبۂ عشق ہی کی مرہونِ منت ہے۔ عشق کسی چیز سے بھی ہو، ممنوع یا محمود، پسندیدۂ خلایق یا مردودِ زمانہ اس سے فرق نہیں پڑتا۔ آپ کسی عورت سے عشق کر رہے ہوں یا اپنے پیرو مرشد۔ وطن کی محبت میں مبتلا ہوں یا مناظرِ فطرت کے شیدائی۔ ساقی مغنّی کے دیوانے ہوں یا شمعِ علم کے پروانے۔ کسی قسم کا عشق بہرحال ہونا چاہیئے۔ ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ کے یہاں یہ شرط، عشق دم جبرئیل، اور عشق دل مصطفیٰ، کی صورت میں جلوہ گر ہوئی ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ان کی پوری شخصیت اور ان کی پیشانی سجدہ ریز سے عشق کے آثار ٹپکتے ہیں

برق صاحب کی رباعیات پڑھنے سے اس قول کی صداقت سمجھ میں آتی ہے کہ شاعری شخصیت کا آئینہ ہوتی ہے ان کے اشعار میں عشق کی خلش پوشیدہ ہے (بلکہ ان کی نعتیہ رباعیوں میں آتش عشق تیز ہوگئی ہے کہ اس نے فنی تقاضوں کو کہیں کہیں مجروح کر دیا ہے بقول غالب ؎

در گرم روی سایہ و سرچشمہ بخوئیم
با ما سخن از طوبیٰ و کوثر نتواں گفت

بہرحال انھوں نے اس قیمت پر بھی یہ سودا کر ڈالا۔ آخر برق صاحب بھی تو امیر خسرو کے قبیلے کے آدمی ہے جنھوں نے کہا تھا ؎

ہر دوعالم قیمت خود گفتہ ای
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

اپنی بات کی وضاحت میں طلحہ صاحب کی صرف ایک رباعی لکھ رہا ہوں جس سے ان کے علوم فکر اور سخندانی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے (میں اپنی طرف سے اس کی تفسیر و تعبیر نہ کروں گا) ؎

بجلی سے کہیں سبک گئی تھی گویا
رفعت بھی قدم پہ جھک گئی تھی گویا
بستر تھا گرم ہل رہی تھی زنجیر
کونین کی سانس رک گئی تھی گویا

شعر میں طبیعات کے جدید ترین انکشافات کو ڈھال کے شاعر نے معمولی کارنامہ نہیں انجام دیا ہے۔ جو لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ روشنی کی رفتار اختیار کرنے پر وقت ٹھہر جاتا ہے ان کے لیے معراجِ رسالت مآب پر کہی ہوئی اس رباعی کی بلاغت کا اندازہ لگانا مشکل نہ ہوگا بس اسے پڑھیئے اور لامکاں کی پہنائیوں میں کھو جایئے۔

○○○

پروفیسر حفیظ بنارسی

شاعرِ شایگاں جناب طلحہ رضوی برقؔ شایقینِ شعروادب کے لیے محتاجِ تعارف نہیں۔ مدّتِ مدید سے وہ نگارِ سخن کے گیسو سلجھاتے رہے ہیں۔ وہ استاد الشعراء حضرت علامہ قتیل داناپوریؒ کے خلف الرشید ہیں اور شاعری ان کو ورثے میں ملی ہے۔مگر انھوں نے اس گراں مایہ ورثہ کی نہ صرف حفاظت کی ہے بلکہ اپنے گوناں گوں تجربات ومشاہدات اور علمی توانائی کے سہارے اس میں بیش بہا اضافہ بھی فرمایا ہے۔

''شایگاں'' میں جو کلام شامل ہے اس میں فکر و خیال اور زبان وبیان دونوں کی رعنائیاں جلوہ گر ہیں۔غزلیں ہوں یا نظمیں یا رباعیات، ان کی مشاقی اور قادرالکلامی ہر جگہ نمایاں ہے۔صوفیِ صافی ہونے کے باوجود ان کی رندمشربی اور تہذیب عاشقی کے نقوش بھی ان کے کلام میں جا بجا نظر آجاتے ہیں۔انھوں نے شاعری میں کوئی نیا تجربہ تو نہیں فرمایا ہے مگر روایت کے پورے احترام کے ساتھ ساتھ قدرے جدّت طرازی کی سعیِ بلیغ بھی کی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ فکر وفن کے شیدائی ''شایگاں'' کے مطالعہ سے خوش وقت ہوں گے اور یہ شعری مجموعہ ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

○○○

فرحت قادری

بہت دیر تک تو میں اس کتاب (غوروفکر) کی ظاہری خوبیوں میں کھویا رہا۔ٹائٹل پیج کی سادگی و پرکاری، کتابت وطباعت کی صفائی و پاکیزگی اور پھر ترتیب وتزئین میں خوش سلیقگی دامنِ دل کھینچتی ہے۔مشمولات میں سے ابھی صرف ''تقدیرِ غزل'' کا مطالعہ کرسکا ہوں۔اسی ایک مضمون سے میں آپ کی صلاحیتوں کا قائل ہوگیا۔آپ نے جس انداز سے جدید غزلوں کی بے راہ روی وابتری پر بے باکانہ تبصرہ اور صالح تجزیہ کیا ہے وہ آپ کی جرأت وصلاحیت کا غماز ہے اور منھ سے بے ساختہ کلماتِ تحسین وآفرین نکلتے ہیں۔

دوسرا مقالہ ''خسروؔ کی فارسی غزل گوئی'' تو میں ''بہار اردو اکادمی'' کے خسروؔ سمینار میں آپ کی زبان سے سن چکا ہوں۔اس کی شیرینی وچاشنی ابھی تک ذہن کے گوشوں کو لذت بخش رہی ہے۔

تنقید جیسے خشک فن کو آپ نے دل آویز اندازِ بیان اور سلیس طرزِ تحریر سے اتنا دل کش اور موثر بنادیا ہے کہ مخالف بھی آفریں کہنے پر مجبور ہوجائے۔

○○○

پروفیسر حُسینُ الحق

میں آپ کی شخصیت اور کمالات کا دیرینہ شیدائی اور معترف ہوں اس مجموعے (شایگاں) کے مطالعے کے بعد اس شیفتگی کو مزید پایہ داری حاصل کرنے کے مواقع ملے۔

آپ کی شاعری میں کلاسیک، جِدت اور موضوعاتی طور پر عصری حسّیت کی آمیزش کے جو خوبصورت نمونے ملتے ہیں وہ آپ کی شعری انفرادیت کا آئینہ ہے۔

ایسا کم ہوتا ہے اور بہت کم ہوتا ہے کہ نقد و شعر دونوں کے درمیان توازن برقرار رہے آپ کے یہاں یہ کمیاب شئے پائی جاتی ہے اور یہ دراصل آپ کی شخصیت کی نرمی اور گداختگی کا نمونہ ہے۔

○○○

مولانا سید شاہ ہلال احمد قادری

کل سفر سے واپسی ہوئی تو دو کتابیں نظر نواز ہوئیں ''لمعاتِ سرمدی'' اور ''عنبر سارا'' موخر الذکر کے نام سے سماعت آشنا تھی۔ کتابیں دیکھ کر بصارت بھی روشن ہوئی۔ ''لمعات سرمدی'' کے بعض مضامین پڑھے ہوئے تھے۔

تمام مقالات و مضامین اپنے زبان و بیان میں مقالہ نگار کے علوِ فکر، ندرتِ اسلوب اور تراکیب و استعاراتِ انیقہ کی شہادت دیتے ہیں۔ کلامِ بلاغت نظام، اہلِ ذوق کے لیے کیف آور اور سرور انگیز ہیں۔ نعت و منقبت کے اشعار میں زبان و ادب کا معیار اہل نظر کے لیے جاذبِ توجہ ہے۔ سبحان اللہ بڑی مسرت ہوئی۔ خاکسار بے مایۂ علم و ادب دونوں کتابوں سے استفادہ کرے گا۔

○○○

سید عینین علی حق

’’شائع نظمیں‘‘ میں شامل نظمیں مشہور و معروف بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ کی ہیں جسے التفات امجدی نے مرتب کیا ہے۔طلحہ رضوی برقؔ کا یہ پانچواں مجموعہ ہے جو مختصر نظموں پر مشتمل ہے۔مگر اس مجموعے کا مزاج آپ کے تمام شعری مجموعوں سے تھوڑا مختلف ہے جس میں تہنیتی نظمیں، استقبالیہ اشعار، منظوم تبصرے اور قوم کی اخلاقی پسماندگی جیسے مسائل پر منظر کشی کی گئی ہے۔اس مجموعے کی خصوصیت یہ ہے کہ جن موضوعات پر نظمیں قلم بند کی گئی ہیں ان پر لکھا جانا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔اس مجموعے کی چند نظمیں معاشرے کی اصلاح کی غرض سے قلم بند کی گئی ہیں۔مسجد کی فریاد، شب خونی غزل، نامۂ محبت بہ فاروق ارگلی اور جشن زریں، شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی پر قلم بند کی گئی نظموں کا جواب نہیں ہے جس میں آپ کی بے پناہ صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ ۸۸/صفحات پر مشتمل مجموعے کی قیمت دوسو روپے ہے۔ ناشر دارالاشاعت خانقاہ امجدیہ ہے، جب کہ ایڈوانس پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ، دہلی نے اسے شائع کیا ہے۔

○○○

مولانا ابرار رضا مصباحی

مترجم (پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ) موصوف ملک کی معروف خانقاہ چشتیہ نظامیہ، داناپور کینٹ، پٹنہ کے صاحبِ سجادہ ہیں۔آپ اپنے والد گرامی حضرت سید شاہ قائم چشتی قتیلؔ داناپوری کے مرید و خلیفہ اور جانشیں ہیں۔اپنے خاندانی اسلاف کے علمی و روحانی وارث ہیں۔نہایت خلیق و ملنسار اور صاغر نواز ہیں۔اردو و فارسی دونوں میں کمال رکھتے ہیں۔نظم و نثر پر مبنی کئی علمی و ادبی کتابوں کے مصنف و مولف ہیں۔رشد و ہدایت، علم و تحقیق، شعر و سخن وغیرہ مختلف میدانوں میں آپ کی گراں قدر خدمات ہیں۔

(مکتوباتِ جمالی ص ۳۰)

○○○

منظومات

حضرت سید طلحہ رضوی برقؔ

سید غلام السیدین ناوکؔ حمزہ پوری

اے صل علیٰ طلحۂ رضوی کا مقام
ذی علم و عمل خادمِ دینِ اسلام
تخلیق ہو تنقید ہو یا ہو تحقیق
ہر سمت مثالِ برق روشن ہے یہ نام

اردو فارسی شعبہ کے صدر
آرا کالج کے آسمان کے بدر
اللہ کے فضل سے جنابِ ناوکؔ
ڈی۔لٹ۔ ہوئے برقؔ خسرو جم قدر

۱۹۸۰ء

○○○

پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ

پروفیسر حفیظ بنارسی

جانشینِ قتیلؔ داناپور شاعرِ پاکباز و مردِ غیور
قدردانِ نگارِ علم و فن السلام اے وقارِ شعر و سخن
السلام اے قرارِ قلبِ حفیظؔ مرحبا اے بہارِ قلبِ حفیظ
مل گئی آپ کی حسیں تقریظ روح افزا و دلنشیں تقریظ
شکریہ لطف کا عنایت کا حق ادا کردیا محبت کا
جامع و مختصر ہے یہ تحریر جانِ نقد و نظر ہے یہ تحریر
دعویٰ سب ہے دلیل کے ہمراہ اور حرفِ جمیل کے ہمراہ
دیر آید درست آید کی کس قدر یہ مثال ہے اچھی
ہے یہ تقریظ ارمغانِ سعید برقؔ سے تھی مجھے اسی کی امید
مری خاطر اٹھائی ہے کلفت ہے یہ زحمت بھی باعثِ رحمت
حق کے محبوبؐ کا قصیدہ ہے اس لیے مرا یہ عقیدہ ہے
حق تعالیٰ پھر نوازے گا اپنی رحمت ضرور بھیجے گا
شاہِ خوباں کی ہوگی ہم پہ نظر شامِ غم کی پھر ملے گی سحر
آپ سے ملنے کی تمنا ہے دلِ پرُشوق کا تقاضا ہے
شاہ ٹولی میں آپ کا ڈیرہ اور ہوگا فقیر کا پھیرا
صورتِ عافیت نظر آئے کاش وہ وقت جلد تر آئے

ہے پریشانی کا سبب سردی ڈھارہی ہے بہت غضب سردی
آپ کو مرے حال کی ہے خبر گھر سے نکلوں گا میں ضرور مگر
اذنِ رخصت ملے مجھے فی الحال ہوں بخیر آپ اور اہل و عیال
مرے دل کا پیام کہیے گا سب سے مرا سلام کہیے گا
بھابھیؔ بھی سب کو کہہ رہی ہیں دعا سب کو اللہ کا کرم ہو عطا

خط کو کرتا ہوں میں اسی پہ تمام
لیں حفیظؔ بنارسی کا سلام

○○○

پروفسور طلحہ رضوی برقؔ

ڈاکٹر عبدالمنان طرزیؔ

دودِ چراغِ بزمِ سخنداں طلحہ رضوی برق یکی
عزّ و ناز و زعمِ ادیباں طلحہ رضوی برق یکی

خدمتِ علم وفن چہ کردی درایں دشتے عمر گذشت
حسنِ گلستاں، موجِ بہاراں طلحہ رضوی برق یکی

در تخلیق فارسی ہم چہ نقشِ دلکش او آورد
کیفِ غزل ، اندازِ غزالاں طلحہ رضوی برق یکی

قطعاتِ تاریخ حسیں چہ مثلِ روی ماہ جبیں
نازِ غزل تا طرزِ غزل خواں طلحہ رضوی برق یکی

خرقہ پوشی، دلق بدوشی، ہم اہلِ سجّادہ او
پیرِ طریقت ، صاحبِ ایماں طلحہ رضوی برق یکی

○○○

پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ

ڈاکٹر عبدالمنان طرزیؔ

وہی شیخِ غزل بھی ہیں جو اک شیخِ طریقت ہیں
روا داری کے پیکر ہیں، دوائے دردِ الفت ہیں

تخلص برق ہے تو نام طلحہ اور رضوی ہے
وراثت میں تصوف کی بڑی دولت بھی پائی ہے

زباں پہ دسترس بھی اور ہے اظہار پر قدرت
تخیل میں ترفع ہے تو بندش میں بڑی ندرت

مرصّع ساز ایسے کہ غزل کہنے کا سیکھے کوئی فن ان سے
کھِلے ہیں لالہ و نسریں و نرگس نسترن ان سے

جمالِ فکر و فن پر ہی مدام اپنی نظر رکھتے
تخلص برقؔ ہے تو ساتھ اپنے ہیں شرر رکھتے

زباں آب مطہر سے دُھلی اشعار میں پاتے
غزل میں نام بھی وہ دشمنِ جاں کا نہیں لاتے

سمجھتے ہیں ادب میں محترم صالح روایت کو
بچاتے ہیں شعاعِ گرم سے گل کی نزاکت کو

نئے مضمون ، نئی بندش کا استقبال کرتے ہیں
نشاطِ درد سے غم کو بھی مالامال کرتے ہیں

ہنر آتا ہے رمز و استعارہ کے برتنے کا
تماشہ وہ نہیں کرتے ہیں پیمانہ چھلکنے کا

خدا کی اک عطا بیشک ہے ان کی فارسی دانی
نظر میں جلوۂ ہندی زباں پر نغمۂ تازی

بفیض حافظؔ و جامیؔ بدستش میکدہ دارد
برائے جلوۂ محبوب اوچہ طور می سازد

جو اردو فارسی دونوں میں ہیں فکر سخن کرتے
وہیں ان دو زباں میں قطعۂ تاریخ بھی کہتے

صفت صنف غزل میں پائی جاتی ہے اک ایسی بھی
نہیں اک لفظ کی برداشت کرتی ہے کمی بیشی

بناتی ہے غزل کو گر حسیں ایجاز کی صنعت
وہیں پیدا بھی کرتی شعر میں تاثیر کی شدّت

بیاں اخلاق و حکمت کا بخوبی ہیں وہ کر جاتے — تو صہبائے حیات افزوں سے اپنا جام بھر جاتے
کلام ان پہلوؤں پر آپ کا پورا اترتا ہے — جسے سن سن کے دیوانہ گریباں چاک کرتا ہے
تبسم بر لبِ محبوب جیسی نثر ہیں لکھتے — خریدے کوئی عالی ظرف تو بے دام ہیں بکتے

ہے ان جیسے غزل والوں سے لطفِ انجمن باقی
وگرنہ میرؔ و غالبؔ کی یہ دولت لٹ گئی ہوتی

○○○

حضرت برقؔ داناپوری کی نذر

محمد ارشد رضا کیف الحسن قادری

لے اڑا میرا مقدر مجھ کو دانا پور میں
ہر گلی ڈوبی ہوئی ہے جس کی رنگ و نور میں

اس میں کوئی شک نہیں یہ ہے وہ روحانی مقام
اہلِ دل کرتے ہیں جھک کر جس کی عظمت کو سلام

لوگ ذی قسمت بہ فضلِ رب ہیں دانا پور کے
ذکر کے قابل محلّے سب ہیں داناپور کے

لیکن ان میں شاہ ٹولی کا محلّہ خوب ہے
جس کی اک آفاقی شخصیت بہت محبوب ہے

نام نامی اشہ سید طلحہ رضوی برق ہے
برسوں سے ان کی محبت میں مرا دل غرق ہے

بالیقیں ان کے ہیں علمی کارنامے بے شمار
ہے بجا ان کو کہا جائے جو فخرِ روزگار

مردِ عارف شاہ قائم چشتی کے فرزند ہیں
عصرِ نو کے صاحبِ اسلوب دانشمند ہیں

ان سے قائم آج ہے شعر و ادب کی آبرو
بج رہا ہے ان کی دانائی کا ڈنکا چارسو

ان کا ہر ارشاد ہے درجہ لیے اسناد کا
ان کو ہر فن میں عطا ہے مرتبہ استاد کا

مایۂ ناز ان کی تصنیفات و تالیفات ہیں
مبنی سچّائی پر ان کی جملہ تحقیقات ہیں

دیکھ کر ان کو جلا پاتا ہے ایمان و یقیں
ان کی شانِ فضل کا مجھ سے بیاں ممکن نہیں

ان کے اوصافِ حمیدہ لائقِ تقلید ہیں
وہ بہ ہر رخ فیضیابِ جلوۂ توحید ہیں

ان کی ہے چشم کرم کا ملتجی کیفؔ الحسن
ہو قبولِ بارگاہِ برق یہ میرا سخن

○○○

’’طلحہ رضوی برق‘‘

ڈاکٹر فرحت حسین خوشدلؔ

ط

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع
وجب الشکر علینا ما دعا للہ داع

ل

لاالہ پڑھ کے خوشدل نے اٹھایا ہے قلم
اے خدا تو بندہ عاصی کا رکھ لینا بھرم

ح

حمد اور نعت نبی میں اسم طلحہ بے مثال
کر رہے ہیں آج بھی اصناف تقدیسی رقم

ہ

بے زبان قدسیاں پر حمد رب العالمین
’’عنبر سارا‘‘ کو پڑھیے قارئین محترم

ر

رب سے جو راضی ہوا ’’رضوی‘‘ وہی کہلائے گا
راضی جس سے رب ہوا ، رب کا ہوا اس پہ کرم

ض

ضوفشاں افکارِ شیریں ، ضوفگن اطوار ہیں
ظاہرا'' درویش ہیں لیکن نہیں شاہوں سے کم

و

واصف و وصاف ہیں ، وجدان میں بھی وجد ہے
مشک و عنبر کے قلم سے کرتے ہیں نعتیں رقم

ی

یہ بھی سچ ہے نظم ہو یا نثر ہو تنقید ہو
سارے اصناف سخن میں طاق ہے ان کا قلم

ب

''برق'' پر اللہ کا فضل و کرم برسوں سے ہے
نعت گوئی کے سبب دنیا میں ہیں وہ محترم

ر

رات دن ورد زباں ہے حمد بھی اور نعت بھی
رب کی عظمت کا بیاں کرتے ہیں ''خوشدل'' دم بدم

ق

قاضی و سجادہ و مجذوب ہیں ابن قتیلؔ
سالک راہ طریقت عاشق شاہ امم

○○○

رباعیاں

علاّمہ سیّد شاہ طلحہ رضوی برقؔ کے نام

ڈاکٹر التفات امجدی

توحیدِ الٰہی کے پرستار ہیں برقؔ
الفت میں رسولِ حق کی سرشار ہیں برقؔ
ہیں فضل و کرم کا ایک بہتا دریا
عرفان کا اک طرۂ دستار ہیں برقؔ

شیشے میں ادب کے مئے گلفام ہیں برقؔ
دنیائے علوم میں ''بڑا نام'' ہیں برقؔ
عالم بھی محقق بھی ہیں ناقد بھی ہیں
اس دور میں اللہ کا انعام ہیں برقؔ

عرفان کے خورشید ضیا بار ہیں برقؔ
صہبائے علوم و فن سے سرشار ہیں برقؔ
ہے صوفیۂ عصر کو اس کا اقرار
سب لوگ ہیں قطرہ بحر ذخّار ہیں برقؔ

○○○

Dr.S. M. Talha Rizvi Barque belongs to a very respectable family of the saints and sufis long settled in Danapur. The family has produced a large number of brilliant luminaries in the spheres both educational and religious, litrerature and mystics.

Whenever I came in contact with Dr. Talha Rizvi whose pen name is Barque, his brilliance Flashed before my eyes. He is learned and scholarly with great literary attainments and accomplishment to his credit.

I have had a great admiration for Barque Sahib and have high hopes from him in future. There are very few people who despite their established position in the writing of persian Books and papers, possess also the power of making fluent speaches in the language.

As regards the value of the papers embodied in this particular volume the subjects and the way they have been handled with will speak for themselves.

Syed Hasan Askari
Ex. prof. & Head of the Deptt. of History
patna University,
P A T N A.
1984

Dr. Talha Rizvi Barque is a very renowned scholar of Urdu and Persian . His latest book ''Mysticism in our Poetry'' is an outstanding contribution towards understanding the rich and varied heritage of mystical dimension of our literature . His awareness and tremendous grip on the subject is a source of real inspiration to the readers.

I hope that Dr. Talha Rizvi Barque's endeavor will long last and will always give a direction to his many readers.

Dr.Unwan chishti
prof. and Head of the Deptt. of Urdu
Jamia Millia Islamia
NEW DELHI.
1984

Tasawwuf or Islamic mysticism has so deeply permeated the Islamic Society that no aspect of human efforts remain immune From it. Poets who are gifted with quick perception and tender feelings and sentiments could not remain akin to the sufistic thoughts and ideas which were gradually and steadily taking the society in its sphere of influence. Thus the poets proved to be the best exponents of the mystic thoughts and beliefs. The poetry of some of the poets though not sufis themselves eloquently speak of the great impacts sufism had on their thoughts and expression. Gradually Sufism became a great force which gained such strength and power that it withstood all the challenges of the time.

The Sufis were so liberal in their teachings that their assembly attracted persons belonging to different creeds and beliefs and it is specially this aspect which has great relevance to the modern time, and if the teachings of the great sufis and divines are studied in correct prospective, they may have soothing and healing effect on modern society which is suffering from acute ailments.

The articles which form part of the present treatise, though on different topics, have the same theme common in them. The young and the promising author has succeeded in his exposition regarding the sufistic influence on society specially on Urdu and Persian poetry and it is in this spirit that these essays should be studied.

Dr. Nazeer Ahmad
Ex- University Professor & Hesd
Deptt. of persian, Muslim University, ALIGARH

1974

التفات امجدی کی دیگر کتابیں!

(تخلیق)

(۱)	چٹکنے پات	(رباعیات)	۲۰۰۵ء
(۲)	چارمحراب	(رباعیات)	۲۰۱۰ء
(۲)	ٹافیاں	(رباعیات)	۲۰۱۳ء
(۴)	سروشِ غیب	(تضمینات)	زیرِطبع
(۵)	آلیس کریم	(رباعیات)	زیرِطبع

(ترتیب)

(۱)	شایع نظمیں از پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ	۲۰۱۱ء
(۲)	آئینۂ ظرافت از یوسف سیوانی	۲۰۱۲ء
(۳)	روحِ سماع جلداول (منتخب غزلیات عربی وفارسی)	۲۰۱۸ء
(۴)	برق نامہ (حصہ اول)	۲۰۱۹ء
(۵)	برق نامہ (حصہ دوم)	زیرِترتیب
(۶)	روحِ سماع جلددوم (منتخب غزلیات ہندی واردو)	زیرِترتیب

Dr.S. M. Talha Rizvi Barque belongs to a very respectable family of the saints and sufis long settled in Danapur. The family has produced a large number of brilliant luminaries in the spheres both educational and religious, litrerature and mystics.

Whenever I came in contact with Dr. Talha Rizvi whose pen name is Barque, his brilliance Flashed before my eyes. He is learned and scholarly with great literary attainments and accomplishment to his credit.

I have had a great admiration for Barque Sahib and have high hopes from him in future. There are very few people who despite their established position in the writing of persian Books and papers, possess also the power of making fluent speaches in the language.

Prof. Syed Hasan Askari ...1984
Patna

Barque Nama (Vol-1)
Edited by Iltefat Amjadi

arshia publications

arshiapublicationspvt@gmail.com

ISBN 93-87635-97-X

9 789387 635975

A for Arshia Publications

+91 9971-77-5969

www.arshiapublications.com

arshiapublicationspvt@gmail.com